ہم فکری سے ہم راہی تک

افکار و تحریر: سید جہانزیب عابدی

(جلد اول)

اللّهُمَّ صَلِّ عَلَی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد وعَجِّل فَرَجَهُم

انتساب

اس روشنی کے نام جو ہمارے تاریک ترین اوقات میں رہنمائی کرتی ہے،

امام زمانہ عج کے لیے، انسانوں کے نجات دہندہ، خدا کی نشانی حضرت بقیۃ اللہ،

اور اپنے والدین کے لیے، جو میرے وجود کی بنیاد ہیں، ظاہری اور فکری،

سید سرکار حیدر عابدی (مرحوم) اور سیدہ رفعت عابدی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہا)

آپ کی محبت اور حکمت میرے رہنما ستارے رہے ہیں اور

ان سرپرستوں اور روحانی مربیوں کے نام جنہوں نے میر اراستہ روشن کیا، منزل کو واضح کیا۔۔۔

آیت اللہ سید حسین مرتضیٰ نقوی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے اہل خانہ، اور

حجۃ الاسلام والمسلمین سید غلام عباس رضوی (حسین آغا) حفظ اللہ تعالیٰ عنہ

نیز آیت اللہ شیخ شبیر حسن میثمی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید ظفر مہدی نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی سلمان نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ نور عالم، دامت توفیقاتہم

آپ حضرات کی تعلیمات نے زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھانے کے طریق واضح کیے،

میری پیاری بیوی سیدہ مہوش زہرہ، جن کی زحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کیلئے ایک مقالہ لکھنا پڑے،

اور میرے نوجوان بیٹے،

سید محمد حسین مہدی، مستقبل کی روشن کرنوں میں سے ایک کرن،
آپ سب کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی میرے سفر کو تیز کرتی ہے۔
میرے پورے خاندان کے لیے، لامتناہی طاقت اور محبت کا ذریعہ،
برادران حجۃ الاسلام سید شعیب عابدی، عدیل عابدی، مصطفیٰ عابدی،
بہنیں اسرا اور فرحین، اور میرے پیارے سسرالی، ماں اور باپ اور بہنیں،
اے خدا تو میرے وجود کی جڑ ہے، زندگی کے طوفانوں میں مجھے مضبوطی سے تھامے ہوئے
ہے،
میرے ساتھ چلنے والے دوستوں اور خیر خواہوں کے نام،
آپ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میرے لیے باعث برکت ہے۔
عاجزی کے ساتھ، میں "ہم فکری سے ہم راہی تک" کتاب آپ سب کے نام کرتا ہوں۔
یہ کتاب یہ علمی و فکری لگن آپ میں سے ہر ایک کے لیے میری شکر گزاری اور پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ آپ سب میرے آسمان میں بالائی برج ہیں، زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت، حکمت اور تعاون اس کتاب کے صفحات میں بُنے ہوئے ہیں اور میں اس کام کی تشکیل میں آپ کے کردار کے لیے ہمیشہ مقروض ہوں۔
دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور اٹوٹ محبت کے ساتھ!

سید جہانزیب عابدی

فہرست

انتساب.. 2

کچھ کتاب کے بارے میں 9

تاریخ کاعلم کیوں ضروری ہے ؟ 11

علم واعتدال 15

فلاحی اور رفاہی امور میں اسلامی دستورالعمل 20

اسلام! انسان کی ضرورت 29

مبادیات فکر اسلامی 35

فن وہنر وذرائع ابلاغ 41

مسائل زِندگی اور غصّہ 45

حکمت، اقتصاد اور اخلاق 57

عشق اور عاشق 61

قرآن کے ظاہری تضادات کو کیسے سمجھیں؟.. 74

ولی اللہ.. 79

دُنیا اور امتحانات 83

تقویٰ وپرہیزگاری! حاکم کی بنیادی صفت 92

عزاداری کا مقصد وہدف! 96

روشن خیالی اور قدامت پرستی 100
دینی عقل کی مختصر تاریخ.. 107
مغرب اور تیسری دنیا کا سائنس و ٹیکنالوجی میں بے جوڑ مقابلہ 114
سائنس، کاروبار اور مذہب.. 120
اچھائی، برائی پرکھنے کا اصول 126
قوانینِ اسباب وعلل کے تقاضے 134
روایت یا درایت 142
یہ دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے!! 145
عقل، سائنس و مذہب 149
جبر و آزادی.. 153
ازدواجی زندگی! تفریح یا ذمہ داری 156
ترقی و کامیابی! مگر کیسے ؟!.. 159
تجربے اور نتیجے 166
معیار ہمت و استطاعت 172
قدرتی علوم اور معاشرتی علوم 176
دینی راہنماؤں کی ضرورت کیوں ہے ؟!! 180
مہدویت.. 183
جذباتی نعرے اور سنجیدہ عمل 187

ہجرت یا فرار!! 191

جدید دور میں عالمی مقتدر اسلامی نظام کی ضرورت.. 195

دین ہمارا مددگار یا ہم دین کے مددگار 199

سستی و کاہلی کی وجوہات اور ان کا تدارک 202

اتحاد بین الناس و اتحاد بین المظلومین 206

معرفتِ العجل 210

مسلمان اور سازشی نظریے 217

معاشی مسائل اور مذہبِ اسلام 221

عقل و قلب 236

سیدھا راستہ 239

محنت اور معاش 244

اِخلاق و اسلام! 255

فقیری اور ایمانی صبر 260

ایک سوال: قیمتوں اور اجرتوں کا معیار کیا ہونا چاہیے ؟ 266

متجددیت اور قدامت پسندی 268

اہلبیتؑ کا فکری منہج اور سائنس 285

قرآن کو ترتیبِ نزولی سے پڑھنے کا فائدہ 290

آخرالزمان اور امام زمان (ع) 294

زندان سے رہائی 305
قانون پروری یا اقرباء پروری 307
دینی حکومت یا بے دین حکومت 310
عزاداری کیوں عبادت ہے ؟! 313
مادّی انقلاب کے مضر اثرات 316
مجموعی مثبت کردار اور قلیل منفیات 321
سازشیں! افسانہ یا حقیقت! 328
کونسا معلم اور کون سی تعلیم مقدس اور عبادت ہے ؟ 334
علمی درایت کسے کہتے ہیں ؟! 341
کولہو کا بیل اور جدید دنیا 345
ماڈرن جاہل 350
مادّی اشرافیہ اور دینی اشرافیہ 355
تکشیریت اور شمولیت 358
کیا مغرب بہت دیانت دار ہے ؟!! 361
سرمایہ دار دین و انسانیت کے دشمن 363
عالمی مسائل کی حقیقت 369
دینی حکومت کی ضرورت کیوں ہے ؟ 375
دنیا کے مسائل اور ہمارا کردار 385

اجتماعی جدوجہد: کامیابی کامؤثر وسیلہ 391

دین!ذریعہ نجات و آزادی... 395

اسلام و حق پرستی کو کسی سے خطرہ نہیں 406

عبادات اور بصیرتِ زمان و مکان 408

نیک اعمال اور مومنین کے درجات 414

عرفانِ امامت وولایت.. 421

جدید ٹیکنالوجی جدید سامری کا بچھڑا 424

سعادت حسن منٹو اور روح اللہ خمینی 429

سازشیں ! اندرونی یا بیرونی.. 432

سائنسیت اور وھابیت میں مماثلت.. 438

استعماری طاقتیں اور تیسری دنیا کی ریاستی دھوکہ بازیاں 442

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ، جو ہمیں عقل اور فہم کے اس راستے پر لے کر آیا ہے، جو ہمیں اسلامی اصولوں اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کا مقصد، ہمارے دین کے ثبوتی دلائل کو فراہم کرنا ہے۔

یہ کتاب پندرہ، بیس سال کی فکری محنت اور مشاہدے اور اصلاح کے عمل کا نتیجہ ہے۔یہ مضامین زندگی کے متفرق زندہ موضوعات پر مشتمل ہیں جو اس عرصے میں زیر قلم آئے، یہ ایک خود اونچ پنچ کا سفر ہے، جس میں میری زندگی کے مختلف مراحل کا تجربہ شامل ہے، جس نے میری فہم اور تجدید کو اضافی روشنی دی ہے۔

اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک خالص فکری کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس سے اختلاف کا حق اختلاف کی اہمیت اور احترام کے باعث روا ہے ہر ایک کے پاس خود کے خیالات اور رائے کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن، حدیث، تاریخ، علمیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، ابلاغیات، اور دیگر سماجی علوم کی موٹی موٹی باتوں کو متعدد مواقع پر پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان کو اپنی زندگی میں عمل میں لا سکیں۔

یہ کتاب خصوصی طور پر نوجوانوں کیلیئے ہے، تاکہ وہ اس میں سے کام کی باتیں انتخاب کریں اور اپنے فکری جولان کو بڑھا سکیں۔ اس کتاب کی تیاری کے اسباب نے میری زندگی کو تبدیل کیا ہے، اور میری امید ہے کہ یہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی تبدیل کرے گی۔

کتاب میں جس جگہ مضامین دوسرے لکھاریوں سے لے کر اضافہ جات کیے ہیں یا ترجمہ کیے ہیں وہ مضمون میں عنوان کے ساتھ مشخص کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی امید کے ساتھ، میں آپ کو اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کتاب کو پڑھ کر، آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا راستہ تلاش کر سکیں گے اور اپنے اصولوں کو مضبوط کرنے میں کافی کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ

عابدی

zaib.abidi.pk@gmail.com

تاریخ کا علم کیوں ضروری ہے؟

ہر انسان کو خداوند تعالیٰ نے ذہن دیا ہے، ہر انسان کے اپنے حالات و واقعات مختلف ہوتے ہیں، یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان اپنی جگہ ایک کائنات ہے۔ یہ تو رہی فردی بات۔۔۔ مگر اجتماعی اور معاشرتی اور سماجی طور پر کسی خاص ہدف کے تحت انسانوں کی فکر کے زاویے بطور مجموعی چند یا دس میں سے شمار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً مذہبی اعتبار سے انسان کے سوچنے کے انداز کچھ دسیوں زاویوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں، اسی طرح معاشی بنیادوں پر بطور مجموعی انسانی فکر کی روش بھی چند طرح کے انداز لیے ہوئے ہے۔ یہ فکری زاویے انگریزی میں mind set کہلاتے ہیں، جنہیں فارسی میں منظومہ فکری کہتے یا اردو میں ذہنی ساخت کہتے ہیں۔ اس اصول پر اگر انسان کی سماجی تقسیم کی جائے خواہ سیاسی بنیادوں پر، معاشی بنیادوں پر، جغرافیائی اثرات، تعلیم، تاریخ و ماضی یا پھر اہداف کی بنیادوں پر۔۔۔۔ تو یہ چند یا انگشت شمار پر وجود رکھتی ہیں۔

مثلاً مذہبی طور پر انسان یا تو مومن ہوتا ہے، منافق ہوتا ہے، کافر ہوتا ہے، مشرک ہوتا ہے، غالی ہوتا ہے، انتہا پسند ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ

جب ہم تاریخ کے کسی واقعہ یا شخصیت کو جدید دور پر منطبق کرتے ہیں مثلاً کسی کو وقت کا حُسین (ع)، جدید دور کا علی (ع) کہتے ہیں تو اس سے مراد وہ mindset ہوتا ہے جو موجودہ شخصیت کا ہے جو ماضی میں علی (ع) یا حُسین (ع) جیسا تھا۔ اس سے قطعاً یہ معنیٰ نہیں ہوتا کہ فلاں جدید دور کی شخصیت علی (ع) ہے۔

بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو حالات و واقعات، سیاستوں، معاشی سرگرمیوں، سماجی تعلقات، علمی رجحان وغیرہ کے جو اصول اور روش یا ذہنی اسٹرکچر علی (ع) کا تھا وہی فلاں موجودہ شخصیت کا ہے۔ یا مثلاً کسی کو آج کا نمرود، فرعون، یزید کہنے سے بھی مراد یہی ہے کہ فلاں شخص کا منظومہ فکری یزید سے ملتا جلتا ہے وغیرہ

قرآن کریم میں بھی جن تاریخی واقعات و شخصیات یا حالات کا ذکر ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہ تاریخ پر حاکم وہ قانون الٰہی، قانون فطرت کو واضح کرتی ہے جس کی بنیاد پر مثلاً کوئی شخص اہل جنت بن گیا، مقرب خدا بن گیا اور کوئی راندہ درگارہ الٰہی ہو گیا۔ یہ قانونِ فطرت ہی ہوتا ہے جو تاریخ پر حاکم ہوتا ہے جس کو خداوند کریم نے کائنات کی وسعتوں سے لیکر انسانی نفوس میں متعین فرمایا ہے۔

لہذا ہمیں انسان نامی مخلوق پر بھی اور انسان کے سماجی رویوں کو بھی جانچنے کیلئے تاریخ کے تجربے سے قوانین استخراج کرنے پڑتے ہیں۔ قرآن کریم تا قیامت تک کیلئے زندہ و جاوید آئین ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ قرآن مجید میں قوانین کلّی تاریخ اور مختلف سماجی

اور شخصی واقعات و کرداروں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ ورنہ اگر قرآنی قصوں اور کہانیوں کو بطور کہانی لیا جائے تو وہ صرف تاریخی صفحات پر انجوائے منٹ کیلئے قرار پائیں گے۔

سماجی یا فردی مائنڈ سیٹ، سماجی یا فردی منظومہ فکری، ذہنی ساخت کو سمجھنا اس لئے ضروری ہے کہ یہ ہمارے حال اور مستقبل کا تعین کرتی ہیں۔ تاریخی تجربات ہمیں وہ شواہد مہیا کر دیتے ہیں کہ فلاں موقع پر فلاں حالات میں کسی شخص نے فلاں کردار او انداز پیش کیا تو اس سے فلاں نتیجہ حاصل ہوا۔ لہذا مستقبل کی پیشن گوئیاں کرنے کا واحد حل یہی ہوتا ہے کہ تاریخی واقعات و حالات کا تجزیہ کیا جائے اور مستقبل کی راہیں معین کی جائیں۔ محدود ذہنی منظومہ جات اور فکری اسٹرکچرز کے ساتھ ہم تطبیق دے سکتے ہیں کہ تاریخ کا فلاں واقعہ جس سے فلاں نتیجہ حاصل ہوا تھا آج بھی یہی نتائج دے گا جو ماضی میں مثلاً 4000 سال پیشتر دئے تھے۔ فلاں مائنڈ سیٹ کے شخص نے فلاں مائنڈ سیٹ کے شخص کے ساتھ فلاں معاہدہ کیا تھا یا جنگ کی تھی یا دوستی کی تھی اور پھر فلاں نتائج حاصل کیے تھے تو آج بھی انہی مائنڈ سیٹ کے حامل افراد آپ سے کوئی بھی معاملہ کریں گے جس کی تمام شرائط اور جدید تطبیق بھی وہی ہو جو ماضی میں رہی تھی تو آج بھی وہی نتیجہ حاصل کریں گے جو ماضی میں حاصل کیا تھا۔

لہذا تاریخ کو صرف کہانی اور جذباتی وابستگی کی بنیاد پر تفریح یا کسی اور جذباتی تسکین کی خاطر پڑھنا اور جاننا بے فائدہ ہے۔ بلکہ تاریخ سے سیکھنے کی ضرورت ہے، تاریخ کو جدید دور پر

منطبق کرنے کی ضرورت ہے، تاریخی کرداروں اور واقعات کو جدید دور پر لاگو کرکے ہی ہم ان تاریخی قوانین کی روشنی میں اپنے لئے آئندہ کالائحہ عمل مرتب کرسکتے ہیں اور مستقبل کی تعمیر کرسکتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب انسانوں کو راہ راست کی ہدایت فرمائے، ہمارے لئے ہدایت اور گمراہی کے راستوں میں شناخت کی صلاحیت عطافرمائے اور اس صلاحیت کے بل پر ہمیں عملی میدانوں کا خدائی سپاہی قرار دے، ہمارے مولا(عج) کو ہم سے راضی وخوشنود فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

علم واعتدال

خداوند تعالیٰ نے انسان کو امتحانات و آزمائشوں کے مرحلے یعنی دنیا کا مکین بنایا، ان آزمائشوں سے انسان کی تربیت کرنا مقرر فرمایا، تاکہ انسان اپنے زنگ و کدورتوں کو دور کر کے اکمل بن جائے، کندن بن جائے، کھرا بن جائے۔ خدا کا دست و بازو بننے کیلئے اہل بن جائے۔

کہتے ہیں خدا نے انسان کو نعمتیں عطا کیں اور بے شک عطا کیں مگر نعمت جہاں سکون اطمینان دیتی ہے وہیں اس کے ساتھ صاحبِ نعمت کو ذمہ دار بھی بناتی ہے۔ کہتے ہیں سختیاں، پریشانیاں بہت بری ہوتی ہیں یقینا ہوتی ہیں مگر یہ پریشانیاں بھی نعمت ہیں، جن سے نکلنے کیلئے انسان کوشش، جستجو، محنت، جانفشانی کرتا ہے اور اپنے زنگ آلود وجود کو کھرچ کر چمک دار بنا دیتا ہے۔۔

شیطان بھی خدا نے خلق کیا، اس سے قطع نظر کے شیطان کی آخرت کیا ہو گی، شیطان خود آزمائش کا ایک اہم وسیلہ بن گیا۔ شیطان کے مقابلے پر خدا نے عقل کو قرار دیا۔ عقل کو خدائی نور، خدائی اسلحہ قرار دیا۔

ہر قسم کے فساد، تباہی، بربادی، گراوٹ، ذلالت، کمینگی، جھوٹ، بد دیانتی سے مقابلے کیلئے خدا نے اسی عقل کو طاقت دی۔

خدا نے جو بھی نعمت دی خواہ بظاہر وہ خوش کن ہو یا بظاہر پریشان کن، شیطان نے اُس کی نقل تیار کر دی۔

اس دو نمبری سے نقصان یہ ہوا کہ لاعلم و غیر تجربہ کار انسان ایسی مشکل جو خدا نے انسان کو رگڑ کر کندن ہونے کیلئے پیدا کی تھی اُس کو انسان نے مصیبت سمجھا اور غم و اندوہ، فلاں فلاں کو قصوروار گردانے، غصہ کرنے، فریاد کرنے میں ضائع کر دیا۔

جب کہ تجربہ کار انسان یا تجربہ کاروں سے مشورہ کرکے، تاریخ کے تجربوں سے استفادہ کرکے، ہمت، مردانگی، شجاعت، توکل الیٰ اللہ، صبر، وغیرہ کے ذریعے اگلے مرحلے میں قدم رکھ کر اس امتحان میں سرخرو ہو گیا اور اس مرحلے کا نتیجہ یا آخرت کو خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔

گناہوں، غلطیوں، کوتاہیوں کے نتائج یا آخرت کو خداوند تعالیٰ نے غم و اندوہ، پریشانی، کمزوری، تباہی، ذلت، موت وغیرہ سے مربوط کر دیا۔

جبکہ نیکیوں، خوبیوں اور کمال کی آخرت کو اطمینان قلب، راحت، زندگی، خوشی سے مربوط کر دیا۔

گناہ کا اور نیکی کے پیچھے جذبہ ایک ہی ہے، یعنی سکون کیلئے ایک ہی قلب ہے جو گناہ سے بھی بظاہر وہی تسکین لینے کی کوشش کرتا ہے جو حلال سے ملتی ہے۔ مگر گناہ غلط طریقہ کار کو کہتے ہیں جبکہ نیکی درست طریقہ کار کو کہتے ہیں۔ مثلاً بھوک ختم کرنے کیلئے کھانا خریدنا ہوتا ہے،

اب غلط طریقہ کار یہ ہے کہ چوری کی جائے اور اس پیسے سے کھانا خریدا جائے، درست طریقہ کار یہ ہے کہ محنت کی جائے، محنت کے بدلے پیسہ لیا جائے اور پھر اُس پیسے سے کھانا خرید کر کھایا جائے۔

لہذا کوئی بھی مادّی ضرورت یا روحانی جذبہ جو قلب میں پیدا ہوتا ہے وہ خود برا یا اچھا نہیں ہوتا، بلکہ اُس ضرورت و جذبہ، تڑپ، احساس کو پورا کرنے کا طریقہ کار یا تو غلط ہوتا ہے یا درست۔ غلط ہوتا ہے تو گناہ کہلاتا ہے، درست ہوتا ہے تو نیکی کہلاتا ہے۔

درست اور غلط کا معیار آسان لفظوں میں یہ ہے کہ ہر وہ کام جس کو معاشرے کے عقلاء درست اور غلط تشخیص دیں، دوسرا یہ ہے کہ انسان کا خود کا ضمیر کسی کام کے غلط و درست کا فیصلہ کرے۔ یہ دونوں ذرائع اگر ایک نکتہ پر اتحاد بنالیں تو وہی درست ہوتا ہے۔ غلطیاں جتنی زیادہ ہوتی ہیں ان سے نکلنے میں اتنا ہی وقت بھی لگتا ہے، یہی مرحلہ سختیوں، پریشانیوں اور مشکلات کا کہلاتا ہے۔ جتنا زیادہ انسان ذمہ دار ہوتا ہے اتنا ہی اُس کی غلطیوں کا تناسب کم ہوتا ہے اور اتنا ہی پریشانیاں کم ہوتی ہیں۔

ایک دفعہ پریشانی وقتی مسائل کی وجہ سے ہوتی ہے اور ایک دفعہ پوری زندگی پر محیط ہوتی ہے، یعنی ایسی آزمائش جو زندگی بھر رہنے والی ہے لہذا وقتی پریشانی کو اہم سمجھنے کے بجائے زندگی بھر رہنے والی پریشانی کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جن مسائل کو حل نہیں کرسکتے اُن کو چھوڑیں اور جو کرسکتے ہیں ان پر توجہ رکھیں۔ ہر کام اپنا نتیجہ دینے کیلئے خاص

وقت کا متقاضی ہوتا ہے، خاص وسائل کا طلبگار ہوتا ہے، خاص کام کار کا محتاج ہوتا ہے، خاص جگہ کا طالب ہوتا ہے۔

زندگی کے دائرہ کو وسیع کرتے رہنا چاہیے یعنی ایک بلندی یا ایک مرحلے کے بعد دوسرے مرحلے کیلئے خود کو تیار کرنا چاہیے۔ ہر مرحلے کی ذمہ داری، چیلنجز مختلف ہوتے ہیں لہذا ہر لمحہ کوشش، جدوجہد، ہمت، مردانگی، مضبوط ارادے، مثبت فکر اور تعمیری جذبے کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اعتدال اور راہِ وسط یا درمیانی راستہ بھی اُسی وقت احساس ادراک میں آئے گا جب تک اپنے پورے وجود کے ساتھ بھرپور جدوجہد نہ کرلی جائے۔ لہذا نیم دلی، نیم ارادے کے بجائے جس بھی کام کیلئے حرکت کریں بھرپور انداز میں کریں۔

لہذا اعتدال کا معیار ہدف و مقصد کی عظمت سے وابستہ ہے ہدف و مقصد جتنا عظیم ہوگا اور اس تک پہنچنے کی آرزو جس قدر قوت کی حامل ہوگی وہی چیز اعتدال کہلائے گی، مقصد تک پہنچے میں کوتاہی کرنا جتنی دیر سے سمجھ میں آئے گا اتنی ہی مشقت زیادہ ہوگی، لہذا مشقت اٹھانا دوسرے کوتاہی کرنے والوں کی روش کے تناظر میں اعتدال ہے۔ اعتدال کا معیار خدا کے بنائے ہوئے مقاصد اور اہداف تک پہنچنے میں نپے تلے اقدام ضروری ہے مگر استطاعت کی فراہمی اور وسائل کی جمع آوری تک شدید مشقت اور جدوجہد، رات دن ایک کر دینا، سونے جاگنے کے اوقات قائم کرنا، کھانے پینے میں تکلفات رکھنا اعتدال سے باہر ہیں،

ابتدائی مراحل بظاہر اعتدال سے باہر نظر آتے ہیں مگر کوتاہیوں کے نتیجے میں جب بیداری پیدا ہو رہی ہو تو عروج کے ابتدائی مراحل میں یہ بد اعتدالیاں ہی اعتدال کہلاتی ہیں۔

فلاحی اور رفاہی امور میں اسلامی دستور العمل

ہمارے ملکِ خداداد پاکستان میں تقریباً 70 فیصد آبادی دیہی علاقوں پر مشتمل ہے، جہاں اکثریت کے پاس پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں۔۔۔ اور کرّہ زمین پر بھی وہ آبادی جس کو تیسری دنیا کہا جاتا ہے یعنی جو جدید وسائل زندگی سے محروم ہے دنیا کا تقریباً 80 فیصد ہے۔ اسی تناظر میں لاکھوں فلاحی تنظیمیں رفاہی کاموں کیلئے موجود ہیں اور اسی وجہ سے دنیا کے لوگوں میں عموما کہا جاتا ہے کہ دوسروں کے کام آنا بہت بڑی عبادت ہے، صدقات کی اہمیت دین میں بھی بہت ہے۔ مگر کیا جس خالق نے یہ عبادت قرار دیا وہ خود ایسے افراد کی فلاح و بہبود سے قاصر تھا جو اس نے یہ ذمہ داری ہمیں عطا فرمائی۔۔۔!! نہیں۔۔۔!! ایسا نہیں بلکہ خدا کے سسٹم کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس میں بنیادی قانون آزمائش، امتحان کا ہے اسی کے ذیل میں باقی تمام قوانین ہیں۔ اسی میں ایک قانون تربیت کا ہے۔ محنت بھی ایک قانون ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام نعمتیں فراہم کرنے کے بعد علم و دانش، فکر و تدبر، ہمت و ارادے وغیرہ کے قانون کو انسانی معاشرے میں جاری فرما کر اس بات کو یقینی بنایا کہ جو بھی ان صفات سے متصف ہو گا اس کے پاس نعمتوں کی فراوانی ہو گی۔۔۔ وہ زیادہ مسرت سے آشنا ہو گا نیز اس کی دنیا بھی سعادت مند ہو گی اور یہی دنیا آخرت کی کھیتی

قرار پائے گی۔ اسی لئے علم و دانش، فکر و تدبر، ہمت و ارادے کو خود اللہ تعالیٰ نے انسانی معاشرے میں اپنے منتخب اولوالعزم افراد کے ذریعے تعلیم دلوایا اور تربیت دلوائی۔

دیگر انسانوں پر بھی لازم ہے کہ وہ ان نعمتوں کو دیگر افراد کی دنیوی اور اخروی فلاح کیلئے تقسیم کریں۔

معاشرہء انسانی میں حکومت اور معاشرہ کی نظامت کی ذمہ داری بھی فلاحی اور رفاہی امور میں سے ہے۔ اسی باعث اللہ تعالیٰ نے اپنے پرکھے ہوئے ان اولوالعزم بندوں کو معاشرۂ انسانی کی باگ ڈور سنبھالنے کیلئے منتخب کیا، اور اسی وجہ سے حکومت اگر عادلانہ اور منصفانہ ہو اور خدا تعالیٰ کے حضور خود کو جوابدہ تصور کرتی ہے اور منصب حکومت کو خدا کی طرف سے بندگان خدا کی فلاح و بہبود کی ذمہ داری تصور کرتی ہے تو ایسی حکومت کے قیام کیلئے کی جانی والی کوششیں جیسے روٹی کپڑا مکان وغیرہ کیلئے فلاحی تنظیمیں بنانے سے کروڑوں درجہ افضل ہے۔ مگر دنیاپرست، نفس پرست، فاسد اغنیاء نے اس شعبہ اور ادارے یعنی حکومت کو بھی دولت اور وسائل لوٹنے کیلئے وقف کیا ہوا ہے۔ یہ اغنیاء ہیں جو ظلم و جور کے وسیلے سے مال جمع کرتے ہیں اور انسانوں کو مظلوم بناتے ہیں اور پھر " انسانیت ہمارا مذہب" کا نام لے کر سادہ لوح عوام کو دھوکہ دیتے ہیں، انہی اغنیا کے کنٹرول میں تمام سماجی شعبے ہیں اور یہ فلاحی تنظیموں کے ذریعے صرف اپنے لئے احساس ہمدردی پیدا کرتے ہیں جب کہ مظلوم کو اس کا حق پھر بھی نہیں مل پاتا جتنا کہ وہ حق دار ہے۔ ظلم کا پورا نظام ہے جس کے متبادل نظام آنے سے یہ اغنیا گھبراتے ہیں اور خوفزدہ رہتے ہیں اور ہر متبادل تحریک جس سے اس

موجودہ نظام کو خطرہ ہو روکنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ اس ظلم کے نظام کے لئے یہ فلسفے تراشتے ہیں علمی بنیادیں فراہم کرتے ہیں، میڈیا سے پروپیگنڈا کرتے ہیں، سیاسی راہنماؤں کو زیر کرتے ہیں، ممالک کی افواج، عدلیہ، پولیس، کاروباری طبقے کو رشوتوں سے خریدتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: کوئی شخص فقیر نہیں ہوتا مگر یہ کہ دوسرے اغنیاء اس کے حق سے بہرہ مند ہو رہے ہوں۔

لہذا ان اغنیاء سے جہاد یا ان کے مقابل الہٰی نظام حکومت بنانے کیلئے جو فلاحی و رفاہی تحریک چلنی چاہیے وہ قرآنی دستور العمل کے یعنی سیرت رحمت للعالمین سرکارِ کریم کے مطابق دو حصوں پر مشتمل ہے یعنی مکی مرحلہ اور مدنی مرحلہ۔ ہمارے لئے مکی مرحلہ بہت طویل ہوسکتا ہے اور ممکن ہے کہ داعیانِ تحریک اپنی زندگی میں مدنی مرحلے کو نہ دیکھ سکیں۔۔۔ اس کے باوجود یہ ایک بہت ہی بنیادی مرحلہ ہے یعنی معاشرے کے افراد کے عقیدے، افکار اور ذہن سازی کا، تعلیم و تربیت اور آفاقی و انفسی شعور فراہم کرنے کا، وسائل کی ڈکیتی کرنے والے فاسد اغنیاء سے باگ ڈور چھیننے کی تربیت کا۔۔۔ماضی کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کا۔۔۔۔ حکمرانوں کی جگہ الہی منصوب حکمرانوں کو مسند خلافت الٰہیہ پر بٹھانے کا۔۔۔۔

مولا علی علیہ السلام کی درج بالا حدیث مبارکہ کے تناظر میں فلاحی کاموں میں لوگوں کو کھانا کھلانا، کپڑا دینا، گھر دینا، شادی کروانا، تعلیم دلوانا، علاج معالجہ کروالینا وغیرہ سے زیادہ اس رُخ پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سے اغنیاء ہیں جو ایسے افراد کے حقوق کو غصب

کررہے ہیں۔ لہذا اس حدیث مبارکہ کے تناظر میں اصل اور بنیادی کام جو فلاح و بہبود کے نام پر ہونا چاہیے وہ ایسے افراد کی غصبِ حقوق اور وسائل پر ڈاکہ ڈالنے والے اغنیاء کو روکنا اور ان کے منصوبوں کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرنا ہے۔ اگر یہ مجاہدت کوئی نہیں کررہا ہے اور روٹی، کپڑے وغیرہ محروموں میں تقسیم کررہا ہے تو وہ اس ممکنہ غصے اور جہادی جذبات کو کم کررہا ہے جو ان محروم و ناداروں میں وسائل نہ ملنے پر ڈاکوؤں کے خلاف پیدا ہوتے۔ اگر لوگ اس مجاہدت کو منفیات کی طرف رغبت کہیں تو ان کیلئے دستور عمل یہ ہے کہ وہ خالق کے بتائے ہوئے اصولوں اور قوانین یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کو اس طرح تبلیغ کریں کہ عالمی معاشرہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور مادّی وسائل کے ساتھ ساتھ معنوی اور روحانی، عقلی وسائل سے بھی بھرپور استفادہ کرنے کے قابل ہوجائے۔ اور دنیا کے مادّی وسائل کو آخرت کی تیاری کیلئے استعمال کرے۔ دنیا کو آخرت کی کھیتی بنانے کیلئے حکومتی انتظامیہ میں عادل اور منصف حکمران کو بٹھانے کیلئے جدوجہد کرے۔ انسانی معاشرے میں محروم و مستضعف دین کی چھتری تلے جب جب ایسی فلاحی ورفاہی تحریک کی پشت پناہی کریں گے جو ان کو خالق حقیقی سے توسل کے ساتھ دنیاوی مسرتیں بھی فراہم کرے جو انسانی معاشرے کے عقل و قلب کو روشن کردے اور ایسی حکومت کیلئے جدوجہد کرے تو وہ ایسے کروڑوں انفاق و صدقات وزکواۃ، انسانی حقوق کی تنظیموں، رفاہی اور فلاحی تنظیموں سے کروڑوں درجہ بہتر ہے۔ لہذا روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ کیلئے جدوجہد کرنے کے بجائے ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے نظام کے قیام کی کوشش کریں جس میں خود پورا نظام سیاسی، معاشی،

ثقافتی، تعلیمی، ابلاغی انتظامات کو جامع انداز میں انسانوں کے حقوق کی ادائیگی اور حفاظت کا فریضہ انجام دے اور معاشرے کے تمام انسانی طبقات سے لیکر حیوانات، نباتات اور جمادات سے لیکر خود بنی مخلوقات کو بھی اس دولت کریمہ سے فیضیاب کرے۔ ظالموں اور ستمگروں کے خلاف قیام کرنا مظلوموں اور کمزوروں کے حصولِ حقوق کیلئے حکومت کی خاطر جدوجہد کرنا واجب ہے۔

مظلوموں اور کمزوروں کی مدد کرنے کیلئے ہر حلال وسیلہ استعمال کرنے کا حکم:
آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ تم جنگ نہیں کرتے راہ خدا میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو فریاد کر رہے ہیں۔ پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال دے۔ جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی سرپرست اور حامی و مددگار بنا۔ (سورہ نساء/75)

مظلوموں، کمزوروں کی مدد کرنا الٰہی خدائی حکم ہے:

بے شک فرعون زمین (مصر) میں سرکش ہو گیا تھا اور اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اس نے ان میں سے ایک گروہ کو کمزور بنا رکھا تھا (چنانچہ) ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں (لڑکیوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بے شک وہ (زمین میں) فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا اور انہیں پیشوا بنائیں اور انہیں (زمین کا) وارث قرار

دیں۔ اور انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون، ہامان اور ان کی فوجوں کو ان (کمزوروں) کی جانب سے وہ کچھ دکھلائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔ (سورہ قصص /5،6)

مستضعفوں کی قیادت کرنے پر منکرین کا اعتراض:

اس پر ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ (اے نوح) ہم تو تمہیں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتے کہ تم ہم جیسے ایک انسان ہو۔ اور ہم تو یہی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ہے وہ ہم میں سے بالکل رذیل لوگ ہیں اور انہوں نے بھی بے سوچے سمجھے سرسری رائے سے کی ہے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی برتری نہیں دیکھتے بلکہ تم لوگوں کو جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ (سورہ ھود /27)

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں مظلوموں اور بے کسوں کی مدد کرنے کا پہلا فریضہ خداوند تعالیٰ کا ہے کیوں وہی تمام جہانوں کا پالنہار ہے، سختیاں اور رکاوٹیں اُسی کے دم سے دور ہوتی ہیں اور خداوند تعالیٰ ہی کی مدد اور استعانت کسی مظلوم فرد یا قوم کیلئے کسی مددگار یا رہبر و قائد کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جدید دور کی ظلمتیں اور تاریکیاں بظاہر بہت دلفریب اور پر لطف نظر آتی ہیں مگر اِن امور میں آخرت کی تلخی اور عذاب چھپا ہوتا ہے، سیاست، ثقافت و میڈیا، معاشی معاملات، تعلیمی معاملات وغیرہ

حکومت حقوق کی ادائیگی کے غصب کرنے میں بنیادی وسیلہ ہے لہذا حقوق کے حصول یا ادائیگی کیلئے سب سے موثر ذریعہ حکومت ہے۔ ہر طبعی معاملہ میں جہاں انسانی عقل و ضمیر

فیصلہ کر سکے اُس میں قرآن و حدیث اسے فطرت کے قانون کے تحت حل کرتا ہے ، حدیث رسول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: عقل نبی باطن ہے، نیز خود انسانی تجربات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ ظاہر میں نبی کی پہچان یہی نبی باطن کرتی ہے۔ اسلام طبعی و فطری ضروریات کو پورا کرنے کے سلیقے ، تہذیب و اخلاقی قاعدوں سے آگاہ کرتا ہے جو عقل فطری کے بعد عقل کسبی میں اضافہ کے ساتھ بھی درک کیے جاسکتے ہیں۔ دشمن حملہ آور ہو، مال و اسباب لوٹا جارہا ہو، خاندان اسیر کیا جارہا ہو، انسانوں کے موت گھاٹ اتارا جارہا ہو اور وہ بھی صرف ہوس نفسانی اور پست مقاصد کی تکمیل کی خاطر ، اس موقع پر اپنا یا مظلوموں و بیکسوں کا دفاع عقلی و فطری اور ضمیر کی آواز ہے، اسلامی منابع بھی اسی کی تائید کرتے ہیں ، جیسے کہ اوپر کی چند آیات میں واضح کیا گیا۔ البتہ آج کے جدید استعماری ہتھکنڈوں جن کی ابتدا قرون وسطیٰ میں یورپی انسانوں کے بحری سفروں سے شروع ہوتی ہے اور مابعد جدید دور میں سرمایہ داری، اشتراکیت، اشتمالیت کی ذریعے انسانی حقوق کو غصب کیا جارہا ہے جس کو کوئی بھی پڑھا لکھا شخص دقیق طور پر درک کرسکتا ہے مگر کمزور عوام اس کو زمانے کی ستم ظریفی قرار دے کر سہہ جاتے ہیں اور حقیقی انسان دشمنوں کی معرفت سے دور رہتے ہیں۔ انہی سیاسی ، معاشی، ثقافتی و تہذیبی، تعلیمی دہشت گردی کے آگے بند باندھنا ایسی صورت میں کہ جب حجت خدا، حضرت ولی العصر (عج) غیبت میں ہیں ہر ذمہ دار قرآنی نشانیوں کو اپنا راہنما ماننے والے پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد اور استعانت کیلئے کوشش کرے، یقیناً یہ کام حضرت حجت (عج) کا ہے لیکن وہ صرف تنہا اس

کام کیلئے مقرر نہیں کیے گئے بلکہ مومنین اور مستضعفین پر بھی لازم ہے کہ اُن کی نصرت کیلئے اپنی اور اپنی آئندہ نسلوں کے بہتر مستقبل کیلئے اور دیگر انسانوں کی ظلم و ستم کے شکنجوں سے نجات کیلئے کوشش کریں۔ اس زمانہ غیبت میں سب سے زیادہ ذمہ داری اُس فقیہ کی ہے جو اس بات کی اہلیت بھی اپنے اندر پائے نیز اسقدر حواری دستیاب ہوں جو اس ظلم و ستم کشی میں اُس کی معاونت کر سکیں تو اُس پر واجب ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ البتہ جس فرد یا قوم و گروہ کے پاس ایسا فقیہ یا مومن دستیاب نہ ہو تو اُن کیلئے ہجرت کرنا زیادہ بہتر ہے تا کہ اپنے دین، اپنے دست نگروں، اپنی آئندہ نسلوں کیلئے عقیدہ کو قائم رکھ سکیں اور اس ظلم و ستم کے شکنجوں سے نبرد آئندہ یا کسی ایسے فرد یا قوم کیلئے رکھ چھوڑیں جو قیام کی عقلی و شرعی شرائط پر پورا اتریں گے۔ ظلم و ستم کی بیخ کنی کیلئے طاقت کے مرکز کے عنوان کے تحت اگر حکومت میں شرکت حاصل کرنا، حکومت کا تختہ الٹنا ضروری ہو تو واجب ہے کہ فقیہ یا مومن فرد / افراد گروہ اس امر کیلئے کوشش کرے اور مرحلہ وار کام کرے نیز مخلوقات کی فلاح و بہبود جس میں اولیت انسان کو حاصل ہے کی خاطر ہر نیک نیت کے ساتھ روبہ عمل ہونا واجب ہے۔ خواہ اس عمل کا دائرہ کار حکومت میں شرکت یا حصول، تعلیمی جدتوں کا لانا، معاشی علوم کے ذریعے جدید پالیسیوں کی تیاری، ثقافتی و تہذیبی ارتقاء کیلئے ذرائع ابلاغ میں جدتیں لانا ہو وغیرہ شامل ہو۔

امامت اور رہبری کا مسئلہ دین محمدی صل اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اسی لئے انتہائی حساس، اہم اور بنیادی اور اصولی مسئلہ ہے۔۔۔ یہ مسئلہ تمام نیکیوں میں سب سے اولیٰ نیکی، تمام واجبات

میں سے بڑا واجب، مثبتتات میں سب سے زیادہ مثبت، تخلیقی اور تعمیری امور میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے، اس کا شعور اور اس نظام امامت کے قیام اور نفاذ کیلئے اگر ہمیں سوتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے، تفریح کے اوقات میں بھی سنجیدہ ہونا پڑے تو یہی وہ عبادت ہے جو تمام زکواۃ، خمس، صدقے، حج و نماز سے افضل ترین عبادت ہے۔ یہ وہ ادارہ ہے جس کے نفاذ کے بعد تمام امور منظم ہونا شروع ہوجائیں گے اور عالم انسانیت قرار و اطمینان پائے گا۔

اَللّٰھُمَّ اِنّا نَرْغَبُ اِلَیْكَ فِی دَوْلَۃٍ کَرِیمَۃٍ تُعِزُّبِھَا الإسلام وَاَھْلَہُ، وَتُذِلُّ بِھَا النِّفَاقَ وَاَھْلَہُ،

اے ہمارے رب ہم آپ سے ایک ایسی کریم اور پر برکت حکومت چاہتے ہیں جو اہل حق و یقین منصف مزاجوں کیلئے عزت اور شرف اور جھوٹے ریاکاروں منافقوں کیلئے ذلت کا باعث ہو۔ (دعائے افتتاح سے ماخوذ)

اسلام! انسان کی ضرورت

دین مبین اسلام نے جہاں یہ کہا کہ خدا نے انسان کو اس لئے خلق فرمایا کہ وہ اس کی عبادت کرے تو مومنین نے خوشنودی خدا کی خاطر عبادتوں کو اپنا روزآنہ کا معمول بنالیا کسی نے اس عبادت کو نماز، روزہ، حج وغیرہ میں تلاش کیا تو کسی نے اس کو انسانیت کی خدمت میں۔۔۔ مگر اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکواۃ، خمس یا دیگر فروع دین کو جو خدا کیلئے انجام دیتا ہے اور ان عبادات سے خدا کو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی بھول ہے کہ خدا کی خدائی میں اس کے نماز و روزہ سے کسی قسم کا اضافہ ہو گا۔ خداوند قدوس کی صمدیت اس بات سے ماوراء ہے۔ نہ تو صرف نماز، روزہ، حج وغیرہ کی ظاہری شکل خدا کی بارگاہ میں قابل قبول ہے نہ ہی صرف انسانیت و بظاہر سماج کی خدمت کا نعرہ لگا کر نماز، روزہ وغیرہ کی ظاہری شکل سے دوری اختیار کر کے بندگان خدا کی ضروریات پوری کر کے فرض تکمیل پاتا ہے۔ بلکہ اسلام وہ دین فطرت ہے جو نہ صرف انسان کی فطرت بلکہ اس کائنات کے ارتقاء کا سسٹم و نظام جن رموز پر قائم ہے اس کا کمال صرف دین مبین اسلام پر عمل کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ چاہے ابتدائے عمر میں وہ ظاہری اعمال پر ہی منحصر ہو اور بعد میں ان اعمال کی تفسیر و توجیہ یا ان اعمال کا کنایہ سمجھ میں آنے پر اعمال گہرائی اور معرفت کے ساتھ انجام پائے جانے لگیں۔

عمر کے ہر دور میں ظاہری اور باطنی امور میں دلچسپی اور اس پر عمل اس ارتقائی سفر کیلئے ضروری ہے۔ خداوند نے عقائد سے لے کر یعنی اصول دین سے فروع دین تک جتنے بھی اعمال و نظریات اپنانے پر زور دیا ہے وہ انسان کی اپنی بقاء و ارتقاء کیلئے منظم و باترتیب زندگی گذارنے کے آلے ہیں۔ جس میں انفرادی یا اندرونی یعنی نفسیاتی نظم و ضبط سے لیکر بیرونی یعنی جسمانی، علمی، معاشی، ثقافتی، معاشرتی وسیاسی نظم وضبط کو برقرار رکھنے کی خو دلائی گئ ہے اور انسان سے چاہا گیا ہے کہ اس دنیا کو جنت کے نمونے یا ماڈل کے طور پر پیش کرے۔

خداوند کو نہ ہمارے علم حاصل کرنے سے سروکار ہے نہ اس کو ہمارے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے یا صلۂ رحمی سے کوئی فائدہ ہے نہ اس کو ہمارے حلال رزق کمانے اور مصرف سے کوئی غرض ہے نہ ہمارے انفاق و فطرہ وزکواۃ کی ادائیگی سے سروکار ہے نہ ہی اس کو ہمارے عادل و منصوص من اللہ رہبر، امام و قائد کے اطاعت سے کوئی فرق پڑتا ہے۔ فرق پڑتا ہے تو ہمیں! فائدہ ہے تو ہمارا! صرف ہمارا یعنی حضرت انسان اور اُس کے سماج کا!

ان احکامات دین کے ذریعے خدا معاشرۂ انسانی کو، زندگیٔ انسانی کو ایک ھمہ گیر آئینِ زندگی و اصولِ منطقی کے تحت منظم کرنا چاہتا ہے تا کہ اس نظام کی بدولت تمام شعبۂ حیات فطرت کے قوانین کے تحت منظم ہو جائیں جس سے عقل انسانی بھی مطمئن ہو، ضمیر انسانی بھی مطمئن ہو اور جذباتی رجحانات کو مثبت راہیں میسر ہوں۔ اس سسٹم اور نظم و ترتیب کی نظریاتی شکل اسلامی تعلیمات ہی ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونا ہی انسان کو سعادت مند بناتا ہے اور ہر شعبہ حیات میں یہ نظریات و احکاماتِ فطرت، ضمیر انسانی سے پھوٹتے ہیں اور

ضمیر انسانی کو مطمئن کرتے ہیں، ان کتابی و نظریاتی باتوں کے ذریعے اسلام کا نظام انسان کو ایک بڑے نیٹورک سے منسلک کرتا ہے اور ایک بین الاقوامی و بین العوالم تربیتی نظام سے منسلک کرتا ہے اور قدم بقدم انسانی زندگی کو آہستہ آہستہ علوم اور پھر عملی شکل میں مختلف نظاموں میں حصہ لینے والا ایک بامعرفت اور متحرک انسان تشکیل دیتا ہے۔ یہ وہ دینی نظریات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انسان نفس مطمئنہ یعنی تقرب الی اللہ کی منزل پر فائز ہوتا ہے اور یہ وہ مدارجِ علم و آگاہی و معرفت ہیں جن کے ساتھ مومنین اجتماعی ریاضتوں کے ساتھ قرب الٰہی میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ پست، رکیک و گناہ آلود خیالات نہ صرف انسان کے ذہن کو فشار و نفسیاتی تناؤ میں مبتلا کرتے ہیں بلکہ ان خیالات پر عمل کرنا معاشرہ ہائے انسانی کے مختلف شعبہ جات میں انتشار و ناہم آہنگی، بے نظمی و بے ترتیبی کے اثرات کو فروغ دیتا ہیں۔ انسانیت کا شرف اعلیٰ اخلاق کی بلند منزلیں ہیں جو اس کو نفس مطمئن عطا کرتی ہیں اور دنیا کے ظاہری نظاموں یعنی معیشت، سیاست، علوم و ثقافتی فنون، معاشرت وغیرہ میں ایک سسٹم کا نمونہ پیش کرتی ہیں! ایسا سسٹم جو منطقی نظریات و عاقلانہ روش پر مبنی باترتیب اور منظم کارخانہ حیات کے کل پرزے ہیں۔

اسلامی تعلیمات اس کارخانے کے کل پرزے کی طرح ہیں جو خام مال کو کمال عطا کرتے ہیں اور استعمال کے قابل بناتے ہیں جو اشیاء (انسانوں) سے فائدہ اٹھانے کیلئے اس کو تیار کرتے ہیں اور فلاحِ انسانی کی مادی و روحانی بقا کا سامان کرتے ہیں۔ انسان پیدائش کے بعد اگر سسٹمِ معاشرتی میں منطقی نظم و ضبط نہیں دیکھتا یعنی کفر الحاد و منافقت پر مبنی معاشرہ دیکھتا ہے تو

اسلامی تعلیمات پر عمل اس انسان کو اُس منطقی سسٹم سے مربوط کر دیتی ہیں جو باقی رہنے ولا ہے جس میں خالص شعور و مثبت جذبات کی کار فرمائی ہے۔ اسلامی تعلیمات پر عمل انسان کو بقا کی طرف لیجاتا ہے اس کے معاشرتی نظاموں کو بقاء و ابدی زندگی عطا کرتا ہے اس کے انفرادی اعمال کو منطق، ترتیب، نظم و انضباط اور نفس کو اطمینان عطا کرتا ہے۔ خواہ بیت الخلاء کے آداب و تہذیب کی بات ہو یا کسبِ روزگار و مصارف معاشی کی بات ہو چاہے مرد و عورت کے روابط یا نونہالان کی تربیت و معاشرے میں روا رکھے جانے والے رویوں کا طریق ہو، خواہ دشمنِ فطرت و منطق سے صلح و صفائی یا جنگ کی بات ہو، چاہے حکومت بنانے اور خلقِ خدا کی خدمت کی روش ہو۔ اسلام ہر شعبہ میں تہذیب زندگی و روش اخلاق یعنی سرخرو و سربلند ہونے کے طریقہ کار بتاتا ہے۔ خدا کمال ہے اور باکمال ہونے کو پسند کرتا ہے۔ پستی و رکیکیت سے نفرت کرتا ہے۔ اسلام نے علم و حکمت کے حصول کو انسان پر فرض کر کے اُسکی فردی اور معاشرتی اٹھان و سربلندی چاہی ہے، اخلاق کے رموز سے معاشرتی روابط کو استحکام عطا کیا ہے اور محبت و امن کی خو دلائی ہے۔ ولایت سے منسلک کر کے باشعور افراد کو حکومت بنانے کا اختیار دے کر نظام ہائے معاشرتی، ثقافتی، معاشی وغیرہ کو درست راہ پر گامزن کیا ہے۔ معیشت میں حلال کے حصول و مصرف سے معاشرے میں مادی ضروریات کی تکمیل اور کمزوروں اور بے سہارا افراد کے سہارے کا سامان کیا ہے۔ نماز کی کنائی شکل سے برائی کے خلاف عملی میدان میں عادل امام کے پیچھے متحد جماعت کو برسرپیکار ہونے کی طرف راغب کیا ہے، روزے سے کمتر معاشی طبقات کا

احساس دلا کر ان کی ضرورتوں کو زکواۃ و فطرہ سے پورا کرنے کیلئے زمینہ فراہم کیا ہے۔ حج سے بین الاقوامی معاشروں کی خوبیوں کو اپنانے اور صلۂ رحمی اور تعلقات کے فروغ اور ذہن کو بین الاقوامی بنانے کا راستہ دکھایا ہے اور ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھنے اور انکے حل کی راہ دکھائی ہے، جہاد سے مندرجہ بالا نظام و نظم و انضباط میں خلل و فساد پیدا کرنے والے عوامل کی روک تھام و اصلاح نظام کی طرف متوجہ کیا ہے خواہ تعلیمی نظام ہو، رسومات وثقافت کے میدان ہوں وغیرہ

غرض دینِ فطرت یعنی جو نظام و سسٹم خدا نے بنایا ہے اس کو اپنا کر انسانی معاشرے کو ارتقاء و کمال پر انسان کو ہی پہنچانا ہے، انسان اگر سسٹم کے خلاف چل کر کامیابی کی تمنا کرے گا تو فطرت اُسے قریب یا بعید ناکامی کا تمغہ دے گی۔ خدا و اولیاء اللہ سے ان ارتقائی منزلوں میں آنے والی مشکلات و آزمائشات میں توسل سے ہمت و حوصلہ لینا تو حتمی ہے اور پس پردہ طاقت جو ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتی مگر باطنی و عرفانی بصیرت سے مشاہدہ کی جاسکتی ہے، خداوند متعال ہی کی ہے مگر اس ارتقائی سفر کو کمال پر پہنچانے کا ذمہ حضرتِ انسان کا ہی ہے۔ وہ انسان جو اسلام کے فطری قوانین پر عمل پیرا ہو کر معاشرہ انسانی کی معاشی، علمی، ثقافتی، معاشرتی یا سیاسی ارتقاء کو کمال پر پہنچائے بالفاظ دیگر معاشرہ انسانی کو جنت کے نمونے پر پیش کریں وہی اس جنت میں بھی جانے کے حقدار ہوں گے جو خداوند کریم نے ایسے مومنین کیلئے روز حشر کے بعد تیار کر رکھی ہے۔ انشاء اللہ

" اور جس نے بھی کوشش کی اس نے اپنے لئے کوشش کی اور اللہ تو سارے عالمین سے بے نیاز ہے۔" سورۂ عنکبوت، آیت نمبر ٦

پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ہمیں اپنا عبد خالص بنا کر اپنے بندوں کی خدمت کی ایسی توفیق مرحمت فرمائے جس میں ہمارے دونوں جہانوں کی سعادتوں کی تکمیل ہو سکے۔

مبادیات فکر اسلامی

فکر کیا نہیں؟

انسان وہ نہیں جو خدا کے عطا کردہ وسائل کے ذریعے حاصل کی گئی نعمتوں پر اترائے۔ ہر تخلیقی و تعمیری فکر و سوچ خدا کی نعمت ہے اب اس سے انسان کوئی بھی عمل کرے کچھ بھی تخلیق کرے کچھ بھی تعمیر کرے اگر وہ مخلوق خدا کی مادی و روحانی بقا اور رفعت شعور کیلئے ہے، ان کی زندگی کو سکون دینے کیلئے ہے تو وہ کبھی ان ایجادات پر گھمنڈ نہیں کرتا فرعون یا قارون نہیں بن جاتا کہ تمام نعمات خود اپنے لئے وقف کرلے۔ انسان صرف خدا کی نعمتوں یا وسائل کو جوڑ کر خدا کی دی ہوئی فکر سے جدت پیدا کرتا ہے، ان تخلیقات پر کسی بھی طرح اترانا تکبر و خود نمائی کی علامت ہے۔ معاشرہ کا کوئی بھی شعبہ ہو مومن انسان کبھی بھی انسان کے لئے بقا کا ضامن بن بقا" چھین "نہیں لیتا بلکہ انسان کی فکر و شعوری ارتقاء و بقا اور روحانی و مادی بقا کی خاطر مخلوق خدا کی خاطر خود کو فنا کر دیتا ہے۔ یہ فنا فی اللہ کا مطلب ہے۔

نہ ہی وہ معاشرہ سے کٹ کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے یا پھر خود کو نعمتوں کے پہچانوانے کا وسیلہ جان کر متکبر ہو جائے اور نہ ہی معاشرے کے سطحی فکر و شعور رکھنے والے افراد پر قہر بن کر

ٹوٹ پڑتا ہے بلکہ ارتقاء کی کوششوں میں تخلیقی و تعمیری سوچ و فکر و عمل کے ذریعے بیداری پیدا کرتا ہے اور ان کوششوں میں جب وہ خود کو معاشرے میں گم کردیتا ہے یعنی اس ارتقائی سفر کا راہنما بن کر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کردیتا ہے تو یہ محبوب الہی، مومن اور خلیفتہ اللہ کہلاتا ہے۔ نہ تو وہ خدائی نعمتوں پر قابض ہو کر کہ کسی کو کچھ نہ دے اور خدا سے تعلق صرف اسلئے قائم کرتا ہے کہ اس کی ترقی ہوتی رہے اور نہ ہی ارتقاء کے سفر کا خود کو ٹھیکیدار سمجھ کر ظلم و جبر و اکراہ کا راستہ اپناتا ہے اور نہ ہی جھوٹی خداخواہی اختیار کرکے گوشہ نشین ہوجاتا ہے۔ بلکہ افراد معاشرہ کے درمیان رہتے ہوئے خدا سے تعلق قائم کرکے خود اپنی فکر و شعور اور مادی وروحانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ معاشرہ جہان کیلئے بھی ایسی ہی کوششیں سرانجام دیتا ہے کہ انسانیت کو قرار آجائے۔

خدا فرماتا ہے:

"وہ لوگ ایسے ہیں کہ اپنی انتہائی ضرورتوں اور احتیاجات کے موقع پر وہ دوسروں کی کمتر ضرورتوں کی خاطر اپنی انتہائی ضرورتوں کو قربان کرکے دوسروں کا سہارا بنتے ہیں۔" [سورہ حشر / آیت نمبر۹]

ایسی کوششیں جس میں معاشرے کی روحانی و مادی فلاح ہو ایسے مومن یا عالم باالعمل باصلاحیت اور مقرب خدا اعاقل انسان کیلئے خدا فرماتا ہے:

"شاباش اب تو ایسی منزل پر ہے کہ میں تجھ سے کہوں اس لئے تجھے دعوت دیتا ہوں کہ آ خوشی خوشی اپنے رب کی جانب لپک، اب تو میرے خالص بندوں کی صف میں داخل ہو کر میری جنت میں آجا۔"[سورہ فجر / آیت نمبر ۲۷،۲۸،۲۹،۳۰]

فکر کیا ہے؟؟

اسلام ایک زندہ دین و مذہب ہے جو فرد کو کائناتی شعور کیساتھ ساتھ انفرادی شعور بھی عطا کرتا ہے اس پر سے غفلت اور زنگ کی چادریں اتارتا ہے اور اس کو خود اسکی شناخت کراتا ہے اس کے اندر جو قوتیں اور استعدادیں اور قابلیتیں ماحول کی وجہ سے سو جاتی ہے اس کو جگاتا ہے اسلام ایک فکری علمی مکتب ہے جو انسان کو اپنے ہم جنسوں کیلئے جینا سکھاتا ہے مخلوق خدا کی خدمت خود خدا کی خدمت ہے اسلام کی خدمت ہے خدا کے نعوذباللہ کوئی ہاتھ پیر تو ہیں نہیں جس کو دابا جائے اور خدمت کی جائے خدا کے ہاتھ پیر یہی عام سے بندے ہیں جن کے روحانی اور مادی بقا کا سامان فراہم کرنا خدا کی خدمت ہے۔ اس کائنات میں ایسے بندے ہیں اور خدا پیدا کرتا رہتا ہے جو نیک سیرت، خدا ترس، انسان دوست ہیں جس کے باعث خدا اور اسلام کا نام زندہ ہے جن کے دم سے جہان میں سلامتی ہی سلامتی ہے۔ یہ افراد ایک ایسے فطری مکتب فکر سے وابستہ ہیں جو انسان کی مادی و روحانی بقا چاہتا ہے رفعت شعور چاہتا ہے جو ایک عام انسان کو انسانیت کا درس پڑھا کر انسانیت کے شعور اور اس کی بقا کو اس شخص کے ذریعے بلند کرتا ہے جس کو خدا منتخب کرے، اور اس کی زندگی میں اضافہ کرتا ہے۔

اسلام انسان کی صلاحیتوں کو بیدار کر کے خود اس کیلئے اور معاشرہ جہان کیلئے زندگی کے اسباب مہیا کرتا ہے، اسلام انسان کو اس کی شناخت اور وجود کی اہمیت کی تعلیم دیتا ہے اس کو عالم ملکوت سے پیوست کرتا ہے اسلام انسان کی بقا چاہتا ہے کوئی بھی خالق یہ نہیں چاہتا کہ اس کی تخلیق کی بے عزتی کی جائے اور جس طرح اس کو استعمال کرنے کا حق ہے اس کو اس طرح استعمال نہ کیا جائے، انصاف نہ کیا جائے۔ خدا انسان کو اس عروج و ملکوت پر دیکھنا چاہتا ہے جس کیلئے اس نے انسان کو خلق کیا ہے۔ کسی شے کا بہترین استعمال یہی ہے کہ اس سے تخلیقی و تعمیری کارنامے انجام دیئے جائیں، جس سے انسانیت کی روحانی و مادی زندگی کمال پر پہنچے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اس شے کو ان اصولوں اور نکات پر کاربند رہتے ہوئے استعمال کیا جائے جو موجد یا خالق نے بتائے ہیں۔

مومن انسان پر دوسرے سطحی فکر و شعور رکھنے والوں سے زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرۂ جہان کے شعور کی بقا اور فکری رفعت کیلئے محنت کرے اس کی صلاحیتیں بیدار کرے ان میں تخلیقی و شعوری فکر و عمل کو بیدار کرے ہر وہ شے جو مادی و روحانی بقا کیلئے اہم ہے اس میں کردار پیدا کرے۔ مومن انسان کائنات میں تخلیقی و تعمیری عمل کا روح رواں ہوتا ہے۔ انسان کی فکری و شعوری بقا انسان کی مادی بقا سے زیادہ اہم ہے جسطرح کسی مسکین کو کھانا کھلانا کسی پیٹ بھرے کی دعوت سے بہتر ہے اور اہم ہے، جس طرح کشتی چلنے کیلئے پانی اشد ضروری ہے اسی طرح اس مادی کائنات کو بقا دینے کیلئے، مصائب و مشکلات میں باہمت رہنے اور زندگی کی کشتی کو چلنے کیلئے علم، شعور، فکر کی ضرورت ہے۔ انسان کا مادی وجود پانی و

غذا کے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح انسان کی فکر و شعوری زندگی و بقا علم کے بغیر ناممکن ہے۔ علم ہی انسان کو اس فکری و شعوری ملکوت میں پہنچا دیتا ہے جہاں وہ خدا کا خلیفہ یعنی جانشین کہلاتا ہے اور اس میں وہ خدائی صفات جلوہ فگن ہو جاتی ہیں جو خدا کی صفات ہیں اس خلوص و لگن کے نتیجے میں جو اس نے مخلوق خدا کی خدمت میں دکھائی ہے تو یہ انسان خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے، پیر بن جاتا ہے، آنکھ بن جاتا ہے پھر وہ اپنی مرضی سے نہیں حرکت نہیں کرتا بلکہ خدا کی رحمت کے سائے میں حرکت کرتا ہے اس انسان میں خدا کی خدائی کا جلوہ ہوتا ہے۔ اس نعمت ہدایت کیساتھ جب وہ خالق کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے تو مخلوق خدا کے خوش ہونے کے ساتھ خالق بھی اسے شفیع بہشت بنا دیتا ہے

خدا فرماتا ہے:

ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں ثابت قدمی عطا فرمائے گا۔"
[سورہ محمد / آیت نمبر ۷]

وہ انبیاء، رسل، آئمہ اور اولیاء کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے یہ وہ انسان ہے جس نے شعور کی رفعت کو پایا منزل مقصود کو پایا اور بقا کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے خلیفۃ اللہ ہونے کا اعزاز پایا جس نے معاشرہ جہان کو بقا دی تو خدا نے بھی اسے ہمیشہ کیلئے بقا دی۔ ہم سب کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم ایسے انسان بنیں اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار

کریں اس نعمت کو دریافت کریں جو خدا نے ہمارے اندر پوشیدہ کی ہوئی ہیں۔ جس طرح زمین کے سینے میں خزانے پائے جاتے ہیں اور ان کیلئے محنت کی جاتی ہے اسی طرح ہم کو اپنے سینے میں موجود پنہاں عظیم دولت و خزانے کو دریافت کرنا ہے۔ تاکہ ہم اس معرفت کے ساتھ مخلوق خدا کی خدمت انجام دے سکیں۔

اس ماہ مبارک میں یہ بہترین موقع ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود اپنی بھی شناخت پیدا کریں اور دوسروں کو بھی خود ان کی شناخت پیدا کرنے کیلئے ابھاریں۔

خدا ہم سب کو معرفت کامل عطا فرمائے اور حصول علم کے بعد تفکر و تعقل کی توفیق عطا فرما کر ہمیں ایسے جہاد کی قوت عطا فرمائے جس میں عالم انسانیت کی فلاح مضمر ہو۔ اور ہمارے محبوب ہمارے قائد ہمارے آخری امام سے ہم کو ملحق فرمادے کہ وہ ہم سے راضی ہوں۔
آمین یارب العالمین

فن و ہنر و ذرائع ابلاغ

انسان کو اک پے درپے آزمائشوں کے میدان میں دھکیل کر خداوند کریم نے انسان کے صبر اور ہمت کا امتحان لیا ہے اور اسلام کی تعلیمات و روشن چہرہ شخصیات کے ذریعے ہر زمانے میں اس زمانے کے حالات کے تقاضوں کے ساتھ ان رہبران الٰہی (علیہم السلام) کے ذریعے عام و مستضعف کو اس کے حقوق سے آشنا کیا! وہ حقوق جو خود اس کے اپنے اوپر لاگو ہیں جس کو خود اسے ادا کرنا ہے اور اِن شخصیات کے ذریعے ارتقا کی منزلوں کو طے کرنے کا خوگر بنایا۔ اس ارتقائی سفر میں صبر و استقامت، مثبت اندیشی و تخلیقی و تعمیری سوچ و عمل کے ذریعے راہ سفر طے کرنے کی سہولت عطا فرمائی۔ خواہ تقویٰ و پرہیز گاری کی بات ہو خواہ طلبِ رزق و مصرفِ معاشی کا ذکر ہو، خواہ دشمنِ اصول ہائے فطرت کے خلاف اعلان جنگ ہو یا صبر و استقامت و انتظار کا موقع، قوم کی فلاح و بہبود کی بات ہو یا اپنے خاندان کی کفالت کی، علم و فکر و عرفان کے میدان ہوں یا منافقانہ سازشوں سے مقابلے! ان رہبران الٰہی (علیہم السلام) نے ہر شعبہ زندگی میں اپنے وجودِ مادی و روحانی کے توازن کو قائم رکھتے ہوئے ان شعبہ جاتِ زندگی میں حصہ لیا۔

ایک عام انسان پر بھی ان شعبہ جات میں حصہ لینا اور صالح اقدامات کرنا اپنے ذہنی و جسمانی استطاعت کے مطابق فرضِ عین ہے۔

فن و ہنر میکینکل بھی ہوسکتے ہیں اور الیکٹرانک بھی ویسے تو مثبت سوچ و فکر کے ساتھ تعمیری و تخلیقی زندگی گذارنا بھی ایک ہنر ہے، ایک فن ہے۔ مگر ہم فنونِ لطیفہ کے فنون و ہنر کی بات کررہے ہیں۔ جس کو ذرائع ابلاغ سے بہت وابستگی ہے۔

انسان کی جسمانی و روحانی ساخت و بافت میں جیسے دل و دماغ کو بہت اہمیت حاصل ہے اسی طرح معاشرہ انسانی میں ظاہری طور پر علم و سائنس، فلسفہ و منطق اور فنونِ لطیفہ سے پیدا ہونے والے احساسات کی بہت اہمیت ہے۔

دماغی محنتیں اور زحمتیں اگر علم و فکر و سائنس و فلسفہ و منطق میں ہوتی ہیں تو فنون لطیفہ دل کے نازک تاروں کو چھو لینے والے سمعی و بصری و لمسی احساسات پر مشتمل ہوتا ہے۔

قلبی جذبات یا احساسات وہ عمل ہے جو اگر دماغ کی ہدایات کے بغیر ہو تو نہ صرف فرد میں اخلاقی روحانی فساد پھیل جاتا ہے اور اس سے نہ صرف اس کا ظاہری جسم بلکہ معاشرہ کی روح بھی مسموم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر دماغی حرکات دل سے مشورہ لئے بغیر انجام دی جائیں یعنی ایسے اصول و قاعدے و احکام وضع کئے جائیں جن میں قلبی مشورہ شامل نہ ہو تو وہ ایک الگ طرح کی انتہا پسندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور یہ بات بھی فرد سے لیکر معاشرے کو خون آلود کر دیتی ہے۔۔

ثقافت یا کلچر ان مثبت لہروں کو کہتے ہیں جو منطق و فنون لطیفہ کے میزان قائم ہونے کے بعد اس فن سے خارج ہوں۔

ذرائع ابلاغ علمی و ثقافتی مرکز ہوتے ہیں ان مراکز کو علم و عرفان و آگہیٔ فطرت پر بات کرنی چاہیے۔ یعنی اس سسٹم کا حصہ بنیں جو نظامِ فطرت کے تحت ارتقاء کی منزلوں پر لیجائے، اس تحریک کو قدم بقدم آگے انفرادی و اجتماعی طور پر بڑھنا چاہیے۔

اصول ہائے فطرت کو معاشرے کی فکری اساس بنانے میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے اور فطری اصولوں پر مبنی روشوں اور طور طریق کو اپنانے پر زور دینا چاہیے تاکہ معاشرے کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی، اعتقادی، علمی ارتقاء کی کوششوں میں تیزی لائی جاسکی۔ اگر ذرائع ابلاغ احساسات و منطق کے درمیان توازن قائم کرنے میں کامیاب کوشش کرتے ہیں تو کہا جائے گا کہ فن و ہنر نے اپنا حق ادا کیا۔ اور خدا کی مخلوق، دماغ و قلب کو صحیح غذا فراہم کی۔ جس طرف فوڈ انسپکٹر ہمارے پیٹ میں جانے والی اور جسم کو قوت دینے والی غذا کی جانچ پڑتال کرتا ہے اسی طرح ہمیں اپنی روحانی غذا کی جانچ پڑتال ایک فوڈ انسپکٹر کی طرح کرنی چاہیے۔ جس طرح زہریلا مواد جسم کو بیمار کر دیتا ہے اسی طرح مسموم خیالات، زہریلے بد اخلاق ذرائع ابلاغ انسانی روحوں و باطن کو سیاہ و تاریک کر دیتے ہیں۔ ہمیں ہر اس احساس قلبی کو اپنے اندر جگہ دینی چاہیے جس سے مثبت سوچ و تعمیری و تخلیقی سوچ پروان چڑھے جس سے فرد کی تربیت کے ساتھ معاشرتی تربیت ہو سکے۔ اور اپنے قلب و دماغ کو ایسی غذا فراہم کرنی چاہیے جس سے نہ صرف فرد کو تسکین ہو بلکہ معاشرۂ انسانی کے بھی

دماغ (علم، سائنس، فلسفہ، منطق) کو قرار آجائے اور فنون لطیفہ کا شعبہ بھی حقیقتاً راحت محسوس کرے۔

منطق و احساسات میں عدل و انصاف کا رشتہ قائم ہو اور اسی طرح پھر تخلیقی و تعمیری سوچ و عمل معاشرے کا وطیرہ بن جائے اور ہم آزمائشوں سے بھری اس دنیا میں اپنی محنتوں اور زحمتوں کو مثبت رنگ میں رنگ سکیں جس سے پیار و محبت، عدل و انصاف کے پھول کھلتے ہوں، جس سے صبر و استقامت و عمل صالح کے میٹھے میٹھے پھل پیدا ہوتے ہوں۔ ہماری وہ زحمتیں جو ہمارے اس دنیا کے نظام کو ارتقاء و مثبت میدانوں میں سرخرو کریں اور اس دنیا کے آخرت کے کھیتی ہونے کے طور پر ہم یہاں وہ مثبت اندیشی کاشت کریں جو ہماری جنتوں کو میٹھے رس دار اور خوش رنگوں پھلوں کی شکل میں حاصل ہوں۔ اس دنیا کی ایسی تعمیر کریں کہ ملائکہ بھی خدا کے آگے شرمندہ ہو جائیں اور جو اعتراض نہوں نے خلقت انسان کے وقت خدا سے کیا تھا اس سے پہلو تہی کریں! آمین یارب العالمین

مسائل زِندگی اور غصّہ

(فارسی مضمون سے ترجمہ)

آجکل جب ہم سڑکوں اور شاہراہوں پر ٹیکسی، بس، موٹر سائیکل پر یا پھر پیدل چل رہے ہوتے ہیں بہت سے ایسے افراد نظر آتے ہیں جو بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کے دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔

مطلوبہ موضوع پر کچھ عرصے پہلے کسی خبر میں اس کی وجہ معاشی سختیاں بتائی گئیں تھیں۔ بے روزگاری اور کساد بازاری عوام کو اس کیفیت میں مبتلا کرتی ہے۔

بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اکثر ایک ہارن یا لاشعوری اوورٹیک گلیوں اور سڑکوں پر گالم گلوچ اور لڑائی جھگڑے تک لے جاتی ہے جس کا نتیجہ سوائے پشیمانی اور اور سکون کی رخصتی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

گھروں کے اندر بھی چھوٹا سا مسئلہ چیخم دھاڑ اور مار دھاڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے، ہم ان مسئلوں کو یہاں تجزیہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ ایک چھوٹا سا غیر اہم مسئلہ کیوں صبر اور درگذر کو ہاتھ سے گنوا بیٹھتا ہے۔

بجائے اس کے کہ ہم غصہ اور جھگڑے کی جڑ کو رفع کرنے کی کوشش کریں، صرف اور صرف دوسروں کے کندھوں پر تمام غلطیوں کا بار ڈال دیتے ہیں اور حکومت اور میڈیا وغیرہ کو اس جھگڑے اور سختیوں کا قصوروار گردانتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ یہ ادارے ان سختیوں اور مشکلات میں قصوروار نہیں ہیں، البتہ وہ اگر کچھ نہیں کر رہے اور اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہے تو کیوں ہم خود اپنی زندگی کو محبتوں اور خوشیوں اور مسکراہٹوں سے محروم کریں اور بجائے پیار اور میٹھی زبان اور گفتگو کے ننگی گالیاں دے کر، برا بھلا کہہ کر اور جھگڑا کر کے اپنی زندگی کو جہنم بنالیں؟

جاپانیوں نے پانی پر ایک تجربہ کیا اور دیکھا کہ کس طرح ایک منفی احساس، ایک برا جملہ یا لفظ، ایک بری نظر پانی کے مولیکیول پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اور اُس مولیکیول کو گندا اور بد نما بنا دیتی ہے جبکہ اس کے برعکس میٹھی زبان، پُر امیدی اور شادابی، روحانیت اور دعا پانی کے مولیکول کو خوبصورتی میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم انسانوں کے جسم میں تقریباً 70 فیصد پانی ہے، تھوڑا غور کیجیے کہ ہر لفظ، ہمارے کردار اور ہمارے احساسات پر کیا تاثیر چھوڑتا ہو گا؟

اگر معاشرہ میں پارٹی بازی کی وجہ سے تھک چکے ہیں اور آپ کے اعصاب جواب دے چکے ہیں تو قرآن کے اس پیغام کو ہر روز دہرایا کیجیے «إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّي وَرَبِّكُم مَّا مِن دَآبَّةٍ إِلاَّ هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا إِنَّ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ» (سورہ ھود،56) بے شک میں نے اللہ پر جو میرا اور تمھارا پروردگار ہے پر اعتماد کر لیا ہے۔ کوئی حرکت دینے والا نہیں ہے

مگر یہ کہ اُس کی مہار اُس اللہ کے ہاتھ میں ہے، مجھے یقین ہے کہ میرا پروردگار مدد کرنے والا ہے۔ اس کے علاوہ حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (173 / سورہ آل عمران) بے شک ہمارے لئے خدا ہی کافی ہے اور وہ سب بڑھ کر ساتھی ہے۔ نیز اپنی حق بجانب پارٹی کی کامیابی کیلئے یہ خوشخبری بھی سنتے جائیں، قرآن مجید کی آیت ہے: لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنوگے اگر ان سب حالات میں تم صبر اور تقوے کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ (سورہ آل عمران /186) نیز امام جعفر صادق عَلَيْهِ السَّلَام فرماتے ہیں: الْمُؤْمِنُ إِذَا غَضِبَ لَمْ يُخْرِجْهُ غَضَبُهُ مِنْ حَقٍّ وَإِذَا رَضِيَ لَمْ يُدْخِلْهُ رِضَاهُ فِي بَاطِلٍ وَ الَّذِي إِذَا قَدَرَ لَمْ يَأْخُذْ أَكْثَرَ مِمَّا لَهُ. ایمان والا جب بھی (کسی باطل عمل پر) غصہ میں آتا ہے تو اُس کا غصہ اُسے حق سے باہر نہیں کرتا اور جب وہ کسی بات پر خوش ہوتا ہے تو اُس کی خوشی اُسے باطل کی طرف کھینچ نہیں لے جاتی اور جب قدرت مند ہوتا ہے تو اپنے حق سے زیادہ نہیں لیتا۔ (بحار الأنوار (ط-بیروت-ج 75، ص209، ح85)

شاید آپ کہیں: بہت اچھا مگر ہمارے اعصاب اور ہمارا غصہ ہمارے کنٹرول میں نہیں رہتا، کیا کریں؟ عرض ہے کہ ہم پیدائشی غصہ کرنے والے نہیں ہیں، نہ ہمارے دوست ایسے ہیں نہ ہی سکون اور آرام ذاتی ہے بلکہ یہ صفات اکتسابی ہیں، ماحول سے لی جاتی ہیں سیکھی جاتی

ہیں۔

ہمیں اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ غصہ اور سختی ہم نے اپنے گھر سے، اپنے ماحول سے سیکھی ہیں اور اُس کو معاشی مشکلات تک لے گئے ہیں، آپ کے پاس غصہ کے لئے کوئی بھی دلیل ہو مگر یہ صفت قرآنی اخلاق اور ایک مسلمان کیلئے اچھی نہیں ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّـهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ أُولَـٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ اور ہم ضرور تمھیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ: "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے"۔ انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں۔ (سورہ بقرہ /155،156،157)

ہم کو بھولنا نہیں چاہیے ہے کہ بہت سادہ سا گناہ غصہ کرنا، گالیاں دینا اور برا بھلا کہنا ہے جو عشق و محبت و مہربانی کے رشتوں کو ایک دوسرے سے ختم کر کے نفرت اور کینہ میں بدل دیتا ہے، ایسے افراد سے لوگ ملنا بھی پسند نہیں کرتے جو بات بات پر غصہ کرتا ہو اور چڑچڑاتا ہو۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جب تم کسی سے دوستی کرنا چاہو تو اُسے تین دفعہ

غصہ میں لا کر دیکھو اگر وہ غصہ میں بد گوئی کرنے لگتا ہے تو اُس سے دوستی کا ارادہ ترک کر دو۔ (غُرر الحکم)

چند آسان حل:

اگر ہماری نفرت اور غصہ بے روز گاری کی وجہ سے ہے تو ہم خود سے کوئی کام کیوں نہیں شروع کر دیتے اور خود سے کوئی مشغلہ یا کام ایجاد کر لیں، اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ کام وجود رکھتا ہے مگر ہم کیوں کہ اپنے من پسند کام حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بابو بن کر اے سی کمرے میں بیٹھ کر کام کرنا چاہتے ہیں تو پھر ہم بے روز گار رہتے ہیں۔

اگر شادی نہ ہونا اور ہمسفر نہ ملنے کی وجہ سے غصہ ہے تو سب سے پہلے خدا سے دعا کریں(اس مورد میں بہت دعا اور اذکار موجود ہیں) اور ساتھ ہی ساتھ مناسب ہمسفر کی تلاش کرتے رہیں۔

کامیابی اور سکون کیلیئے ہم کو بھولنا نہیں چاہیے کہ ان زرق و برق زمانے میں ہم فکر بھی ہیں اور بے دست و پا کر دیتے والے بھی، عفت و پاکدامنی کو ہمیں اپنا معیار قرار دینا چاہیے کیونکہ قرآن مجید کی صریح آیت ہے: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۗ اور جو لوگ نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے انہیں چاہیے کہ عفت اور ضبط نفس سے کام لیں یہاں تک کہ اللہ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔(سورہ نور /33) اگر ہم پاک اور نیک ہمسفر چاہتے ہیں تو قرآن مجید کے مطابق ہم کو خود بھی پاک اور

دیانت دار ہونا چاہیے۔ الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ ۖ وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ ۚ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔(سورہ نور /26)

گھر میں بیوی پر غصہ کرنے والے کو اپنی بیوی کے کاموں کا اندازہ کرنا چاہیے، ایک دن اگر بیوی گھر کے کام نہ کرے تو گھر کی حالت قوم ثمود کی طرح عذاب والی کیفیت میں الٹی ہوئی ہو گی، بیوی کے کاموں اور شوہر اپنے کاموں کی لسٹ بنائے اور کاموں کی تعداد کے ساتھ نوعیت بھی جانچے۔ نیز میاں بیوی آپسی غصے کو دور کرنے کیلئے غصہ کی رد میں روزآنہ 1، 2 صفحہ لکھنا عادت بنالیں اور اس کے مضر اثرات کو تحریر میں لے کر آئیں نیز آپس میں ان نکات پر تبادلہ بھی کریں اور ڈسکس کریں۔ قرآن مجید کی یہ آیت حقوق پر جھگڑنے والوں کیلئے ہی ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے اور سب پر اللہ غالب اقتدار رکھنے والا اور حکیم و دانا موجود ہے۔(سورہ بقرہ /228)

بچوں پر بھی غصہ کرنے سے بچیں کیوں کہ بچے ہمارے پڑھاپے کا سہارا اور آخرت کیلئے سرمایہ کاری ہیں آج ہم اپنے بچوں کی تربیت بغیر الجھے اور غصہ کے کریں گے تو ہمیں

مستقبل میں بھی مثبت نتائج اُن کی زندگی کے کامیاب تجربوں کی صورت میں نصیب ہوں گے۔ چھوٹے بچوں پر ماہرین نفسیات نے بے شمار تحقیقات کی ہیں اور ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں ہیں، ہم کو چند اچھی کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ بچہ کیلئے اس نئی جگہ (دنیا) میں اُس کیلئے کیا کیا چیلنجز ہیں اور وہ اُن کو کیسے پورا کرتا ہے اور کس طرح اس دنیا میں مرحلہ وار سیکھنے کی کیفیت سے گذرتا ہے اور اُس کے وہ اعمال جس پر ہم غصہ کھاتے ہیں وہ اُن سے جو کچھ سیکھ رہاہوتا ہے مگر غصہ کرنے پر اُس کی خود اعتمادی کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے جو بڑے ہونے پر دبّو اور بودے پن کا باعث ہوتی ہے۔ نیز ہم کو اپنے بچپنے کو بھی تصور کرنا چاہیے کہ اگر ہمارے والدین نے ہم پر غصہ و برہمی دکھائی ہوتی تو ہمارے کیا جذبات ہوتے؟ چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ کی چنگاری پیدا ہوتے ہیں وضو کا سہارا لیجیے۔ حدیث مبارکہ میں ہے۔ رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اِنّ نے فرمایا: الغضب من الشّیطان و إنّ الشّیطان خلق من النّار وإنّما تطفا النّار بالماء فإذا غضب أحدکم فلیتوضّأ. غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور شیطان آگ سے خلق کیا گیا ہے اور آگ پانی سے بجھتی ہے، پس جب بھی تم میں سے کوئی غصہ میں آیے تو وضو کرلے۔ (نہج الفصاحہ ص 286، ح 660)

کساد بازاری کے دور میں شاید بظاہر ہمارے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں اور ملکی سطح پر حقیقی ذمہ داری معاشی اور اقتصادی ماہروں کی ہو مگر ہم اپنے طرز اور طریقوں سے اپنی معاشی حالت کو اپنے ہاتھوں درست کرسکتے ہیں اور اپنی زندگی کو آسان بنا سکتے ہیں۔ کس طرح؟

کفایت شعاری کرنے سے، ہر خواہش کو پورا کیے جانے سے روک کر، آنکھوں کی ہر پسند پر مر مٹنا چھوڑ کر اور دوسرے بہت سے راستے کہ جو آپ خود بہتر جانتے ہیں قرآن مجید کی آیت ہے: أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہارے سامنے تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہل ایمان) کی سی صورتیں (اور شکلیں) آئی ہی نہیں۔ جنہیں فقر و فاقہ اور سختیوں نے گھیر لیا تھا۔ اور انہیں (تکلیف و مصائب کے) اس قدر جھٹکے دیئے گئے کہ خود رسول اور ان پر ایمان لانے والے کہہ اٹھے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد یقیناً نزدیک ہی ہے۔(سورہ بقرہ /214)

گالیاں منہ سے اُسی وقت نکلتی ہیں جب غصہ کی آگ عروج پر پہنچ چکی ہوتی ہے۔ غصہ اور انسان اپنے غصہ کو روکنے میں کمزوری کی دلیل پر اوچھی حرکت کرتا ہے اور گالیوں میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس عادت کی تکرار سے یہ انسان کی عادت اور مستقل صفت بن جاتی ہے۔ قرآن مجید کی آیت ہے: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ اور جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔(سورہ آل عمران /134)

ہم کو غصے کے نقصانات کا اندازہ کرنا چاہیے نیز ذہنی سکون، اطمینان کے درہم برہم ہو جانے پر خوف کھانا چاہیے، غصہ کی چنگاری چمکتے ہی ذہن کو صبر و تحمل کے فوائد اور غصے کے نقصانات پر غور کرنا شروع کر دینا چاہیے۔ امام علی عَلَیہِ السّلام فرماتے ہیں: غضب و غصہ کی شدت انسان کی منطق (صحیح فکر) کو بدل دیتی ہے، دلیل و حجت کی جڑوں کو کاٹ دیتی ہے اور سوچ پراگندہ کر دیتی ہے۔ (کنزالفوائد، ج1، ص319)۔

غصہ کے دستک دیتے ہی خود کو ہشیار کر لینا اور سدباب کی کوشش شروع کر دینا ہی عقلمندی ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: سب سے زیادہ حاضر جواب وہ ہے جو غصہ نہ کرے۔ (غُرر الحکم /ج1، ص184، 122)۔

جس چیز کو ہم تبدیل نہیں کر سکتے، ہماری توانائی اور طاقت و ہمت سے تبدیلی لانا محال ہے تو ہم کو اُس چیز کو قبول کر لینا چاہیے اور خداوند تعالیٰ کی طاقت پر بھروسہ کرتے ہوئے اُس سے دعا و توسل کرتے رہنا چاہیے۔ خدا ہی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کیلئے بھڑکتی آگ کو ٹھنڈا کر سکتا ہے اور وہی ہے جو ہر اُس معاملے کو پلٹ سکتا ہے جو کسی انسان کے بس میں بھی نہ ہو، اور دعا کو تو ویسے بھی مومن کا ہتھیار کہا گیا ہے یعنی مومن غصّے و غضب میں بھی دعا و توسل کو اپنا اسلحہ بنا کر کامیابی حاصل کرتا ہے۔

اگر غصہ دائمی کیفیت اختیار کر رہا ہے تو یہ بیماری کی کیفیت ہے اور کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج نہ ہو۔ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ۔ اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی شفا بھی دیتا ہے۔

(سورہ شعراء /80)، غصہ کی مستقل کیفیت میں اچھے ماہر نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے اور اس دائمی غصہ کی بیماری کا علاج کرنا ضروری ہے۔ بعض دفعہ کچھ غذائیں بھی گرم مزاجی کا باعث بنتی ہیں یا پیٹ کا خالی رہنا اور نیند کی کمی بھی غصہ میں اضافہ کرتی ہیں، بغیر تفریح کے صرف کام کام اور انتھک محنت بھی اس مرض کا باعث بنتی ہے، چند ماہ یا ہفتہ میں ایک دفعہ کسی پُر فضا اور ہرے بھرے قدرتی ماحول میں تفریح کیلئے جانے سے مزاج اور طبیعت پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں، ٹی وی پر کسی تفریحی پروگرام سے لطف اندوز ہوکر بھی یہ کیفیت دور کی جاسکتی ہے۔ ورزش کریں اور مختلف من پسند آؤٹ ڈور یا اِن ڈور کھیل کھیلنے سے بھی مثبت نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اشیاء اور لوگوں کے مثبت پہلو نظر میں رکھیں اور منفی پہلوؤں کو نظر انداز کریں، تعمیری پہلوؤں پر غور کریں اور مثبت کاموں اور افکار سے لذت حاصل کریں۔ مال اور دنیا کی لذتوں کی حرص جو کہ کبھی پوری نہیں ہوتی نتیجتاً غصہ کی کیفیت کی پیدا کرتی ہے، کوشش کریں کہ دنیا کو ضرورت کے مطابق حاصل کریں یا اتنی جدوجہد کریں جو اعتدال کی روش ہو۔ ساتھ ہی اپنی کامیابیوں پر یا غلطیوں پر کبھی افراط و تفریط کا شکار نہ ہوں، یعنی کامیابی پر مغرور اور ناکامی پر مایوسی سے دور رہیں، کیونکہ یہ دونوں کیفیات بھی غصہ کا باعث بنتی ہیں۔

بعض دفعہ تنہائی اور مستقل ایک ہر ڈگر پر کام کرتے رہنا بھی اکتاہٹ اور پھر غصہ کی کیفیت پیدا کرتا ہے، حدیثِ مبارکہ میں ہے: صلہ رحمی میں زندگی ہے عمر بڑھتی ہے، ہمیں اپنے روزآنہ کے مصروف لمحات میں کچھ وقت گھر والوں، بچوں، دوستوں اور رشتوں داروں کے

ساتھ ملنے جلنے اور باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کرنے میں صرف کرنا چاہیے، نماز جماعت میں شرکت کریں، محافل اور میلاد کی مجالس میں بھی جذبات اور احساسات معتدل رہتے ہیں نیز تواہمات سے دور رہ کر انسان خوش باش زندگی میں جیتا ہے۔ اگر ہم اس طرح اپنے اندرونی کیفیات پر نگاہ ڈالیں تو ہم اپنی خوشی اور کامیابی کو صرف مادیات کے حصول یا مصرف میں ہی نہیں سمجھیں گے، خدا کو اپنی زندگی کے ساتھ جانیں، ہماری کوشش روحانیت کے ساتھ ہو۔ اس طرح ہماری زندگی میں سکون و آرام زیادہ اور پائیداری کے ساتھ ہو گا، استغفار اور خدا اور امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) سے توسل کو اپنا معمول بنالیں۔

شاید آپ کہیں: صرف معنویت اور روحانیت کے ساتھ گھر کا راشن اور گھر کا کرایہ نہیں دے سکتے وغیرہ

میں کہتا ہوں کہ کوشش اور محنت اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں دینی فرائض /واجبات اور حرام و محرمات اور روحانیت کا بھی خیال رکھیں، تقوے سے انسان کی عقل میں اضافہ ہوتا ہے اور عقل مسئلوں کے حل کرنے میں مددگار ہے۔

آج کے زرق برق مادّی دور میں جتنا دین مبین اسلام کے اصول اور معیارات کی ضرورت ہے اتنا پہلے نہیں تھی، اگر ہم اپنے تمام وجود اور اپنے خلوص دل اور قلبی عقیدہ کے ساتھ دینی قوانین پر نظر ڈالیں اور دینی ماہرین کی راہنمائی میں کوشش کریں کہ ان قوانین کو

زندگی میں جاری کریں گے تو یقیناً ہم آرام و اطمینان کی زندگی شروع کر دیں گے، اور یہ تو خداوند تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ بے شک خدا کی یاد سچے دلوں کے آرام و اطمینان کا باعث ہے۔ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (سورہ رعد /28)

حکمت، اقتصاد اور اخلاق

جدید دور تعلیم کے نئے اہداف کے ساتھ آیا اور صنعتی ترقی کی آڑ میں کارخانہ چلانے والے انسان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے تعلیم و تربیت اور امتحانات کا نظام لایا اور یہ نظام اسکول، کالج، یونیورسٹیوں کی شکل میں ایسی تیزی سے چھایا کہ جس نے بھی اِس دور کی تعلیم و تربیت میں حصہ نہ لیا وہ معاشی اعتبار سے پست و راندہ بازار یا کارخانہ ہو گیا۔

آج کے دور میں نظام تعلیم و تربیت دین اسلام کی نظر میں ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے آج کے جدید صنعتی دور کی احتیاجات بھی پوری ہوں اور دوسری طرف سماجی عدل و انصاف کے ذریعے عبد الٰہی پیدا کیے جا سکیں۔ نہ کہ صرف صنعت کار یا منافع خور!

ایسا تعلیمی نظام جس میں اخلاق و کردار کے ذریعے سماجی ناہمواریوں کی پیدائش کی روک تھام اور معاشرتی عدل کی بنیاد قائم کرنا ہو۔

ایک دفعہ امام صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا: مولا ظالم حکومت کے خلاف قیام کیوں نہیں کرتے تو امام نے جواب دیا کہ اگر متقی باصلاحیت ہوں اور باصلاحیت متقی تو میں قیام کرلوں۔ تقویٰ کا معیار صرف نماز روزہ حج کی ظاہری شکل نہیں بلکہ ان کنایوں اور تمثیلوں

سے سیکھ کر ایسا عمل مطلوب ہے جو انسانی سماج کو عدل و انصاف سے پر کر سکے۔ اُس کو دشمن کی ترقی و پیشرفت کے مقابل خود کو جہاں علمی اور تکنیکی مہارت سے لیس کرنا ہے تو دوسری طرف خدا پر ایمان کے اثرات اپنے عمل سے بھی ظاہر کرنے ہیں۔ اس معتدل رویے سے ایسی تہذیب کی بنا ڈالنی ہے جو آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے روحانی خوام مواد میسر کر سکے۔ یعنی تعلیم جہاں انسان کو اس صنعتی دور کی ضرورت پوری کرواتی ہیں اور اُس کی اجرت اُسے جدید کرنسی کی صورت میں ادا کرتی ہے تو دوسری طرف اُس کو سماج کے بندھنوں کو نبھانا اور اپنے دیگر بھائیوں کی معاونت، مدد و خبر گیری کرنا سکھاتی ہے اور تیسری طرف اُس کو ان سماجی ذمہ داریوں کے ذریعے آخرت میں بہترین ثواب کا حقدار بھی بناتی ہے۔ تعلیم و تربیت ایک ایسا سلسلہ ہے جو کائنات کے ارتقاء میں فکری اور پھر عملی میدانوں میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور پھر ہم اگلی نسلوں کیلئے تازہ فکری مواد دے کر اس تعلیم و تربیت کے زنجیری سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے ارتقاء کائنات میں حصہ دار بنتے ہیں۔ یہی تعلیم و تربیت ہے جو فرد یا معاشرے کو اُن کے حقوق ادا کرواتی ہے حرمت و فضیلت اور رذالت و پستی کو پہچنواتی ہے تا کہ ہم اپنی زندگیوں میں مسائل کی جڑ اور اُن کے سدباب کی طرف رجوع کریں۔

"رسول وہ ہے جو تمھارے اندر سے زنگ کی چادریں اتارتا ہے اور تمھیں تعلیم و تربیت دے کر پاکیزگی وطہارت دیتا ہے۔" (القرآن)

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

"جس نے اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت درست انداز میں کر دی، میں اُس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں اور ہر لڑکی کی تربیت پر اُس کا جنت میں درجہ بڑھتا جائے گا۔"
انسان بھوکا رہ لے مگر تعلیم و تربیت کے مواقع ہاتھ سے نہ جانے دے اور سیکھنے کے عمل میں رکاوٹ کو دور کرے۔ تعلیم کسی مسلمان کیلئے اتنی ضروری ہے جیسا کہ کھانا پینا اور سونا! خود حصول علم کیلئے جن وسائل کی اشد ضرورت ہوتی ہے اُس میں رپیہ پیسہ کا بہت دخل ہے، انسان حصول تعلیم کے ساتھ اپنی اقتصاد اور معیشت سے غافل نہ ہو!

دنیا کی نعمتوں میں رہتے ہوئے خدا کی عبادت اور خدا کی یاد رکھنے والا شخص ایسے شخص سے افضل ہے جو صرف سختیوں اور پریشانیوں میں ہی خدا کا تابع بنتا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"مومن کیلئے فقر یا فقیری کا خوف، ہر قسم کی برائی اور فتنہ کی چابی ہے۔"

یعنی تعلیم یافتہ کا مطلب یہ نہیں کہ ہر ڈگری ہولڈر اور پی ایچ ڈی پڑھا لکھا کہے جانے کے لائق ہے!

ایسی تعلیم جو انسان میں عمومی فہم نہ پیدا کر سکے تاکہ وہ اِس عمومی فہم کے ذریعے پیش آنے والے مسائل کی گتھیوں کو سلجھا سکے تو ایسی تعلیمی اسناد گدھے پر لدی کتابوں کی مانند ہیں۔ تعلیم اگر انسان کو روحانیت اور معنویات سے دور لیجائے یا روحانیت، معرفت کا سبب نہ بنے بلکہ غرور و سرکشی کا باعث بنے تو ایسی تعلیم انسان کو شیطان کا خدمتگار بنا دیتی ہے۔ ایسی تعلیم

جو انسان کو مثبت حرکت کے بجائے منفی حرکات یا جمود کا شکار بنادے، آباء اجداد کے جاہلانہ رسوم اور اُن کی غلطیاں جو جینز میں داخل ہوگئی ہیں اُن کا سدباب دعاو عمل سے نہ کرے تو یہ طاغوت اور شیطان ہے۔

ایسی تعلیم جو فقر سے بچنے کیلئے حرکت پر نہ اکسائے اور خدمتِ خلق کا جذبہ قلب انسانی میں پیدا نہ کر سکے، جو باطل کے فریب میں آجائے یا باطل کے خوف سے بے جا مصلحتوں اور نہ ختم ہونے والی منصوبہ بندی میں الجھادے یا بنا عقلی و شرعی مصلحت کوئی نام نہاد انقلابی بنا دے تو یہ تعلیم گمراہی ہے اور جہنم کی آگ ایسے نام نہاد علماء کیلئے خالق نے تیار کر رکھی ہے اس دنیا میں ایسے نام نہاد تعلیم یافتہ افراد کیلئے ذلت اُن کا مقدر اور آخرت میں بھی رسوائی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے۔

مگر اگر تعلیمی سلسلہ اپنے درست خطوط پر استوار و گامزن ہے اور متعلمین اور طالب علموں میں عام فہمی کے ذریعے مسائل کی پیش بینی کے ساتھ الٰہی رہنماؤں کی ہدایات اور توسل کی روشنی میں تجزیہ و تحلیل ہورہا ہے تو ہم اس دنیا کو جنت کے نمونے کے طور برقرار رکھ سکتے ہیں، یہ سسٹم صرف تعلیم و تربیت کی ہی بدولت اپنی زندگی کی میعاد پوری کر سکتا ہے۔ اسلام وہ واحد صارف دوست نظام ہے جس کو وہی سیکھ سکتا ہے اور اِس کی تعلیم حاصل کرتا ہے جو اسے سیکھنا چاہے ورنہ جو اس کو راہنما نہیں بناتے وہ ممکن ہے قلیل مدتی آسائشوں کو تو حاصل کر لیں مگر طویل المدتی بنیاد پر فوائد اسی کو ملتے ہیں جو مسائل کے حل اور مسائل کی پیش بینی کے طور پر اسلامی تعلیم و نظام تربیتی کو اپنا راہنما قرار دے۔

عشق اور عاشقی

(فارسی مقالے کا ترجمہ)

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ

اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت (نرم دلی و ہمدردی) پیدا کر دی۔ بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کیلئے بہت نشانیاں ہیں۔ (سورہ روم /21)

خود کو پسند کیے جانے اور دوسروں کو پسند کرنے کی حِس تمام انسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ظاہری و جسمانی وضع قطع، ذاتی یا خاندانی کردار و اطوار، فردی مہارتیں اور ہنر مندیاں اس پسند کا محور ہوتی ہیں۔

شادی عشق کرنے کے بعد ہونی چاہیے یا شادی کے بعد عشق ہونا چاہیے نیز عشق کی سائنس کیا ہے؟

پہلے ہم عشق کے لفظ پر تھوڑی نظر ڈالتے ہیں۔

لوگوں کی نظر میں اس لفظ کے بہت سے مختلف معنیٰ ہیں، کہتے ہیں کہ عشق کے معنیٰ چاہنا کے ہیں، لیکن عربی زبان میں ایک پیچ دار صحرائی بیل یا نیلوفر کو "عشقہ" کہتے ہیں، یہ بیل جس درخت پر چڑھتی ہے اور جتنا اوپر جاتی رہتی ہے حتیٰ اس قدر اوپر چلی جاتی ہے کہ پھر خود خشک ہو جاتی ہے اور اپنی توانائیاں اُس پودے کو بخش دیتی ہے۔

ہم عشق کے لفظ کو سادہ سی زبان میں 'پسند کرنا' تعریف کرسکتے ہیں یا دوسری تعریف میں اس جذبے کو شدید محبت اور حتیٰ گہرا جذبہ سمجھ سکتے ہیں۔

عشق صرف شادی کیلئے ہوتا ہے، شدید ترین عشق شادی کے بعد خوشحالی اور ایک دوسرے کی رضایت کے ساتھ اس شادی شدہ جوڑے کے تعلق کو پائیدار رکھنے کیلئے بہت ضروری ہے۔

مغربی مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے کے عشق اور شادی کے بعد کے عشق کو الگ الگ تصور کرتے ہیں، نیز جنس مخالف کے ساتھ عشق کے لفظ کو زیادہ تر جنسی تسکین کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ افرد جتنا زیادہ عشق کا تجربہ کریں، خوشی اور نشاط کا احساس کریں، مگر عاشق ہونا اور عاشقانہ زندگی گذارنے کا مطلوب اثر شادی کے ساتھ ہی ممکن ہے۔

امریکی ماہر نفسیات اپنے ایک مشہور نظریہ جو کہ عشق کے مثلث کے نام سے مشہور ہے کہتا ہے کہ عشق تین بنیادوں پر مکمل ہوتا ہے۔ دل کی پاکیزگی، جنسی کشش، اور ذمہ داری۔ ہم ایسے رابطے و تعلق کو جس میں دل کی پاکیزگی ہو (نہ جنسی کشش، نہ ذمہ داری) سادہ دوستی کے نام سے جانتے ہیں، جنسی کشش ایک ایسے قسم کے عشق کو پیدا کرتی ہے جس کے امتیازات میں بے عقلی گھٹیا پن ہے اور فقط ذمہ داری کی بنیاد پر تعلق ایک باطل عشق ہے۔ پس شادی کیلیے جو کہ ایک طولانی رابطہ ہوتا ہے؛ ایک یا دو جز سے زیادہ کی ضرورت ہے۔ رومینٹک اور شہوانی عشق جو ذمہ داری سے دور ہوتا ہے اکثر دوام پذیر نہیں ہوتا۔ ترحم آمیز عشق جس میں کہ شہوت نہیں ہوتی اور جو ممکن ہے کہ آیندہ بعض وجوہات کی بنا پر شادی کو طول نہ دے سکے۔ جھوٹا عشق جس میں بظاہر دل کی پاکیزگی ہوتی ہے مگر ذمہ داری نہیں ہوتی اور جس میں جلد بازی ہوتی ہے۔

دوسری طرف شور شرابے سے بھرپور عشق شادی سے پہلے ممکن ہے بجائے اس کے کہ ایک پاکیزہ تعلق کو ظاہر کرے اور مستقبل کی ذمہ داری کا آئینہ دار ہو، نفسیاتی گڑبڑ کا شاخسانہ ہوتا ہے، جس میں کردار کی بد خلقی بھی شامل ہے اور جس میں فکر و غور کے بجائے جلد بازی ہوتی ہے۔ ایسا عاشق معشوق کو بے نقص اور کامل سمجھ بیٹھتا ہے اور صرف اپنے معشوق کو سمجھتا ہے کہ جو اُس کو بد بختیوں اور احساساتِ محرومی سے نکال کر سعادت اور اطمینان کی طرف لے جاسکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب عاشق معشوق کو ایسا مقدس اور معصوم مقام پر فرض کرتا ہے اور وہ اُس پر پورا نہیں اترتا تو عاشق معشوق کو بھیڑیا سمجھنے لگتا

ہے جو بھیڑ کے لباس میں ہے۔ اسی لئے شدید ترین عاشقوں کو شادی سے پہلے کافی غور و خوص اور تدبر کر لینا چاہیے۔ اور ایسے شدید قسم کے جذبات میں فیصلے سے پہلے کسی اچھے ماہر نفیسات سے رجوع کرنا چاہیے۔

شادی سے پہلے عشق، ضروری نہیں ہمیشہ شادی کی کامیابی کی ضمانت ہو لیکن اسی کے ساتھ آنکھوں کی اور کانوں کی بندش سے بچنا چاہیے۔

یہ بھی جان لینا چاہیے کہ کامیاب شادی کیلئے صرف عشق ہی کافی نہیں ہے بلکہ دوسری خصوصیات جیسے کہ ایک دوسرے کی ہم فکری، جسمانی، نفسیاتی، عقلی، مالی طاقت و توانائی ہو جو کہ ثقافت اور تعلیم اور ان دونوں کے معاشرتی طبقے کی ضرورتوں اور مشترک اہداف پر مبنی ہوں، مشترک تفریحات ہوں جس پر دونوں متفق ہوں۔ وغیرہ

آج کی نسل قدیم زندگی اور ماڈرن دنیا میں بیچ کی راہ دیکھ رہی ہے اور اس کا حصول کافی مشکل ہے۔ والدین کو چاہیے کہ ایک مشترک زندگی کی راہ ہموار کریں جس میں اطاعت اور خوشی و اطمینان اور رضایت ہو۔ جو ان حضرات بھی جان لیں کہ والدین کے تجربے اور صلاحیتوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اور صرف ایک ہیجانی اور شہوانی رابطے کی خاطر تمام اقدار کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔

کیوں بہت سے شادی شدہ جوڑے عشق و محبت کے ساتھ اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور پھر اچانک بند گلی میں پہنچ جاتے ہیں کیا یہ غلط راستہ بعد میں ان کو ملا یا شروع سے ہی غلط

راستے کا انتخاب کیا ہے؟ کس طرح جلد ختم ہو جانے والے عشق اور عشق واقعی میں فرق کریں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے اوپر نیلوفر بیل کی جو مثال دی تھی وہ ایک اچھی مثال ہے جس میں عاشق معشوق کی خاطر اپنی توانائیاں خرچ کرتا ہے اور مشقتیں کرتا ہے۔

افسانوی عشق صرف کتابوں میں ہوتے ہیں!

بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری زبان کے ادب میں بہت سے ایسے عشق مشابہ الفاظ سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ایسے عاشقی افسانہ جو عشق کے عنوان سے ہمارے ادب میں موجود ہے اس کا حقیقت کی دنیا سے بہت کم ہی واسطہ ہوتا ہے۔ حتیٰ ایک شخص جب دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلاں کو بے انتہا پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کیلے آسمان سے تارے توڑ لائے تاکہ اُسے حاصل کرلے، اور اس کیلئے طرف مقابل سے ہر طرح کے بحث و مباحثہ کیلئے تیار رہتا ہے کیا واقعی ایسا ممکن ہے یا نہیں کہ جیسا وہ سمجھ رہا ہے ویسا ہی ہے۔ انسانی رابطوں میں ایسے رابطے بعید ہیں لیکن ناممکن نہیں ہیں؛ مثلا ایسا عشق انسان اور خداوند متعال کے درمیان امکان پذیر ہے۔ ہم جب کسی شخص کی طرف ملتفت ہوتے ہیں، اُسے پسند کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُس کی تمام تر توجہ ہماری طرف رہے اور اگر وہ کسی دوسرے کی طرف توجہ کرے تو ہم کو اذیت ہوتی ہے۔ صرف خدا تعالٰی ہے کہ جو ہمارا دوست ہے اور جس وقت وہ دوسروں کی طرف توجہ کرتا ہے ہم کو اذیت نہیں ہوتی بلکہ ہم خوش ہوتے ہیں۔ یہ ایک واحد مثال ہے جو عشق حضوری اور عشقِ حقیقی کی ہے۔ ایسے ہی عشق ہمیشہ پائدار رہتے ہیں جو خدا وند متعال کے عشق کے پرتو میں پروان چڑھتے ہیں۔ اور

جس کا مقصد خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور رضایت ہوتا ہے۔ ایسے عشق خواہ مساجد کی نورانی فضاء سے ، زیارتگاہوں پر مومنین و مومنات کے مجمع سے یا پھر فیملی اجتماعات سے ارتقاء کریں۔۔۔ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی راہ دریافت کرناہی دراصل عشق مجازی کا کارنامہ ہے۔ دنیا کے لوگوں سے محبت میں مشقت کرنا، اذیتیں اٹھانا، زحمتیں برداشت کرنا، صعوبتیں جھیلنا تاکہ اپنے معشوق کی رضا حاصل کی جائے دراصل انسان میں خدا کے عشق (عشق حقیقی) کے اصول و قوانین کو واضح کر دیتا ہے کہ جب ایک بندہ سے عشق کے تقاضے ایسے ہیں تو خالق سے عشق کے تقاضے یقیناً زیادہ ہی ہوں گے۔

عامل محرکہ کو پہچانیں!

جس وقت دو مخالف جنس مثلاً ایک دفتر میں یونیورسٹی میں یا منگنی کے وقت ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں یا کہیں بھی معاشرتی رابطہ برقرار کرتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے میں الفت کا احساس کرتے ہیں، یہ احساس ان میں ہر روز زیادہ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ یہ رابطہ نزدیک ترین رابطہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر متوجہ ہوتے ہیں کہ ہم دونوں تو ایک دوسرے سے وابستہ ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ پہلا سوال جو ایسے افراد کو خود سے کرنا چاہیے وہ یہ کہ یہ پسندیدگی جو وہ ایک دوسرے کیلئے محسوس کر رہے ہیں اور جو ساتھ مرنے اور جینے تک پہنچ گئی ہے، کہاں سے شروع ہوئی تھی؟ یعنی اس حرکت کی بنیاد کیا ہے؟ اُس کی ظاہری حالت کا اثر ہے یا اُس کے اچھے اطوار ہیں یا اُس کے سماجی نظریات ہیں جس نے ہماری توجہ کو اُس کی طرف کھینچ لیا ہے یا حتیٰ ممکن ہے کہ اُس کی معاشی اور اقتصادی

حالت یا معاشرے میں اونچا مقام اس بات کا سبب بنا ہے کہ ہم اُس کی طرف جذب ہو جائیں۔ پس پہلے مرحلے میں ہم کو سچے تحقیقی انداز میں اس عامل کو مشخص کرنا چاہیے جو کہ آئندہ ہمارے رابطے اور وابستگی میں بہت کلیدی کردار ادا کرے گا۔

ایسا عشق جو بہت جلد نفرت میں تبدیل ہو جاتا ہے!

جوانوں کو انسانی رابطوں پر بہت دقت سے غور کرنا چاہیے، شاید ہم کسی فرد کو بہت زیادہ پسند کرتے ہوں اور غلطی سے عشق کے الفاظ اس رابطہ پر منطبق کر دیں، لیکن ضروری یہ ہے کہ ہم جس فرد کو چاہتے ہیں اُس کو اس قدر عزیز رکھتے ہیں کہ اگر وہ ہماری درخواست رد کر دے یا کسی دوسرے کو ہم پر ترجیح دے دے تو ہم اسی دل و جان سے عزیز شخص کیلئے آرزومند ہوتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں نہ رہے! اسی وجہ سے ہم کو عشق کا لفظ استعمال کرنے میں بہت احتیاط کرنا چاہیے۔ سیرت اور صورت کی مثال دی جاتی ہے جس کے باعث عشق و محبت پروان بھی چڑھتے ہیں اور زوال بھی پاتے ہیں۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جس کے پاس یہ تین چیزیں ہوں گی وہ پشیمان نہیں ہو گا: عجلت نہ کرنا، مشورہ کرنا اور ارادہ کرتے وقت اللہ پر بھروسہ و توکل کرنا۔ (مستدرک نہج البلاغہ: 187)

ناپائیدار ہیجان انگیز یا جلد گذر جانے والے عاشقی بادل

اکثر بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ وہ پہلی کیفیت یا احساس جو میں نے فلاں کیلئے محسوس کی تھی اُس کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔۔۔ یہ حالت ہیجانی کیفیت کو بتاتی ہے جو کہ جلدی گذر جانے

والے عشق کی عامل محرکہ ہے۔ کیونکہ تمام ہیجانات کی ایک عمر ہوتی ہے جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ناپید ہو جاتے ہیں۔ پس جھٹ منگنی پٹ بیاہ والی کیفیت ہیجانی ہوتی ہے اور اس کو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ ناپائیدار ہوتی ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جو کاموں کو وقت سے پہلے جلد بازی کی نظر کرتا ہے وہ جلد ہی اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مختلف انسانوں کی مختلف ضرورتوں کی بنیاد پر ممکن ہے ایک ہیجان کبھی ہو اور پھر گذر جائے، پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ گہرے اور عمیق احساس کو پیدا کریں جو شادی پر ختم ہو تو ہم کو اپنے احساسات کو آگے بڑھانے کیلئے ان کی جانچ (Scrutiny) کرتے رہنا چاہیے۔ اگر اس طرح ہم اپنے احساسات کو مراقبہ کی کیفیت سے گذارتے رہیں تو ہم ایک ایسی حالت کو پالیں گے جو کہ ٹھوس ہو اور حقیقی ہو تو ہماری پسند مستحکم ہو گی۔ نیک کرداری ہر ایک کی پسند کا باعث کا بنتی ہے اور ایسا شخص لوگوں کا محبوب قرار پاتا ہے۔ اِنَّ الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بجالائے۔ ان کیلئے عنقریب خدائے رحمن (لوگوں کے دلوں میں) محبت قرار دے گا۔ (سورہ مریم /96)۔

اپنی عاشقی لہروں کو کنٹرول کرنا بہت عظیم ہنرمندی اور بہادری ہے، نہ تو ہر ایک پر مرمٹیں نہ ہر ایک سے بیر کھائیں۔ بلکہ دوطرفہ جانچ کے بعد ان لہروں اور جذبات کو ڈھیل دینا شروع کریں کھرے اور کھوٹے کی پہچان تقوے کی بنیاد پر کریں کیونکہ یہی وہ صفت ہے

جس کی بنیاد پر عشق اور عاشق سرخرو ہوتے ہیں۔ باطل رابطے اِس زندگی میں بھی نقصان دہ ہیں اور آخرت میں بھی گھاٹے کی سرمایہ کاری ہے۔ ایسے ہی عشق کی مثال قرآن مجید میں اس طرح ہے: عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ۚ قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ ۖ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ۔ وہ عورت اُس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آ جا"! یوسف علیہ السلام نے کہا "خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی اور تیرا شوہر میری عزت کرنے والا اور میرا محسن ہے میں یہ کام نہیں کروں گا کیونکہ ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے"۔ (سورہ یوسف /23) نیز ایسے باطل ارادہ رکھنے والیوں کے شر سے بچنے کیلئے قرآن مجید میں ہی حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا ہے: رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ "اے میرے رب، قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتی ہیں اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔ (سورہ یوسف /33)، اس کے علاوہ مرد حضرات کو بھی ایسے باطل عشق سے منع فرمایا گیا ہے اور نصیحت کی گئی ہے: وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ ۖ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا۔ زنا کے قریب نہ پھٹکو وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔ (سورہ بنی اسرائیل /32) ایک اور آیت میں تنبیہ کی گئی ہے کہ جو بھی باطل عشق کرے گا وہ اِس دنیا میں بھی بدلہ پائے گا اور آخرت میں بھی بدلہ ملے گا۔ دیکھئے سورہ فرقان آیت 68، مزید بر آن امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو بھی اس دنیا میں

باطل جنسی تعلق قائم کرے گا تو اُس کے گھر والوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے گا۔ یہ مکافات عمل ہے۔باطل عشق کے نتیجے میں انجام پانے والا جنسی عمل جہاں فرد (مرد/عورت) کے نفسیاتی الجھاؤ اور گناہ کے احساس سے دل تنگ کرتا ہے وہیں یہ عمل سماجی رابطوں اور رشتوں کیلئے بھی مضر اور احترام و تقدس کو پامال کرنے والا ہے، نیز اس عمل کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسان شفقت والدین سے بھی عموماً محرومی کا شکار رہتے ہیں اور نفسیاتی دباؤ میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور نتیجتاً سماج میں طرح طرح کے فتنے وجود میں آتے ہیں۔

وَمَن تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ۔

جو شخص بھی پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنی ہی بھلائی کے لیے کرتا ہے اور پلٹنا سب کو اللہ ہی کی طرف ہے۔(سورہ فاطر/18)

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اس شخص کی تمنا اور آرزو پوری ہوتی ہے جو آخرت کیلئے کام کرتا ہے۔(غُرر الحکم 2:295/2)

اپنے عشق کی نگہداشت کریں تاکہ ہمیشہ زندہ رہے!

تم میری محبت ہو! پس صرف میری فکر کرو۔ ایسا بھی لوگ چاہتے ہیں مگر ایسا صحتمند انسانی رابطوں میں ممکن نہیں ہے؛ حتیٰ ایک بہترین پسندیدگی کی شادی میں بھی ایسا ممکن نہیں ہے،

ایک صحتمند رابطہ میں سب کچھ سامنے رہنا چاہیے۔ سب سے ضروری نکتہ جو خیال کرنا چاہیے وہ یہ کہ کوئی بھی یکطرفہ پسندیا رابطہ پائدار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے جب ہماری بیوی اپنے عشق اور پسندیدگی کو ہمارے لئے اظہار کرے اور اپنے عمل سے ہماری محبت کی نگہداشت کرے تو ہم کو بھی اپنی ذمہ داریوں کے ساتھ ہر معقول ذریعے سے ایسے ہی احساس کو اُس کیلئے بھی ظاہر کرنا چاہیے۔ محبت کے مراحل میں لازم ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان محبت کی نگہداشت کیلئے عمیق احساسات پائے جاتے ہوں تاکہ اس تعلق کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ ایک بہت ہی اہم نکتہ ہے اور ایسی غلطی ہے جو بہت زیادہ واقع ہوتی ہے، وہ یہ کہ بہت سے افراد اپنے شریک حیات کو کہتے ہیں: تم صرف میری ہو بس صرف مجھے پسند کرو۔ لیکن ایسے افراد کو جان لینا چاہیے کہ پسندیدگی کے احساس کی کوئی شکل ہونی چاہیے اور صرف باتیں نہیں ہوں، اگر شادی کی ابتداء میں پسندیدگی کا عملی مظاہرہ تھا اور اُس کی نگہداشت نہیں کی گئی تو یہ تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اس پسندیدگی کی تجدید ہوتے رہنا چاہیے۔ اگر شوہر صرف مطالبات ہی کرتا رہتا ہے اور بیوی صرف اپنے حقوق کی بات کرتی رہتی ہے اور طرف مقابل کے عاطفی احساسات کو نہیں ابھارتے ہیں اور اپنی پسند کا عملی مظاہرہ نہیں کرتے ہیں تو ایسا تعلق زیادہ عرصے نہیں چلتا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جو حق اور سچائی کے ساتھ اعمال انجام دیتا ہے تو خلائق کے قلوب اُس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ (غُرر الحکم ج 2: ص 204 / 991) نیز میاں اور بیوی کو متبرک عاشقی رابطے پر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ اُس نے اپنی نعمت

سے ان کو نوازا، امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جب تم کوئی نعمت نازل ہو تو اس کی خاطر مدارات شکر کے ذریعے کرو۔(شرح ابن ابی الحدید، ج20، ص327)

پہلے ضرورتوں کا احساس کریں، پھر عاشق بنیں!

سماجی رابطوں میں جیسے دفتر میں، یونیورسٹی میں اپنے ظاہری وضع قطع یا اپنی مہارتوں کی وجہ سے آپ کی توجہ کوئی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ آپ کے ذہن میں ایک خاص حالت پیدا ہوتی ہے؛ پس آپ بہت غور اور دقت کے ساتھ اُس طرف توجہ کریں، کردار اور خصلتوں پر، اُس کی مہارتوں پر، شخصیت پر وغیرہ کی بہت زیادہ جانچ پڑتال کریں اور تھوڑا تھوڑا آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جس وقت اُس شخص کے آس پاس ہوتے ہیں اُس کو بہتر سمجھ سکتے ہیں اور پہچان سکتے ہیں۔ کچھ وقت اُس کے ساتھ گذاریں گے تو پھر آپ کو معلوم ہو گا کہ آپ کو واقعی یہ شخص پسند ہے یا نہیں۔ اس کے بعد کا مرحلہ مائل ہونے کا ہے اور اس کے بعد وابستگی کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے یعنی ملنا جلنا، اس سے ایک خاص سماجی احساس جنم لیتا ہے جو ایک خاص وقت پر اپنے محبوب کو دیکھ لینے کی تمنا کرتا ہے اور اُس سے بات کرنے کو پسند کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ وقت ساتھ گذاریں اگر ایسا نہ ہو تو پھر دل تنگ ہوتا ہے اور دوری پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: تمھارے اندر دلچسپی لینے والے سے تمھاری دوری قسمت کی خرابی ہے اور تم سے دوری اختیار کرنے والے سے تمہاری دلچسپی ذلت نفس ہے۔(نہج البلاغہ: حکمت 451) زیادہ روی کسی بھی کام میں بری ہے اور

شیطان انسان کو سبز باغ دکھا کر گمراہ کرتا ہے۔ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ۔ اور انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور میں انہیں مختلف آرزوؤں میں الجھاؤں گا (انہیں سبز باغ دکھاؤں گا)۔ (سورہ نساء /119) وابستگی کے بعد دل بستگی پیدا ہوتی ہے یعنی صرف فرد کا موجود ہونا کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کیلئے خاص جذبہ اور احساس بھی پیدا ہوتا ہے اگر دلبستگی کا مرحلہ آگے بڑھا اور مختلف مواقع پر دہرایا گیا تو ایک دوسرے سے اظہار محبت کا موقع ملتا ہے پس یہ مرحلہ دو مخالف جنسوں کی شادی پر ختم ہوتا ہے۔ جس وقت ایک شخص طرف مقابل کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر کام اُس کیلے انجام دے تاکہ اُس کو خوش کر سکے، وہ آرام سے رہے اور اُس کی خوشی کو اپنی خوشی قرار دے چاہے جیسی بھی خوشی ہو جس میں اُس کی زندگی ہو اُس کا کمال ہو، تو ایسے رابطے کو ہم عشق کا نام دے سکتے ہیں۔

قرآن کے ظاہری تضادات کو کیسے سمجھیں؟

چونکہ قرآن مجید یکمشت نازل نہیں ہوا بلکہ پیش آنے والے مسائل کے مقابلے پر اس کی مناسبت سے الٰہی وحی نازل ہوئیں اور چونکہ انسانی زندگی بھی مختلف مراحل اور ادوار پر مشتمل ہوتی ہے جس میں کچھ امور بچپن میں مضر اور بلوغت ضروری ہوتے ہیں نیز مختلف شعبہ جاتِ زندگی کے اپنے اپنے طریقے اور ضروریات ہوتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن میں تضاد نظر آتا ہے جس کا سبب یہی مختلف زمانوں اور مختلف جگہوں کی صورتحال ہے۔ جس طرح انسان مختلف مواقعوں کا سامنا کرتا ہے، جیسے کہ کسی کے والدین نیک ہوتے ہیں کسی کے برے، کوئی کاہل صفت ہوتا ہے کوئی پھرتیلا و متحرک۔۔۔ کوئی امیر ہوتا ہے کوئی غریب انہی سماجی تنوعات کے باعث ہر ایک اور ہر موقع کی مناسبت سے حکم دیا گیا ہے۔ البتہ انسان جن مواقعوں اور امور پر مشترک ہے وہاں مشترک حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کو جب ہم تاریخی تنزیلی طور پر سمجھنے کیلئے کرونولوجیکل میں پڑھتے ہیں تو آیات کی ترتیب سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایک طرح سے قرآنی سوروں کی نزولی ترتیب، پیغمبر اکرم ص کی سیرت اور ان کی سوانح بھی ہے۔ توقیفی ترتیب میں تضاد مثال کے طور پر ایک طرف قرآن والدین سے "اف" تک کہنے کو شدید برا سمجھتا ہے دوسری طرف والدین اور خونی اقرباء سے بھی بیزاری اختیار کرنے کو کہتا ہے۔ ایک طرف کفار کو جہاں پاؤ قتل کرنے کا کہتا ہے دوسری

طرف امن پسند کفار کو جو حالت حرب میں نہ ہوں ان سے سروکار نہ رکھنے کا بھی حکم ہے، ایک طرف تسلط طلبی کی مخالفت ہے اور ایک طرف قانون کا جبری نفاذ بھی ہے۔ فرق اسی بنیاد پر ہے کہ زمان و جگہ و شخصی و فردی کیفیت کا فرق ہے۔ حالات کے تقاضے مختلف ہیں، البتہ مشترک چیز جو تمام آیات میں نظر آتی ہے وہ توحید، نبوت، امامت، عدالت اور قیامت کے بارے میں منطقی طور پر استدلال کے ساتھ قبول کروانے کی ہے، نیز اسلامی حکومت اور اسلامی سماج کے بنیادی اصول کیا ہیں وہ بتائے گئے ہیں۔ قبل از قیام حکومت اسلامی اور بعد از قیام حکومت اسلامی کے انداز الگ الگ ہیں، نیز ابتدائی مسلمان اور قدیم الایمان وغیرہ کی نفسیاتی کیفیت کے حساب سے سے ان سے معاملہ کرنے کے الگ الگ حکم ہیں، ایک نوبالغ کی نفسیاتی کیفیت اور ایک بزرگ کی نفسیاتی کیفیت میں بہت فرق ہوتا ہے جس کا سبب ان کے تجربات، مشاہدات وغیرہ ہوتے ہیں نیز سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا ہے، اسی وجہ سے قران جو کہ ہر انسان کو مخاطب کرتا ہے تو لازم ہے کہ ایسی کلّی بات کی جائے جس میں سے سب اپنے لئے ذمہ داری وضع کر سکیں اور آیات میں جہاں جزئیات پر گفتگو ہوئی ہے یا تاریخی حوالے دیئے گئے یا دیگر خصوصی امور میں کوئی حکم دیا گیا ہے یا کسی مخصوص واقعہ کو ذکر کیا گیا ہے تو انسان پر ضروری ہے کہ اس میں سے "کلّی" حکم و قانون فطرت الٰہی کو استخراج کرے اور اس قانون کی روشنی میں اپنے لئے پوری زندگی یا زندگی کے کسی بھی خاص مورد میں لائحہ عمل تعین کرے۔ یہ اعمال عقل و فطرت سے بھی مطابقت رکھتے ہیں۔ یہی اصول و قاعدے ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث سمجھنے کیلئے بھی ہیں۔

قرآن کی فہم اور اس میں موجود ہم آہنگی نیز اس کی ہدایات و نصائح صرف عقل مندوں، دانشمندوں اور صاحبان بصیرت کیلئے ہیں، یعنی وہ جو انسانی زندگی کے شعبہ جات، انسانی زندگی کے مراحل اور انسانی نفسیات وغیرہ سے آگاہ ہیں۔ لہذا غیر سنجیدہ افراد کے ذہنوں میں قرآن اور اسلام کی احکام، نصیحتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ قرآن کریم ایسے افراد کے بارے میں فرماتا ہے:

1۔ یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے. یہ صاحبانِ تقویٰ اور پرہیز گاری (دانشوروں اور صاحبان بصیرت) لوگوں کے لئے مجسم ہدایت ہے۔ (2:1)

2۔ یہ لوگ جنھوں نے خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے سے انکار کر دیا ہے اِن کی حالت بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، کیونکہ یہ عقل سے کچھ کام ہی نہیں لیتے۔ (2:171)

3۔ خدا تمہارے لئے اپنے آیات واحکام واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔ (2:242)

4۔ جسے وہ چاہتا ہے حکمت و دانائی عطا فرماتا ہے اور جسے (منجانب اللہ) حکمت عطا ہوئی، بے شک اسے درحقیقت خیر کثیر (بڑی دولت) مل گئی۔ عقلمندوں کے سوا کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔ (2:269)

5۔ وہی خدا ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے اِس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات (استعارے اور کنایہ) جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اُن کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یا پھر وہ جو لوگ علم میں پختہ کار، عقل مند اور بابصیرت ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "ہمارا اُن پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں" اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔(3:7)

6۔ کوئی بھی متنفس ایسا نہیں ہے جو اللہ کے اذن کے بغیر ایمان لے آئے اور اللہ ان لوگوں پر (کفر و شرک) کی نجاست ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے۔(10:100)

7۔ ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے کہ شاید تم لوگوں کو عقل آجائے۔(12:2)

8۔ اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق ہے اور ہر چیز کی تفصیل اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت۔(12:111)

9۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے رب کی اِس کتاب کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے حق جانتا ہے، اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں؟ نصیحت تو دانش مند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں ۔(13:19)

یہ چند آیات کریمہ پیش کی گئیں ہیں جبکہ قرآن مجید میں سینکڑوں آیات ایسی ہیں جس میں عقلمندوں اور دانشمندوں کی تعریف یہی بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کی نشانیوں اور آیات پر ایمان لاتے ہیں، خواہ وہ آیات قرآنی ہوں یا عالم فطرت (سماجی زندگی، انفرادی زندگی، انسانی ظاہر و باطن وغیرہ) میں موجود ہم آہنگی و نظم و ضبط ہو۔ غرض ان تمام انفس و آفاق کی نشانیاں ایسی ہیں جو ہر صاحبِ بصیرت و دانش کو خدا، اسلام، قرآن، پیغمبروں اور اہلبیت کی طرف راغب کرتی ہیں۔

ولی اللہ

جس قدر انسان کے علم و تجربے میں کمی آنی شروع ہوتی ہے, شعوری کیفیت تمام ہوناشروع ہوتی ہے اُتناہی وہ بے جاتقدس میں مبتلاہو تاجاتاہے۔ جب کہ بیدار تقدس!، قلب کے اندر ایسی روح کی بیداری کی کیفیت ہے جس کے تعلقات ملاء اعلیٰ سے پیوست ہوتے ہیں مگر وہ اس ملاء اعلیٰ کے احترام کے بدلے میں ملاء اعلیٰ کے فیوضات وبرکات کے حصول کے بعد اُن معنوی، روحانی اور فکری و عملی، نعمتوں کو امانت سمجھتاہے، اِس کو تقسیم کرکے ہی وہ اپنے ظرف کو نئی نعمتوں کیلئے تیار کرتاہے۔ ان سب نعمتوں سے خدا کی خدمت کرکے اُس کے تقدس کے اُس مزاج کو بیدار کرنامقصود ہے جس میں منہ بند اور بس خُدا کی خدمت جاری رہے، اس سے یہ سامنے آیاکہ اگر انسان خود اپنے آپ کو جواب دیتے وقت اس بات پر یقین رکھتاہے کہ کیاوہ اپنے اندر اعلیٰ روح رکھنے والا تخلیقی انداز اپنائے ہوئے ہے ؟! تو یہی اس کے اطمینان کیلئے کافی ہے کیوں کہ ملائے اعلیٰ کو اعلا کہاہی اسی لئے جاتاہے کہ وہ خلق کرتاہے!

ماحول کائنات میں نت نئی ایجادات ہیں اُس کی ان ایجادات کو وہ مزید اپنی سطح کی ایجادات کرکے اُسی خلاقیت کی عملی تصویر پیش کررہاہوتاہے۔ ایسی خلقت جو اِس سے بھی زیادہ سطحی

انسانوں کیلیئے سب سے بڑے خالقِ کی تخلیق کار کی تصویر پیش کر دیں، اگر آدمی ایسا نہیں کرتا تو خلقت کا نظام اور زمانے کی گردش اُسے خاک کے ذرے بنا دیتی ہے۔ اس دنیا میں ہی وہ رہے گا جو زمانے کے چکر کے ساتھ زمانے کے خالق کی پہچان رکھتا ہو گا!

سطحی خلاقیت کے مالک! یعنی انسان!، اس طرح نہ سوچے کہ وہ بس اتنا ہی جمع کر سکتا ہے! نہیں! بلکہ وہ خود کو اعلیٰ ظرف کا حامل بنائے!

اور زیادہ تخلیق کرے اور زیادہ جمع کرے!

مگر یہ ذہن میں رکھے کہ اس ظرف کو جس میں ہمارا مال و دولت اور انواع و اقسام کی نعمتیں ہیں اس کے کچھ حدود بھی ہیں خواہ معنوی ہی سہی، مگر اُس کو تقسیم کرنا ہے۔۔۔ یہ اس کی قیمت ہے ۔۔!

فکری رزق بھی امانت ہے اور اس کا دوسروں کو تعلیم دینا اس کو یادداشت اور تجربے کے ارکائیو میں محفوظ کرتا ہے،یہی ارکائیو جتنا قوی ہو گا اور اس کے کارندے جتنے چابک دست رہیں گے اور اطلاعات کے تسلسل میں کمی نہیں ہو گی اور اطلاعات خواہ خواب اور خواہ کسی خاص کیفیت میں ہی کیوں نہ ذہن میں وارد ہوں۔

منکر و نکیر قبر میں بھی اُسے ایک اگلی حَسین دنیا میں لیجانے آئیں گے وہ اُس سے اگلی دنیا میں جانے کیلیئے ویزا انٹرویو کریں گے جو اُن کے سوالات کے مثبت جواب دے سکے گا وہ اگلے مرحلے کی حَسین وادیوں میں سیر کرے گا۔

نعمتوں کا نا اہلوں کو دینا نعمتوں کا ضیاع ہے، نا اہل یعنی سسٹم کو نہ سمجھتے ہوئے اپنی خواہشات نفسانی میں مبتلا ہو کر نعمتوں کا غیر ضروری استعمال کرنے والا۔

انسان شاید سب ہی کہیں نہ کہیں نا اہل ہیں مگر جو کم نا اہل ہے وہ ہی خلیفۃ اللہ، ولی اللہ اور صبغتہ اللہ ہے وہ ایسا ہی ہوتا جس کی اپنی زندگی ہوتی ہے، اور اُس زندگی میں سب انسان اُس کے رشتے دار ہیں۔

سب آدمی کچھ لوگوں کو جانتے ہیں اور زیادہ تر کو نہیں جانتے،

مگر نقصان اور سب سے بڑا نقصان یہ ہی ہے کہ اس کلمۃ اللہ کو نہیں جانتے ہوں! اُس کے نمائندوں کو نہیں جانتے ہوں،

ہر وہ آدمی جو کلمتہ اللہ کو پہچانتے ہیں اور خدمت کی اعلیٰ مثالیں دیتے ہوئے اس راہ میں قربانیاں دیتے ہیں۔۔۔!!

اُس کے ولی ہیں!!

ولایت ایسی ہی ہستیوں کی اہل ہے!

جو نظام وخلقت کو اُس کی فطری گردش میں مدد و طاقت و انرجی فراہم کر رہے ہیں۔ اور جو تقدس اور احترام کی آڑ میں چاپلوسانہ نفسیات کے حامل ہوں یا سسٹم کی رفتار سے آگے نکل جانے والے بھی سسٹم کی رفتار پر آتے ہیں۔۔۔!! ابتدائی طور پر انسان نئے سسٹم سے الجھتا

ہے، پریشان ہوتا ہے، مضطرب ہوتا ہے یہاں صبر اور برداشت کرنا اور زندگی کے سسٹم کے رازوں کو خود پر اُور اس کے اہل افراد پر منکشف کرنا اور اُس کے مطابق عمل، اس دنیا کو خوبصورت اور دلربا بنادیتی ہے کہ آدمی کو پھر ایمانی حلاوت محسوس ہوتی ہے۔ یہی وہ عارف وولی ہیں جو صرف یہ نہیں جانتے کہ حقیقت کیا ہے۔

بلکہ وہ موجود حقائق کی بنا پر اپنی زندگیوں میں ایسے فیصلے کرتے ہیں اور ایسے سماجی تجربات سے گذرتے ہیں جو انہیں ایک عملی عرفان عطا کرتی ہے۔

یہ عملی عرفان ہر اُس آدمی کے پاس ہے جو غور وفکر وتوجہ کرتا ہے۔

جو اپنے تخلیقی مزاج کو مرنے نہیں دیتا۔

خون کے آخری قطرے، سانس کی آخری ڈور ٹوٹنے تک خدمت و خلاقیت کا جذبہ اپنے تجربوں کو بڑھاتے ہوئے تسکین دیتا ہے۔

خالق سب کی خلاقیت میں مزید توفیقات عطا فرمائے!

دُنیااور امتحانات

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ: "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے"۔ انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں (سورہ بقرہ 157،156،155)

یہ دنیا کھیت ہے جس میں ہم اپنے لئے جہنم یا جنت بوتے ہیں۔ ہم اپنے اعمال ہی سے جو چاہیں بنالیں، ہر کام اور ہر عمل کی انتہا کے کچھ اوقات ہوتے ہیں جس پر پہنچ کر عمل یا کام کا نتیجہ ملتا ہے کچھ اعمال کا نتیجہ اس دنیا میں ہے اور کچھ کا اس دنیا کے بعد یعنی اس دنیاوی زندگی کے بدلے جیسی ابدی زندگی ہم چاہے بنالیں۔ یہ دنیا دار الاعمال ہے، اور وہ دنیا دار الاجر۔ اس دنیا میں چونکہ ہمیں اعمال ہی انجام دینے ہیں، اجر وہاں پانے کے لیے، یہاں کھیتوں میں ہل چلا کر بیج بونے ہیں، آخرت میں فصل کاٹنے کے واسطے، وغیرہ وغیرہ۔

امتحان انسان کو پرکھنے کے لیے ہیں جب تک ہماری روح ہمارے جسم میں قید ہے اس وقت تک ہم خود کو اور اپنے اعمال کو ان امتحانوں سے پرکھ سکتے ہیں ناپ سکتے ہیں۔ ہم جب صحت مند ہوں تو ہمیں اپنے جسم کی صحت کے تقاضوں کو پورا کرنالازمی ہے اگر میں صحت کے تقاضوں کو پورا نہیں کروں گاتو بیمار ہو جاؤں گا۔ آزمائش اور امتحان بظاہر سزا جیسے لگ رہے ہوتے ہیں مگر یہ انسان کو مزید تکامل دینے کیلئے، حوصلہ اور ہمت میں اضافہ کیلئے ہوتے ہیں تاکہ اگلے مراحل کی سختیاں جھیل جانے کے قابل ہو جائیں۔ کچھ امتحان انسان لیتے ہیں مثلا کسی نوکری یا ملازمت کیلئے امتحان ہوتا ہے، اسکول یا یونیورسٹی میں داخلہ کیلئے امتحان ہوتا ہے،وغیرہ وغیرہ

اس زندگی کا ہر لمحہ، ہر لحظہ، ہر دقیقہ، ہر سیکنڈ اور ہماری ہر سانس امتحان ہے، بلکہ ہماری ہر ہر حالت بھی امتحان ہے، صحت اور بیماری دونوں امتحان ہیں، دولت اور غربت امتحان ہیں، جوانی اور بڑھاپا، طاقت اور کمزوری، فرصت اور مصروفیت غرض اس دنیا کی زندگی سوائے امتحان کے اور کچھ بھی نہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے اور وہ حاضر و ناظر سمیع و بصیر بھی دیکھ رہا ہے کہ ہم کب کیا کرتے ہیں۔ ہم وہی عمل انجام دیتے ہیں جس سے ہم کو عشق ہوتا ہے اور اس عشق کے پیچھے وہ معرفت ہوتی ہے جس نے ہمیں اس کام سے عشق و انسیت اور پھر اس کو انجام دینے پر ابھارا ہوتا ہے۔

ہمارا دین ایک مکمل ضابطہ ءحیات اسی لیے کہلاتا ہے کہ اس میں ہر صورتِ حال کے آداب اور تہذیب سکھا دیئے گئے ہیں، کہ کب، کیا اور کیسے کرنا ہے۔ اور اس کے فوائد و نقصانات بھی سمجھا دیئے گئے ہیں۔

اس دنیا کی زندگی کے یہ امتحان اور آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے، یہ اس کا انعام اور کرم ہے کہ ہمیں موت سے پہلے خود اپنی تصحیح کرنے کے مواقع فراہم فرماتا ہے۔ اس دنیا کی سماجی زندگی تکامل کیلیئے چند بنیادی شعبوں پر منحصر ہے جیسے کہ علم و معرفت، ثقافت و تہذیب، معاشرت، معاشیات و سیاسیات۔ ہر انسان ان شعبوں سے شعوری یا لاشعوری طور پر وابستہ ہے۔ دین انسان کو ان شعبہ جات میں اخلاق حسنہ اپنانے کی تاکید کرتا ہے یعنی زندگی کو احسن انداز میں گذارنے کی تربیت دیتا ہے۔

جس طرح ماں کے پیٹ سے خاص مدت تک انسان تربیتی مراحل سے گذرتا ہے تاکہ وہ اس دنیا میں آنے کیلیئے آمادہ و تیار ہو اسی طرح اس دنیا سے اگلی دنیا میں جانے کیلیئے بھی خالق نے کچھ تربیتی مراحل مقرر کیے ہیں تاکہ انسان اس دنیا سے کامل دُنیا میں جانے کیلیئے آمادہ و تیار ہو جائے جس کے واسطے اُس کی آزمائشیں اور امتحانات مقرر کیے اور آخر میں جنت یا جہنم جیسے نتائج کا حصول انسان کا مقدر بنا دیا۔ مومن انسان کا مطمعِ نظر زیارت حضرت حجت (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے ساتھ آخرت کا حصول ہونا چاہیے۔اس سفر میں جو کہ کسی کیلیئے طولانی ہو سکتا ہے اور کسی کیلیئے قلیل، آزمائشیں اور امتحانات اُس کے خلوص کی دلیل بن کر اُس کا اگلے جہان میں درجہ اور مقام تعین کرتے ہیں۔

خداوند تعالیٰ انسان کو کبھی معاشی امتحانات میں مبتلا کرتا ہے کبھی، روحانی و معنوی، کبھی دوسرے انسانوں کے ذریعے انسان کی آزمائش کی جاتی ہے کبھی عیال کی کثرت یا قلت سے۔ وغیرہ

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمہارے سامنے تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہل ایمان) کی سی صورتیں (اور شکلیں) آئی ہی نہیں۔ جنہیں فقر و فاقہ اور سختیوں نے گھیر لیا تھا۔ اور انہیں (تکلیف و مصائب کے) اس قدر جھٹکے دیئے گئے کہ خود رسول اور ان پر ایمان لانے والے کہہ اٹھے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد یقیناً نزدیک ہی ہے۔ (سورہ بقرہ /214)

کبھی انسان کا سننا اور دیکھنا، محسوس کرنا اور بولنا آزمائش ہوتا ہے۔

ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اِس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔ (سورہ انسان /2)

یہ آزمائش دنیاوی لذتوں میں بھی ہے غمگینی میں بھی۔

اور نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو دُنیوی زندگی کی اُس شان و شوکت کو جو ہم نے اِن میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے، اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے۔ (سورہ طٰہٰ /131)

کبھی ظالم حکمرانوں کی صورت میں اس آزمائش اور امتحان کا وقت ہوتا ہے۔

یاد کرو وہ وقت، جب ہم نے تم کو فرعونیوں کی غلامی سے نجات بخشی اُنہوں نے تمہیں سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا، تمہارے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس حالت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ (سورہ بقرہ /49)

کبھی ذلتوں اور پستیوں کے ذریعے آزمائش کی جاتی ہے کہ خالق دیکھے کہ کون ہے جو محنت و جستجو اور بلند ہمتی سے کام لیتا ہے۔

(اے مسلمانو!) کیا تم کو یہ خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ نے (جانچ کر) معلوم ہی نہیں کیا کہ تم میں واقعی مجاہد کون ہیں؟ اور نہ ابھی یہ معلوم کیا ہے کہ صابر اور ثابت قدم کون ہیں؟ (سورہ آل عمران /142)

ایک اور آیت ہے:

اور ہم یقیناً تم سب کا امتحان لیں گے تاکہ یہ دیکھیں کہ تم میں جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون لوگ ہیں اور اس طرح تمہارے حالات کو باقاعدہ جانچ لیں۔ (سورہ محمد /31)

رشتہ داروں گھر والوں، دوستوں وغیرہ کی طرف سے اذیتوں کا امتحان بڑا کڑا مرحلہ ہوتا ہے مگر اس معنوی اور پر برکت سفر کیلئے اس میں سرخرو ہونا بھی ضروری ہے۔

یقیناتم اپنے اموال اور نفوس کے ذریعہ آزمائے جاؤگے اور جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور جو مشرک ہوگئے ہیں سب کی طرف سے بہت اذیت ناک باتیں سنوگے - اب اگر تم صبر کروگے اور تقوٰی اختیار کروگے تو یہی امور میں استحکام کا سبب ہے۔(سورہ آل عمران /186)

دوستیوں اور رفاقتوں کی آزمائش بھی اس سفر میں ضروری ہے۔

کیاتم لوگوں نے یہ سمجھ رکھاہے کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤگے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اس کی راہ میں) جاں فشانی کی اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔(سورہ توبہ /16)

اس سفر میں با فضیلت افراد اور متمکن افراد کے حسد سے بچنا بھی ضروری ہے یہ بھی ایک آزمائش ہے۔

وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اسی میں تمہاری آزمائش کرے بے شک تمہارارب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔(سورہ انعام /165)

سیاسی فتنوں اور آزمائش کے دور کے حوالے سے امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"فتنہ اور آزمائش کے دور میں اونٹ کے دو سالہ بچے کی طرح رہو کہ نہ اس کی اتنی مضبوط پیٹھ ہوتی ہے کہ اس پر سواری کی جا سکے اور نہ اس کے ایسا تھن ہوتا ہے جس سے دودھ دوہا جا سکے۔"

نیز اسی سیاسی آزمائشوں کے دور کی مناسبت سے ایک اور حدیث ہے۔

آخری زمانے کے حوالے سے بات ہو رہی تھی تو امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا: "اس دور میں بہترین آدمی اس زمانے میں وہ مومن ہو گا جو "النومتہ" ہو گا۔" آپ سے پوچھا گیا: امیر المومنین النومتہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا "وہ شخص جو لوگوں کو تو پہچانے مگر لوگ اسے نہ پہچانیں۔"

اسلامی دستورات میں خدا کی طرف سے آنے والی آزمائشوں میں صبر اور حلم کی تاکید کی گئی ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: صبر مصیبت ہی کی مقدار میں نازل ہوتا ہے اور مصیبت کے وقت جس نے زانو پر ہاتھ مارا اس کا عمل برباد ہو جاتا ہے۔(یعنی اجر ختم ہو جاتا ہے) ناموافق زمانہ جہاں آزمائش ہے وہاں موافق زمانہ بھی آزمائش ہے۔ حدیث میں ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: زمانہ دو دنوں کا ہے ایک دن تمہارے موافق اور ایک دن تمھارے مخالف لہذا جب یہ تم سے سازگار رہے تو اکڑو مت اور جب یہ تمھارے لئے ناسازگار رہے تو صبر کرو۔

ایک جگہ اور فرماتے ہیں: "تمہارے لئے صبر لازم ہے کیونکہ صبر کو ایمان کے ساتھ وہی نسبت ہے جو سر کو جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور ایسا جسم بے کار ہے جس میں سر نہ ہو، اسی طرح اس ایمان کا بھی کوئی فائدہ نہیں جس کے ساتھ صبر نہ ہو۔" ایک جگہ اور فرماتے ہیں: "شہوت پر صبر عفت اور پاکیزگی ہے، غصہ میں صبر، کامیابی ہے اور مصیبت میں صبر تقویٰ ہے۔"

ایک دفعہ امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا: آزمائش اور مصیبت میں کیا فرق ہے، آپ نے فرمایا: آزمائش کی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور مصیبت انسان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ پوچھا گیا: اس میں فرق کیسے کریں؟ فرمایا: اگر کڑے وقت میں تم خدا کی یاد میں مشغول ہوتے ہو تو سمجھو آزمائش ہے اور اگر بے صبری دکھاتے ہو اور واویلا کرتے ہو اور خدا کو بھول جاتے ہو تو سمجھو مصیبت ہے۔

ہمارا رویہ آزمائشوں اور مشکلات کیلئے ہمیشہ فراخ دلانہ اور خوش آمدید والا ہونا چاہیے، مشکلات اپنے وقت پر جا کر خود بخود آسانی میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اس دوران ہم کو دعا و توسل میں مشغول رہنا چاہیے نیز یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہمارے کسی کام یا عمل سے ناواقفیت کی وجہ سے مشکلات آتی ہیں جتنا زیادہ ہمارا عملی تجربہ بڑھتا جائے گا، مشکلات آسانی میں تبدیل ہوتی جائیں گی۔

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی

طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ (سورہ بقرہ /286)

تقویٰ و پرہیز گاری !! حاکم کی بنیادی صفت

دنیا کی ہر نعمت اور سختی تقوے اور پرہیز گاری کے ساتھ خوبصورت زندگی کا مظہر ہوتی ہے۔ جاہل وہی ہوتا ہے جس کے پاس معلومات کا خزانہ ہو، عظیم حکومت ہو، یا اربوں کا خزانہ ہو۔ اگر تقوا اور پرہیز گاری نہیں تو نہ معلومات حکمت بنتی ہیں، نا حکومت میں عدالت رہتی ہے نہ ہی خزانہ تا قیامت رہتا ہے۔ تقوا اور پرہیز گاری سے ہی حکمت اور اعتدال پیدا ہوتا ہے، حکومت میں صداقت، دیانت اور امانت آتی ہے، اور خزانہ میں عطاو بخشش کے ذریعے دوام پیدا ہوتا ہے۔

حکومتیں تو طاقت کے ساتھ ہی چلتی ہیں۔ حکومت حکمت سے جڑی ہے۔ جب معاشرے میں ہرج و مرج کا خدشہ ہو تو اکثریت کی فلاح کی خاطر اقلیت پر طاقت نافذ کی جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ حکومتی انتظامیہ کی پالیسیز مجموعی طور پر معاشرے میں فلاح و خیر کی ضامن ہیں یا مجموعی طور پر فساد کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ حکومت فوجی ہو یا سول، مذہبی ہو یا فلسفی افراد کی وغیرہ حکومت اور حکمرانوں کی اہلیت کا معیار معاشرے میں فساد کی روک تھام اور انسانی فطرت کے مطابق مجموعی طور پر مسرت و شادمانی اور اطمینان کے اسباب کی فراہمی سے ہے۔

زرعی دور کے بعد جب عالمی انسانی گروہوں نے معاشرتی نظم و ضبط کی خاطر ایک مرکزی انتظامیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس انتظامیہ کے اراکین کی اہلیت یہی ہونی چاہیے کہ وہ انسان کے فردی اور معاشرتی مسائل کو جانتے ہوں، انسانی جبلتوں اور فطرت سے آگاہ ہوں نیز ان جبلتوں اور فطری ضروریات کیلئے معاشرے میں طویل المدتی فلاح کے قیام کی خاطر ایسی قوانین کا اطلاق کریں جو معاشرے کی سعادت اور اطمینان کی ضامن ہوں۔۔۔۔ البتہ اس کے ساتھ خود معاشرے کے افراد کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی فطری اور جبلی ضرورتوں کو پہچانتے ہوں اور ان کی تکمیل کیلئے کوئی نظریہ رکھتے ہوں۔ یہ نظریہ ہوس و شہوت پرستی، لالچ، دھوکہ و فریب، غرور، وغیرہ سے ہٹ کر دیانتداری کے ساتھ اپنے اور اپنے ہم جنسوں کی ان فطری و جبلی ضروریات کی تکمیل سے وابستہ ہو۔ ان افراد کو اپنی فردی نفسیات کے ساتھ معاشرتی نفسیات سے آگاہی بھی ضروری ہے اور مادّی اجسام کی مادّی ضروریات سے آگاہی بھی ضروری ہے۔ نیز ترقی و سعادت کی راہوں، مصادر کا بھی علم ہو۔

مجموعی طور پر جب معاشرے کے افراد اس علم و دانش اور شعور سے بہرہ ور ہو جائیں تو پھر حقیقی جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ اس علمی و فکری مرحلے کو عبور کیے بنا اکثریت کی رائے اندھوں کی رائے کہلاتی ہے۔ صرف سفلی خواہشات کی بنیاد پر کسی کی حمایت یا انکار معاشرے کی تباہی سے وابستہ ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ حکومت کیلئے جب حکمرانوں کا چناؤ کیا جائے تو دانش و اعلیٰ انسانی اقدار کی بنیاد پر کیا جائے جو اسی وقت ممکن ہے جب معاشرے کی مجموعی آبادی دانش و علم دوست ہو، حکمت پرور ہو رذالتوں اور پستیوں

سے اوپر اٹھ کر سوچتی ہو۔ ایسا معاشرہ جب جمہوری انداز اپنائے گا تو معاشرے میں فلاح و خیر، عدل و عدالت کا راج ہوتا ہے۔ ایسے معاشرے کے مجموعی اہداف بلند عزائم سے مربوط ہوتے ہیں اور صرف کھانے پینے اور دیگر مادّی فلاح کی بنیاد پر نہیں ہوتے۔ البتہ مادّی فلاح حکیمانہ اور دانش مند زندگی کیلئے بہت بنیادی وسیلہ ہے مگر وسیلہ کو ہدف بنانا ناکامی سے دوچار کرتا ہے اور یہ حرکت غیر فطری قوانین پر عمل کرنے کے باعث نہ صرف فرد بلکہ معاشرے کو بھی نابود کر دیتی ہے۔

تاریخی تجربوں سے عیاں ہے کہ خاص مذہبی افراد میں ہی یہ فطری صلاحیت ہے کہ وہ معاشرے کو منظم کرسکتے ہیں اور مادّی ضرورتوں میں عدل و انصاف کے ساتھ روحانی ضروریات کو بھی پورا کرسکتے ہیں۔ جب بھی مذہبی پیشوائی دیانت داری، صداقت اور امانت داری کے ساتھ عمل میں آئی معاشرے فلاح و اطمینان اور عشق و دانش کے گلستان بن گئے۔ انسانی فطرت نعمتوں کی فراوانی میں باغی ہوجاتی ہے۔ اور یہ بغاوت صرف اس صورت میں کنٹرول میں رہتی ہے جب انسان خود کو خالق کائنات کے آگے جوابدہ ہونے پر یقین رکھتا ہے اور صرف زبانی دعوؤں اور دماغی یقین نہیں بلکہ اس کا مظاہرہ عملی میدان میں بھی کرتا ہے۔ رذالتوں بھرے عمل انجام دینے سے خوف خدا ہی روکتا ہے۔ تقوا اور پرہیز گاری، زاہد فی الدنیا فرد کے پاس دنیا کا سارا سونا جواہرات بھی دے دئے جائیں تو وہ عبد کی منزل سے گرتا نہیں۔ البتہ یہ توفیق الٰہی خدا کی دین ہوتی ہے اور اس منصب پر قائم

رہنے کیلئے ضروری ہے کہ ایسی پیغمبرانہ صلاحیتوں کے افراد اس کی برقراری کیلئے دعاو توسل نیز عقلی و نفسانی ریاضتوں کو اپنا ہر وقت کا لائحہ عمل بنالیں۔

جب انسان خود کو طاقت ور سمجھ بیٹھتا ہے اور اپنے سے زیادہ طاقت ور خالق کو فراموش کردے اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں ظلم و جبر، شہوت رانیاں اور فساد پروری شروع ہو جائے تو معاشرے تنزلی کی راہ پر قدم رکھ دیتے ہیں۔ یہ اصول فردی زندگی کیلئے جتنا کار آمد ہے اتنا ہی حکومتی سطح پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

خود احتسابی کے نتیجے میں عمل کو علم کی روشنی میں سعادت مندی کی جانب رکھنا اور صراط مستقیم سے انحراف نہ کرنا اور اس میں ہر وقت مشغولیت ہی کامیابی اور فلاح کی کنجی ہے۔

عزاداری کا مقصد و ہدف!

انسانی نفسیات پر ہر قسم کی شکلوں، رنگوں اور انداز و کیفیات کے اثرات پڑتے ہیں، انسان بچپن سے ہی ان اثرات کو قبول کرتا چلا جارہا ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اُس کے مستقبل کے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ انسان کی نفسیات پر نماز کا اپنا ایک اثر ہے، کھانے پینے کا ایک الگ اثر ہے، یہ نفسیاتی اثرات ہی کی بنیاد پر ہم یہ طے کرتے ہیں کہ یہ عمل برا ہے یا اچھا!

عزاداری سید الشہداعلیہ الصلواۃ والسلام یا دیگر شہدائے اسلام کی عزاداری منانے کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ اُن شہدا کی سیرت پر چلتے ہوئے جدید اور آئندہ کیلئے بھی یزیدی طاقتوں کو للکارنے کا جذبہ اور حرارت بیدار کی جائے اور ایسے افراد تیار ہوتے رہیں جس سے یزیدِ وقت کو لرزہ براندام رکھا جاسکے۔ عزاداری مستقیما ممکن ہے شرعی عنوان نہ رکھتی ہو مگر شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور احکام الٰہی کیلئے عاقل، متقی، پرہیز گار پاسبان اور مجاہدین تیار کرنے والی فیکٹری ہے۔ جس میں ہر سال خام افراد شمولیت اختیار کرکے خود کو اسلامی و شرعی جذبہ و معارف حسینی علیہ السلام سے سرشار کرتے ہیں تاکہ کوئی خمینی (قدس سرہ الشریف)، کوئی عارف حسینی، کوئی ساجد نقوی، کوئی خامنہ ای تیار ہو کوئی محمد علی نقوی ہو کوئی حسن ترابی ہو کئی سرفراز نعیمی کوئی شکیل اوج، کوئی حسن البناء کوئی میلکم ایکس کوئی سید قطب وغیرہ اور شریعت کو پابند سلاسل کرنے والے یزیدی سرمایہ

دار،سیاست دان اس بات کو بخوبی جان لیں کہ یہ عزاداری اُن کیلیے ایٹم یاہائیڈروجن بم سے کم نہیں ہے، جو جلد یا بدیر اُن کی حرام مال سے پُر تجوریوں اور شہوترانیوں اور نفسانی خواہشات سے پُر ایوانوں کو برباد کر دے گی۔ یہ عزاداری ہے جو شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر سال نئی روح و جذبہ کے ساتھ نگہبان عطا کرتی ہے اور آنے والے ممکنہ خمینی کیلیئے اصحاب و مجاہدین تیار کرتی ہے، ایسے مجاہد صفت افراد جو معاشرے کے کسی بھی شعبے میں حُسینیؑ ولولے، خمینی جذبے و معرفت کے ساتھ مثبت اور تعمیری انداز میں سخت ترین جدوجہد کرتے ہیں۔

اس عزاداری سے اختلاف یاتو وہ کرے جو فرعونی و یزیدی (صیہونی ایجنٹ) ہے یا پھر وہ کرے جو یہ باور رکھتا ہو کہ آج اسلام اور مسلمان اقوام کسی خطرے میں نہیں ہے بلکہ مسلمان شان وشوکت کے ساتھ دنیاپر مہربان ہیں، جو حماقت و غیر دانشمندی ہے۔ البتہ سلبی انداز اختیار نہ کرتے ہوئے خود کو اس بات تاکید بھی ہے کہ ہم خود کو رسمی عزاداری کے ساتھ عزاداری کے مقصد سے زیادہ سے زیادہ وابستہ کریں اور یہ عزاداری جو کہ خود پاسبان شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضامن ہے تو ہم بھی خود کو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پابند بنائیں اور احکامات شریعت پر چلتے ہوئے کردارِ حسینی کی تصدیق کریں۔ وہ کردار حُسینی جو نوحؑ نے مشرکوں کے خلاف، موسیٰؑ نے فرعون کے مقابلہ پر، ابراہیمؑ نے باطل طاقتوں کے خلاف، عیسیٰؑ نے بددیانتوں کے خلاف جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاہل اور احمق مشرکین اور کفار کے مقابل نیز دیگر تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانے کے طاغوتوں کے خلاف اختیار کیا۔ معاشرہ انسانی کو پاکیزہ

نظامِ زندگی کا شعور عطا کیا نیز باطل نظاموں کو رُسوا کیا۔ اسلام کی سربلندی اور انسان کو اُس کی حقیقی عظمت و وقار عطا کیا۔

کربلا درس ہے کردارِ رہبریت کا، کربلا درس ہے اطاعت کا دعویٰ کرنے والے افراد کیلئے، کربلا درس ہے شدید مشکلات و سختیوں کے باوجود دین کی حفاظت کا، کربلا درس ہے انقلابی جدوجہد میں روٹی سالن چھن جانے والے خوفزدہ افراد کیلئے، کربلا درس ہے عالمی انقلاب اسلامی کیلئے جدوجہد سے فرار کرنے والے فیملی کی خاطر جدوجہد کرنے والے افراد کیلئے جس میں بیوی بچوں دوستوں کو خدا کے کلمے کی حفاظت کی خاطر قربان کیا گیا۔ کربلا ہر اُس آرام طلب، عافیت طلب، راحت طلب، غیر سنجیدہ فرد کیلئے درس ہے جو دنیا کے ہر کام کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے، سب کچھ کرتا ہے مگر اُس دین کیلئے جو خداوند عالم نے خود اُس کے اور اُس کے عالمی معاشرے یا پھر خاص جغرافیہ کیلئے کامیابی کی کلید بنا کر عطا کیا ہے، بے اعتنائی برتتا ہے۔

خداوندا ہم سب کو حضرت بقیۃ اللہ (ارواح لنا فدا) کے لشکر کا جانثار سپاہی قرار دے، ہم کو توفیق عطا فرما کہ ہم تیرے پسندیدہ دین "اسلام" پر خلوص کے ساتھ عمل میں لگے رہیں، ہم کو علم و معرفت اور صبر و استقامت میں ہر مخلوق سے منفرد مقام عطا فرما، ہم کو اہلبیت علیہم السلام کی سیرت پر چلتے ہوئے اپنا نورانی قرب عطا فرما، اپنی رحمت و کرم سے ہماری استعانت فرما تا کہ ہم مثبت اندیشی اور تخلیقی عمل کے ذریعے اس کرّہ ارض پر تیرے نام کی سربلندی کیلئے جدوجہد کر سکیں، ایسی جدوجہد جو سانس کی آخری ڈور اور خون کے آخری

قطرے تک ہو، تاکہ تو ہم کو اپنی جنت فردوس میں اپنے محبوب بندوں کے ساتھ داخل فرما۔
آمین یارب العالمین

روشن خیالی اور قدامت پرستی

تحرک، انقلابیت، تجدد گرائی نتیجہ ہے روشن خیالی، تنقیدی فکر اور اصلاح احوال چاہنے کا۔ آرام طلبی، عیش کوشی، راحت پسندی اس کی ضد ہے۔۔۔ انفرادی طور پر اور بعض دفعہ پورا معاشرہ مثبت یا منفی رویوں کا حامل ہو جاتا ہے۔

یہ دنیا اخروی و ابدی زندگی کا مقدمہ ہے، یہ زندگی آزمائش اور امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر لمحہ آزمائش ہے۔

اس دنیا کی سعادت یہ ہے کہ خالق کے بنائے ہوئے قوانین اور اصولوں کی تابعداری کی جائے۔

طبیعی قوانین کے ساتھ شرعی قوانین بھی ہیں۔ طبیعی اور فطری قوانین کے ساتھ شرعی قوانین کا امتزاج اس بات کا باعث بنتا ہے کہ علم و دانش نہ صرف سائنس میں محصور ہے اور نہ صرف دین و شریعت میں۔ بلکہ یہ سب مجموعی طور پر "علم و دانش" ہی ہوتی ہے جو انسان کی موجودہ زندگی کو آنے والی زندگی، مستقبل میں کمال و ترقی کا باعث بنتی ہے۔

سستی، کاہلی، آرام طلبی، عیش کوشی اس امر کی طلبگار ہوتی ہے کہ اس کو تحرک اور تجدد سے تبدیل کیا جائے۔

منصوبہ بند توقف، منصوبہ بند مصارف، منصوبہ بند سکون کا حصول وغیرہ سستی کاہلی اور عیش کوشی سے فرق کرتا ہے۔ اسی طرح ضروری نہیں ہر تحرک، ہر انقلابیت، ہر تجدد درست ہے۔ بلکہ اگر یہ سب منصوبہ بند نہیں ہے تو حق سے دور ہے۔

منصوبہ بند ہونے سے مراد یہ ہے کہ حق، عدل، عقل، منطق، اعتدال وغیرہ جیسی بنیادیں بناکر صفات وکردار کی تخلیق کی جائے۔

اسی وجہ سے نظریاتی قوانین سے لیکر فروعات زندگی کے قوانین، ترقی و کمال کی طرف لیجاتے ہیں۔

گناہ وبرائی شارٹ کٹس اور غیر ذمہ دارانہ اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور یہ غیر ذمہ داری علم و دانش سے دوری، غور و فکر سے لاپروائی اور زندگی کے بارے میں غیر سنجیدگی کے باعث پیداہوتی ہے۔

اگر معاشرہ مجموعی طور پر لاپرواہ، غیر ذمہ دار ہے اور تاریخی حقائق کو جدید دور پر منطبق کرکے کمال کی طرف حرکت کے بجائے جمود میں مبتلا کررہا ہے تو کچھ ذمہ دار افراد جو "علم و دانش" رکھتے ہیں اور انسانی سعادت و تکامل کی غیر حاضری پورے معاشرے کی تباہی میں دیکھ رہے ہوتے ہیں تو زوال کے قوانین سے خوفزدہ ہو کر اصلاح، تجدد، انقلاب و تحرک کو فروغ دینا شروع کرتے ہیں۔ ترقی و کمال کی راہ میں آنے والی مشکلات وروایات کے مخالفت کرکے تجدید و تحقیق پر زور دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ منافق ہوتے ہیں، نہ مشرک و کافر نہ

دوسرے قسم کے کوئی دشمن۔۔۔۔ بلکہ یہ وہ روش فکر رکھنے والے اور حساس لوگ ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے کو عبد الٰہی بنانے کے روح رواں ہوتے ہیں۔ بظاہر ان کی باتیں منافقوں اور دشمنوں جیسی مخالفانہ لگتی ہیں مگر ایسا نہیں ہوتا۔

قران ایسے ذہنی بالغوں کیلیئے کہتا ہے: اے نبی بشارت دے دو جو (ہر کہنے والے کی) بات کو غور سے سنتے ہیں اور اس میں سے بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ ہدایت دیتا ہے اور یہی صاحبانِ عقل ہیں۔[39:18]

ایسے مجدد افراد کو باغی، غدار وغیرہ کہاجانے لگتا ہے، شیطان کا ایجنٹ کہا جاتا ہے، جبکہ یہ افراد نہ دائیں بازو والے ہوتے ہیں اور نہ ہی بائیں بازو والے بلکہ یہ امت وسطیٰ کے نمائندے ہوتے ہیں۔ یہ وہ متوازن و معتدل افراد ہوتے ہیں جو نصوص کے مجتہد ہوتے ہیں، جو زمان و مکان کی بصیرت کے حامل ہوتے ہیں۔ جبکہ ان کے مخالفین جو اندرون مکتب سے تعلق رکھتے ہیں، جذباتی، غیر منطقی، بے جار سومات کے حامل اور قوانین کو حالات سے ساز گار کرنے کے بجائے ثابت static انداز میں قبول کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور حق پرستی مکتب کے دشمن بھی ان سے دوستی خواہاں ہوتے ہیں، جبکہ اول الذکر مجددوں کے خلاف۔

قرآن ایسے تاریک ذہنوں کیلیئے فرماتا ہے:" اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے نازل کئے ہوئے احکام اور اس کے رسول کی طرف آؤ تو کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے

جس پر ہم نے اپنے آباؤو اجداد کو پایا ہے چاہے ان کے آباؤواجداد نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ کسی طرح کی ہدایت کرتے ہوں"۔[5:104]

" اور یہ لوگ جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے آباؤ اجداد کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ نے یہی حکم دیا ہے- آپ فرمادیجئے کہ خدا بری بات کا حکم دے ہی نہیں سکتا ہے کیا تم خدا کے خلاف وہ کہہ رہے ہو جو جانتے بھی نہیں ہو۔"[7:28]

مذہبی مجدد اور تاریک مذہبی مفکرین کے درمیان کئی اہم فرق ہیں۔ مذہبی مجدد لوگوں کے ساتھ رابطے میں رہتے ہیں اور لوگوں کی مذہبیت کی تشخیص کرتے ہیں، مذہب کو عقل، تدبر، اخلاق، عدل، احسان، رواداری اور قربانی کا نچوڑ سمجھتے ہیں، مذہب کی عصری تقاضوں کے مطابق از سر نو تعریف اور تولید کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اپنے نظریات اور تشریحات کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کو تیار ہیں، مختلف آراء کا احترام کرتے ہیں، مذہب کے اندر مختلف تشریحات اور نظریات کو قبول کرتے ہیں۔

تاریک مذہبی مفکرین لوگوں کے ساتھ رابطے میں نہیں رہتے ہیں، مذہب کو اپنے ذاتی نظریات اور مفادات کے مطابق سمجھتے ہیں، مذہب کو غیر معقول، دور کی زبان اور عصری تقاضوں کے خلاف سمجھتے ہیں، اپنے نظریات اور تشریحات کو عقل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھنے کو تیار نہیں ہیں، مختلف آراء کا احترام نہیں کرتے ہیں، مذہب کی مختلف تشریحات اور نظریات کو قبول نہیں کرتے ہیں۔

مذہبی مجددوں کا کردار مذہب کو لوگوں کے لیے قابل قبول بنانا اور اسے عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرنا ہے۔ وہ مذہب کو عقلی اور منطقی انداز میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ مذہب کو لوگوں کے مسائل اور ضروریات کے حل کے طور پیش کرتے ہیں۔ تاریخِ عالم میں جب جب بدعتیں، انحراف اور کج رویاں پیدا ہوئیں خالق کائنات نے اصلاح کیلئے انبیاء ورسل ارسال فرمائے اور ہر دور میں ان انبیاء ورسل کی مخالفتیں کی گئیں ان سے دشمنیاں کی گئیں ان کے راستے میں روڑے اٹکائے گئے، اور یہ سب حرکتیں اس دور کی اشرافیہ کے نکھٹو نام نہاد روایت پسند دھرم پرستوں کی طرف سے کی گئیں۔

قرآن کہتا ہے: مشرک لوگ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء و اجداد اس کے سوا نہ کسی اور کی عبادت کرتے اور نہ ہی ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے ایسا ہی ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے (بتاؤ) پیغمبروں کے ذمے کھلا پیغام دینے کے سوا اور کیا ہے؟[16:35]

ایک جگہ اور۔۔۔

جب ان کے سامنے ہماری روشن آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ شخص صرف یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ان سب سے روک دے جن کی تمہارے آباء و اجداد پرستش کیا کرتے تھے اور یہ صرف ایک گڑھی ہوئی داستان ہے اور کفّار تو جب بھی ان کے سامنے حق آتا ہے یہی کہتے ہیں کہ یہ ایک کھلا ہوا جادو ہے۔[34:43]

یہ تو ایک بات ہے کہ تجدد دین کی ضرورت ہر کچھ دہائیوں کے بعد ضروری ہوتی ہے، مگر اس تجدد دز دائی کی آڑ میں دشمنان انسانیت و فطرت اس سے ملتی جلتی چیزیں، افکار و نظریات دنیا میں پھیلاتے ہیں، ایسی سازشیں تیار کرتے ہیں جو شرک و کفر میں اضافہ ہی کرتی ہیں لہذا اس سے بھی ہشیار رہنے کی ضرورت ہے، قرآن کریم میں ان سازشوں کے بارے میں دسیوں آیات موجود ہیں (دیکھئے سازشیں! افسانہ یا حقیقت)۔ نیز اس ضدِ انقلاب و تجدد کے مورد میں امام علی علیہ السلام کی ایک حدیث ہے، فرماتے ہیں: "دیکھو! اس اچھے طور طریقے کو ختم نہ کرنا کہ جس پر اس امت کے بزرگ چلتے رہے ہیں اور جس سے اتحاد و یکجہتی اور رعیت کی اصلاح ہوئی ہے اور ایسے طریقے ایجاد نہ کرنا کہ جو پہلے طریقوں کو کچھ ضرر پہنچائیں، اگر ایسا کیا تو نیک روش کے قائم کر جانے والوں کو ثواب تو ملتا رہے گا مگر انہیں ختم کر دینے کا گناہ تمہاری گردن پر ہو گا۔" (نہج البلاغہ، عہد نامہ مالک اشتر مکتوب نمبر 53)

دانشور اور مجدد کبھی بھی افراطی رویے کے ساتھ اصلاح احوال نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ عمل انسانی فطرت کو پسند نہیں ہے، انسان جبراً کچھ بھی قبول نہیں کرتا۔ قلبی اور باطنی رغبت کیلئے "جدال احسن، موعظۃ الحسنہ" ہی درست طریقہ ہے جس کو قرآن مجید نے پیش کیا ہے۔

جبر و تشدد اور زبردستی نظریات تھونپنے پر قرآن کریم سخت مخالف ہے، یہ آیات دیکھئے:

اور جن لوگوں نے اس (خدا اور اس کے منتخب ولی) کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں وہ خدا کو یاد ہیں۔ اور تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔[42:6]

اور اگر خدا چاہتا تو یہ لوگ شرک نہ کرتے۔ اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا۔ اور نہ تم ان کے داروغہ ہو۔[6:107]

اور اگر خدا چاہتا تو روئے زمین پر رہنے والے سب ایمان لے آتے -تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن بن جائیں۔[10:99]

اے نبیؐ، جو باتیں یہ لوگ بنا رہے ہیں انہیں ہم خوب جانتے ہیں، اور تمہارا کام ان سے جبراً بات منوانا نہیں ہے بس تم اِس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔[50:45]

دین ہو یا دنیا، قدامت پسندی ہو یا تجدد گرائی؛ غرض ہر فکر و عمل میں اعتدال اور میانہ روی اسلامی طریقہ ہے، جس کی قرآن، رسول ص و اہلبیتؑ سب تصدیق کرتے ہیں۔

دینی عقل کی مختصر تاریخ

اسلامی تعلیمات جو کہ انسان کے مادّی و نفسیاتی وجود کو کائنات سے مادّی اور معنوی ارتباط و رابطہ کو خدا کے حضور فطری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کیلیئے ملک جبرائیل کے ذریعے پیش کی گئیں تھیں، آدمؑ تا محمدِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تاریخ بشریت شعور کے مدارج طے کرتی اس مرحلے پر آگئی جس میں انسان کے پاس بیش بہا تجربات کا خزانہ تھا۔ قرآن کریم نے آکر انسانی عقل کو کامل کرنے کا کامل نسخہ دے دیا، جس میں انسان کے سماجی نظم وضبط کو برقرار رکھنے یا قائم کرنے کیلیئے رموز پیش کیے نیز فطری علوم NATURAL SCIENCES کو کسب کرنے نیز مظاہر فطرت اور دیگر مادّی موجودات پر غور و فکر کرنے کی دعوت عام دی۔ چونکہ سماجی نظم وضبط کو توخود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم کیا اور اپنی سیرت نیز اپنے ارشادات کی روشنی میں سماجی مسائل سے نبرد آزمائی سمجھادی مگر فطری علوم کیلیئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے بعد کے برحق راہنماؤں نے تحقیق ، غور و فکر کو شعار بنانے کی تاکید فرمائی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (569-632 عیسوی) کی بعثت کے بعد جب کہ عالمی تہذیبیں جیسے سلطنت روم اور فارس آمادہ بہ زوال تھیں، انسانیت کو ایک جدید تہذیب سے روشناس کرایا گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت عقلی اور معنوی رہبریت و قیادت کے زیر اثر انسان / مسلمانوں نے شعور کے اعلیٰ مدارج طے کرنے شروع کر دیئے۔ اس آخری رسول

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کو علم و معرفت، عقل و دانش کے آخری آئین سے متعارف کروانے کے ساتھ اس بات پر تاکید کر دی کہ اب ترقی و تنزلی کے تمام اسباب و رموز سے آگاہ کر دیا گیا ہے نیز نظام اسلامی و فطری کو قائم کر کے تم اولین مسلمانوں سے اس بات کی گذارش چاہتا ہوں کہ میرے بعد اسی طرح ترقی و کامیابی حاصل کرتے چلے جانا، مجھے خداوند متعال نے تمہاری دنیا اور آخرت کی کامیابی کیلئے آخری معلم کے عنوان سے قرار دیا ہے۔ دین کی تعلیمات مکمل ہو چکی ہیں، نظام دین قائم ہو چکا ہے بس اب اس کو وسعت دینی ہے مگر اُسی خداوند کے اشاروں اور ہدایت پر تم پر میرے خلیفہ کی اطاعت لازم ہے، جو اس نظامِ کا راہنما ہے اور تم کو اُن قوانین کی روشنی میں ترقی و کمال دے گا جو خالق و مالک نے اس دنیا میں جاری و ساری فرمائے ہیں، میرے بعد یہی علم و دانش، فقہ و حکمت، ہمت و شجاعت کی کان ہے۔

رسول پر نور و حکمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت جانگداز کے بعد اُن کی اس وصیت پر عمل نہ کیا گیا اسلام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بطور نظامِ زندگی نافذ العمل نہ ہو سکا مگر آئمہ اہلبیت علیہم السلام (600-940 عیسوی) کے وجود کے باعث عالمی سماج میں عقل و دانش، علم و حکمت کا چراغ روشن رہا، وہ عمومی مسلمان یا پھر شیعہ جنہوں نے آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے بلواسطہ یا بلاواسطہ کسبِ فیض کا سلسلہ جاری رکھا وہ اپنے علمی، فکری اور تحقیقی کارناموں کے باعث تاریخی اوراق میں موجود ہیں۔ یہ چراغ حضرت مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی غیبت کبریٰ (940 عیسوی) تک روشن رہا جس کی ضیاء باری میں غصبِ حقِ امیر المومنین علیہ السلام کے بعد سے بتدریج کمی آتی رہی تھی۔ غیبتِ کبریٰ کے بعد یہ مزید مدھم ہونا شروع ہو گیا۔ عالمی معاشرہ عقل و دانش اور شعور و علم و معرفت سے

بیگانہ ہونے لگا، ہمہ جانبہ عقلیت پسندی اور خرد افروزی ماند پڑتی رہیں، اہلسنت میں اشاعرہ اور تشیع میں اخباری علماء جو عقل کے مخالف رہے نیز اہلسنت میں معتزلہ گروہ عقلیت پسندی کی تبلیغ کرتا رہا مگر قرون وسطیٰ میں اس کی بھی جان اشعری مکتب نے لے لی۔ مگر تشیع کے اصولی علماء جو کہ اسلام کا اصل چہرہ اور اسلام کی اصل روح کے ساتھ حدیث الثقلین کی پیروی میں یعنی قرآن کریم اور آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے متصل رہا عمومی مسلمانوں میں ماند پڑتی خرد افروزی اور شعور و معرفت سے اس بری طرح سے متاثر تو نہ ہوا مگر بہر حال کچھ نہ کچھ اثر ہوا کیوں بہر حال ہدایت کے آفتاب ہی جب روپوش ہوجائیں تو پھر وہ بادلوں کی اوٹ سے نشان راہ بنتے ہیں۔ دنیائے تشیع میں علماء اور فقہا نے کافی حد تک عقلیت پسندی اور خرد افروزی کو باقی رکھا اور علمی و فلسفی جدلیات کو جو کہ ملا صدرا (1591-1641 عیسوی)، میر داماد (1561-1631 عیسوی) نے نئے انداز سے ترکیب دیا، جبکہ دیگر فرق ہائے اسلامی بامقابلہ تشیع، عقلی اور شعوری پسماندگی میں جا پڑے تھے۔ اس دوران (1517 عیسوی) مغرب نے دین بیزار خرد افروزی اور عقلیت پسندی کو عروج دیا، مغربی فلاسفہ جنہوں نے اس RATIONALISLM کو مسلمانوں سے ہی سیکھا تھا مغرب میں فروغ دے رہے تھے، یہ فلاسفہ جو کہ ماضی میں کلیسا کے ظلم و استبداد سے پہلے ہی خوفزدہ تھے اسلامی تعلیمات کو بھی اُسی طرح باور کیا کہ شاید یہ استبداد کا نیا حربہ ہے اور مغالطہ کھا کر دین کو ہی خیر باد کر دیا، لہذا مسلمان فلاسفہ سے اپنے مفادات کی حکمتیں لے لیں مگر مذہب و عقیدہ کو چھوڑ دیا نیز ان اسلامی تعلیمات کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا، عقلیت پسندی، خود انحصاری، خود اعتمادی، صبر و برداشت، ہمت و حوصلہ نیز

دیگر انسانی کمالات اور صلاحیتیں مسلمانوں سے سیکھیں نیز فطرت کو اپنے ہاتھوں گرفتار کرنے کی کوشش جاری رکھی۔

ان مغربی فلاسفہ کے نزدیک عالمی سماج اور انسانیت کے مفادات اہم نہ تھے بلکہ اپنی غربت اور جہالت سے نکلنا اور مذہبی طاغوتوں سے چھٹکارا حاصل کرکے طاقت و قوت حاصل کرنا اصل ہدف تھے، البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اکثریت نو مسلموں نے یہی کچھ رویہ اہلبیت علیہم السلام اور اُن کے شیعوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اس مغربی غیر دینی (SECULAR) خردافروزی کو 1979 عیسوی میں انقلاب اسلامی ایران کے دوران ایرانی اور دیگر شیعہ فلسفیوں اور مفکرین (محمد حُسین طباطبائی، باقر الصدر، روح اللہ خمینی، مرتضیٰ مطہری، علی شریعتی وغیرہ) نے شدید قسم کا دھچکا پہنچایا نیز جدید اور مابعد جدید دور کے اسلامی فلاسفہ (محمد تقی جعفری، مصباح یزدی، جوادی آملی، علی خامنہ ای وغیرہ) نے اسلامی تعلیمات (قرآن و اہلبیت علیہم السلام) پر مزید غور وفکر کرنے بعد درایت علمی سے مزید فکر و شعور کے باب کھولے جو 21ویں صدی کے مسائل کو خالص اسلامی فکر سے حل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، نیز عالمی حکم نامہ (ورلڈ آرڈر) کے تمام سلوگنز اور شعار کی اصل حقیقت کو بھی عیاں کرتے ہیں، ان اسلامی تعلیمات میں پوشیدہ سماجی فلسفوں اور معاشرتی علوم کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومت و نظام کے انتشار کے بعد جامع طور پر پہلی دفعہ اجراء کیا جارہا ہے، جس کے مثبت نتائج آرہے ہیں، طاغوت اور استحصالی طبقہ ہمیشہ اونچے طبقوں سے مربوط ہوتا ہے خواہ وہ معاشی اونچائی ہو یا سیاسی یا مذہبی (جیسے قدیم کلیسائی طاغوت)۔ شیطانی اور جہل کے لشکر آج بھی رحمانی اور عقل کے لشکروں سے نبرد آزما ہیں، کہیں معاشی سطح پر، کہیں ثقافتی سطح پر، کہیں سیاسی سطح

پر وغیرہ۔ مغربی فلسفیانہ مکاتب فکر جیسے کہ LIBRALISM, IDEALISM, REALISM, PRAGMATISM, EXISTENTIALISM, HUMANISM, MARXISM, CAPITALISM, COMMUNISM وغیرہ وغیرہ اسلامی تعلیمات (قرآن و حدیث و سیرتِ معصومین علیہم السلام) ہی اخذ شدہ ہیں، اور جداگانہ طور پر اسلامی مقدس متن کے تجرباتی شواہد ہیں، البتہ ان مغربی تعلیمات میں معاشی اور سیاسی حوالے سے ذاتی مفادات کے تحت تحریفات بھی کی گئیں ہیں۔ یہ تمام ازم اگر انسانی زندگی کے تسلسل کے زاویے سے دیکھتے ہوئے مرحلہ وار سیکھے جائیں تو ان کا کھرا کھوٹا واضح ہو جائے گا، ترقی اور کمال کے مراحل میں شامل زندگی کے ادوار ان تمام ازمز میں بالکل قرآن کریم کی طرح ہیں جو مرحلہ وار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سکھائے گئے تھے۔ قرآن کریم کو ترتیب نزولی سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ تمام ازمز کسی نہ کسی مرحلے پر قرآن کی ہدایات میں شامل ہیں البتہ ان ازمز میں قرآن کی تعلیمات بعینیہ موجود نہیں اور تحریفات کی گئیں، اسی وجہ سے مغربی فلسفے اور عقلیات کا مطالعہ کرنے سے پہلے یا ساتھ ساتھ قرآن کریم سے رابطہ رکھنا ضروری ہے تاکہ منحرف عقلیات کو موقع پر پکڑ لیا جائے۔ مگر مسلمانوں میں معرفتی متن کے مطالعہ کا رجحان بہت حد تک کم ہے بلکہ تقریبانہ ہونے کے برابر ہے، البتہ پڑھنے لکھنے والے مسلمانوں کیلئے سائنس و ٹیکنالوجی اُن کے دین کا اثبات کر رہی ہے تو دوسری طرف فراعینِ وقت اسی ٹیکنالوجی اور تحقیق کو اپنے پست مقاصد کیلئے بھی استعمال کر رہے ہیں۔

ایک رجحان کا شائبہ محسوس ہو رہا ہے جو غلط ہو، وہ یہ کہ مغرب اُن کوتاہیوں کے ازالے کیلئے تیار ہے جو ملحدانہ رجحان کا باعث بنے اور اس کی وجہ سے مغربی معاشرے معاشی اور ثقافتی

تباہی کے نزدیک جا پہنچے ہیں۔ نہ صرف مغرب بلکہ چین اور روس بھی مذہبی خرد افروزی کیلئے آمادہ ہونے کا شائبہ دے رہے ہیں، یعنی علمی و سائنسی تحقیقات کے ساتھ دین اور خدا کی طاقت کو بھی تسلیم کیا جائے اور خود کو عقل کُل کے مصداق ہر مسئلہ کو اپنے کاندھے پر نہ اُٹھایا جائے یا اگر اٹھایا بھی جائے تو اُس کے حل کے ساتھ اِس کے منفی اثرات سے بچنے کا بھی ازالہ کیا جائے۔

مغرب کو غیر دینی عقلیت پسندی و غیر دینی رومانیت سے دینی عقلیت پسندی و دینی رومانیت کی طرف آنا ہو گا۔ جبکہ مسلمانوں کو دینی رومانیت و دینی عقلیت پسندی میں توازن قائم کرنا ہے۔ تشیع کے علاوہ دیگر فرق ہائے اسلامی میں کوئی یا تو صرف رومانیت پسند ہے اور کوئی صرف عقلیت پسند، جبکہ تشیع کی تعلیمات اپنی ابتدائے صدر سے عقلیت پسندی اور رومانیت کا مجموعہ ہے البتہ شیعہ عوام میں اعتدال کے ساتھ یہ دونوں عناصر ترکیبی زیادہ تر عملی انداز میں تو موجود نہیں ہیں لیکن اپنی تعلیمات (تفسیر قرآن وحدیث و تاریخ معصومین علیہم السلام) میں کتابی صورت یا پھر قلیل تعداد میں علماء و فقہائے تشیع یا دیگر اہل تدبر متدینوں میں کافی حد تک میزان کے ساتھ موجود ہیں۔

تمام عالم بشریت کیلئے ان دونوں عناصر میں اعتدال و میزان قائم کرنا حد درجہ اہم ہے، دنیا بھر کے مذہبی فساد ان دونوں عناصر میں افراط و تفریط کا ہی نتیجہ ہیں۔ اعتدال کے ساتھ دین اسلام ہی وہ آئین ہے جو دنیا کے تمام افراد کیلئے بنیادی ضرورت ہے اس کو وہی تجربہ کار فرد یا معاشرہ سمجھ سکتا جو نعمتوں کے زوال اور سختیوں سے عروج و آسودگی کی طرف جانے کی حکمت اور ان عوامل کے پیچھے الٰہی طاقت کو احساس کر چکا ہو۔

الہامی ہدایت اور کتابی ہدایت سے حاصل ہونے والے نتائج پر دیانت داری دکھانا کامیابی کا ضامن ہے، اگر کہ خود اپنے الہام پر یقین نہ کیا اور صداقت واضح ہوجانے پر بھی سچ کا ساتھ نہ دیا تو یہ خود اپنے آپ سے خیانت ہے جس کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ملتی ہے۔

انسانی نفس وروح جو عقل وجذبات کا مجموعہ ہے جس میں کبھی عقلانیت اور کبھی جذبات کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف رومانیت کی طرف ہو جانا یا صرف عقلیت پسند ہو جانا غیر معتدل رویہ ہے، یقینا جس خالق نے یہ دونوں عناصر بشر میں ترکیب دیئے ہیں اور اسی وجہ مکاتیب الٰہی میں عقل و نفس میں اعتدال پر زور دیا گیا ہے۔

اگر ابتداء میں ہی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت پر عمل کرلیا جاتا تو آج نہ مسلمان پسماندہ ہوتے نہ ہی مغرب استعماری، استکباری اور استثماری گناہوں میں ملوث ہوتا۔ افراط و تفریط سے پاک اس عالمی معاشرہ پر خالق کے نمائندے کی رہنمائی میں ایک نظام ہوتا عقل واحساسات کے میزان کی جنت قائم ہوتی۔

خداوند متعال سے دعا ہے کہ اس کرّہ زمین کو ولی عقل وحکمت کی مسند نشینی کے ذریعے ہم سب کو عدل وعدالت، علم و دانش، فکر و تدبر، عشق وعرفان میں میزان واعتدال کے ساتھ انتھک محنت وجد وجہد کے ذریعے بندگی کو کامل کرنے کا ذریعہ قرار دے تو ہی ہمارا مولا ہے، ہماری التجاؤں کو قبول فرما۔ آمین یارب العالمین

مغرب اور تیسری دنیا کا سائنس و ٹیکنالوجی میں بے جوڑ مقابلہ

سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی مضبوط معیشت، قوت ارادی اور بلند عزائم کے بغیر ناممکن ہے۔ انسانی فطرت میں سہولت کے حصول کی خاطر اور مشکلات سے نکلنے کیلئے قوت ارادی اور بلند عزائم خود پیدا ہو جاتے ہیں اور مضبوط معیشت اسی ارادہ اور عزم کا محصول ہوتا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی انسانی سہولت میں اضافہ کرتے چلی جاتی ہے۔ مغرب کی پے در پے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کا راز بھی یہی عناصر ہیں۔ البتہ مغرب کی مضبوط معیشت میں سودی کاروبار و بینکاری، خام وسائل سے بھرپور علاقوں پر فوجی دھونس و زبردستی، سیاسی غرور و تکبر، نسلی تعصب, خود غرضی, بے حیائی بھی شامل ہے۔ مسلمان ان کی سائنس و ٹیکنالوجی سے مقابلہ کرنے کیلئے ہمہ وقت پریشانی اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کو اس کیلئے اپنی چھوٹی چھوٹی چندی چوریاں اور کرپشن چھوڑ کر بڑے فراڈ کرنے چاہییں تبھی ان کفار و مشرکین سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے نیز اس کیلئے اپنے اوپر سے ظاہر داری کا ہی سہی اسلامی ٹیگ اتار دینا چاہیے۔

لہذا سائنس ٹیکنالوجی میں مغرب سے مقابلہ کرنے کے بجائے دوسری صورت یہ ہے کہ اسلامی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے اور مغرب کے سودی کاروبار اور فوجی دھونس اور غرور

و تعصب کے برتے پر قائم علمی و سائنسی و ٹیکنالوجی سے مقابلہ بازی بند کریں اور سماجی علوم پر توجہ مرکوز کریں، نیچرل سائنسز پر حسب استطاعت خرچہ کریں, مذہبی تہذیب اور ثقافت اور فنون لطیفہ کو فروغ دیں۔ مضبوط عزائم، بلند ہمت اور دینی تہذیب و اخلاق کے ذریعے دنیاکے عوام کے قلوب فتح کرنے کی کوشش کریں اور خود دشمن کے اندر اپنے ہمنوا اور پشت پناہ پیدا کریں۔ عدل و عدالت، انصاف، مہربانی، رحم دلی، تواضع، محبت، انکساری اور دیگر صفات حسنہ جو کہ دین اسلام نے اپنانے کی نصیحت کی ہے ان کے ذریعے اپنی دنیا کو مسخر کریں اور آخرت تو ہے ہی اس دنیا کی کھیتی، تو وہ بھی خود بخود آباد ہو جائے گی۔ سودی کاروبار، رشوت، چوری، غبن دنیا پرستی وغیرہ سے دور رہتے ہوئے معاشی اخلاق اور تہذیب اپنانے سے تیسری دنیا بے سروپا علوم و سائنسز سے مستغنی ہو جائے گی اور اسلامی سماج اپنے بہترین اخلاقی روایات پر فخر کر سکے گا۔ انسانی دنیا کے مسائل پر فوکس رہے گا اور مریخ و پلوٹو پر بے سروپا تحقیقات کچرے کا ڈھیر بن جائیں گی۔

ورنہ وہی پہلا طریقہ اختیار کریں کہ چھوٹی چھوٹی چندی چوریاں، دھوکے، فراڈ، غبن وغیرہ چھوڑ کر بڑے ڈاکے ڈالے جائیں، انسانی اقدار کو فراموش کرکے وسائل سے بھرپور علاقوں پر دست درازی کی جائے، کسی خون اور عزت کی پروانہ کی جائے غرور و تکبر، خود غرضی, لالچ, تعصب و دہشت گردی، درندگی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مال جمع کرکے مغربی مقابلے پر سائنس و ٹیکنالوجی اور دہشت گرد سیاسی تکبر میں ترقی کی جائے۔ حرام خور کا حلال خور کی زندگی کا مقابلہ ہے ہی بے جوڑ۔۔۔

چوری, ڈکیتی اور استحصالی دولت کا صدقہ ، خیرات، فلاحی کام کوئی بار گاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتا۔

یاد رکھیں جس دن سامراج کے دجالی چراغ کا تیل یعنی سودی معیشت متزلزل ہوئی اس دن ہر طرح کے بے سروپا فلسفے, جدید سائنسی کلچر اور سائنسی تحقیقات کی نوعیت فطری درجے پر آجائے گی جیسا کہ ہونا چاہیے۔

جس دن سامراج کی معاشی مرغی مرگئی تو سونے کے انڈے دینے والی سامراجی ٹیکنالوجی بھی مر جائے گی۔ سامراجی برائیلر معاشیات جس کی بنیاد ڈائیریکٹ سود یاان ڈائیرکٹ سود انفلیشن ٹیکس Inflation tax پر ہے سامراجی نظاموں کے استحکام، بے سروپا سائنسی تحقیقات اور مالیخولیائی فلسفوں کی پیدائش کا سبب ہے، کیونکہ یہ فریبی معاشی سسٹم ہی ہے خاص طور پر بینکنگ اور کاغذی کرنسی کے ذریعے جو دنیا کی 90٪ آبادی کو معاشی اور پھر سائنسی ترقی سے روک رہاہے اور دوسری طرف سامراج کو کاغذی یاڈیجٹل کرنسی سے زیادہ سے زیادہ سرقے کے ذریعہ امیر سے امیر تر بنارہاہے اور یہ امیری ہی سبب ہے کہ دنیا کو بھوک افلاس غربت جہالت بیماری میں مبتلار کھاجائے اور ترقی کے نام پر ٹیکنالوجی اور خلائی مشن سے مرعوب کرکے اصل دنیا کے مسائل سے توجہ ہٹائی جاتی رہے نیز اس معاشی طاقت سے سائنسی تحقیقات انجام دی جاتی رہیں۔ یہ واضح ہے کہ دنیا کی 90٪ آبادی کا سائنس و ٹیکنالوجی کے بزنس میں سوائے صارف کے اور کوئی کردار نہیں۔۔۔۔ فریب ودھوکہ پر مبنی معاشی نظاموں کے علاوہ میڈیا،علوم و فلسفے کے شعبوں میں بھی دھوکہ

فریب کے ذریعے دنیا کے انسانوں کو تعلیم کے نام پر جہل مرکب میں مبتلا کیا جاتا ہے، کبھی کسی فلسفے کے نام سے کبھی کسی تھیوری کے نام سے۔۔۔۔ اور دوسری طرف فریبی معاشی نظاموں سے حاصل شدہ دولت سے سائنسی محققین، فلسفیوں کو بھاری رقوم دے کر نت نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی جاتی ہیں اور عوام اس کو ترقی کے نام پر ہاتھوں ہاتھ لیتی ہے۔ دیدہ و دانستہ فسادوں اور بلووں میں بھی اسی سونے کے انڈے دینے والی فریبی معاشی مرغی کا ہاتھ ہے، جو دنیا کی حکومتوں کو خریدنے یا نافرمان حکومتوں اور اقوام میں فساد کروانے والوں کو بطور رشوت دی جاتی ہیں۔ سامراج کا مذاہب کی مخالفت اور الحادی فلسفوں کے پھیلانے کا ایک بنیادی سبب بھی دنیا کو غلام بنانا ہے۔۔۔۔

یہ ترقی ہے۔۔۔!! مگر کیسی ؟!!

ہاں! بے حسی، بے غیرتی، ذلالت اور کمینگی میں ترقی ہے۔

سامراج کے استحکام کا بنیادی اسباب میں سے ایک تیسری دنیا کے لوگوں کا مشترکات پر آپس میں اتحاد نہ ہونا ہے۔ اس اتحاد کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والے تحریک ہے جس میں سامراج کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔

امت کا درد رکھنے والے بعض نا درست ترتیب پیش کرتے ہیں کہ پہلے سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کی جائے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ٹیکنالوجی و سائنس, تعلیم, ابلاغیات میں ترقی, سماجی و عائلی حقوق کا تحفظ و بہتری یہ سب حکومت اسلامی کے outcomes

ہیں۔۔۔ابھی تو ہم نے کسی نے اعلان رسالت (ذمہ داری اٹھانے کا اعلان) ہی نہیں کیا ہے!!! اس کے بعد مکی مرحلہ پھر مدنی مرحلے کی باری آتی ہے۔۔۔یہ مدنی مرحلہ ہے جو ٹیکنالوجی و فلسفے و معیشت و دفاع کی ترقی کا سبب بنتا ہے، مدنی مرحلہ ہے جس میں ظاہری نظاموں کو تشکیل دیا جاتا ہے اور سماجی نظم وضبط کو قائم کیا جاتا ہے اور معاشرے کا ہر فرد مکی مرحلے میں انجام دی گئی مشقوں اور ریاضتوں کا عملی نمونہ مدنی مرحلے میں دیکھتا ہے۔۔مکی مرحلہ انتھائی کٹھن اور دشوار ہوتا ہے اس میں دینی سیاست کی فکری تربیت ہوتی ہے، دین اور دنیا کا نظریاتی، علمی فکری ڈھانچہ مضبوط کیا جاتا ہے تاکہ مدنی مرحلے پر پہنچنے تک وجود کا ڈھانچہ ڈھے نہ جائے۔۔۔لہذا outcomes کو outcomes آنے تک انتظار کریں اور ابتدائی مراحل کی تکمیل کیلیئے کوشش کریں۔ مسلمان کیلیئے کامیابی کے مراحل اور ہیں اور مشرک کیلیئے اور۔۔۔ مشرک صرف اس وقت فائدہ میں رہتا ہے جب مسلمان کوتاہی کرتا ہے لہذا مسلمان مشرک کی نام نہاد کامیابی سے مرعوب نہ ہو بلکہ خدا نے جو اہداف مسلمان کیلیئے معین کیے ہیں ان کی تمنا کرے، اس کے حصول کی نیت کرے اور اس کیلیئے عمل کرے۔ جس دن اسلامی حکومت قائم ہوگئی اس دن دنیا سے غیر فطری طبقاتی نظام اختتام پاکر اتنا ہی رہ جائے گا جتنا کسی بھی سماج کی محنت,ہمت تقاضا کرتی ہے۔ سودی کاروبار کے سرپرست سرمایہ دار صنعتکار آرام طلبی,خود غرضی کاہلی کے جس حرام رزق پر پل رہے ہیں پھر اپنی جائز کمائی کھائیں گے۔ پھر جو محنت کرے گا اسے اتنا ہی ملے گا جتنا اس کا حق ہو گا۔ انشاء اللہ

پروردگار! ہم جو کچھ بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے اس کا ہم سے مواخذہ نہ کرنا. خدایا ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا پہلے والی امتوں پر ڈالا گیا ہے پروردگار! ہم پر وہ بار نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو. ہمیں معاف کر دیناً ہمیں بخش دیناً ہم پر رحم کرنا تو ہمارا مولا اور مالک ہے اب کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

سائنس، کاروبار اور مذہب

سائنسی تحقیقات اور تجارتی وکاروباری مفادات کے درمیان تعلق وقت کے ساتھ بدلتا رہاہے، آجکل یہ واقعہ ہے کہ سائنس ٹیکنالوجیکل کمپنیوں اور صنعتی ایجنڈوں کے ساتھ گہری دوستی میں نتھی ہو چکی ہے اور کارپوریشنوں اور صنعت کاروں کی طرف سے فنڈنگ مخصوص سمتوں میں تحقیق کو آگے بڑھاتی ہے، جو ممکنہ طور پر عالمی ترجیحات اور نتائج کو متاثر کرتی ہے۔ تاہم، یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ تمام سائنسی تحقیقات صرف تجارتی مفادات پر منحصر نہیں ہیں البتہ اکثر شعبہ جات میں کاروباری ترجیحات کی بنیادوں پر سائنسی تحقیقات، سائنس دان وغیرہ سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔

اگرچہ سائنسدانوں اور کاروباروں کے درمیان تعاون جدت اور تکنیکی ترقی کیلئے تحقیقات کاباعث بنتاہے مگر یہ عمل دنیاسے غربت افلاس، مسکینی کی بنیادوں کے اختتام کو ترجیحات میں رکھنے کے بجائے عالمی کاروبار، کارپوریشنوں اور اس سے منسلک پیشہ وروں کے مفادات اور سہولیات کو ترجیح دیتاہے۔

جیسے کہ سائنس بہت زیادہ تجارتی ہو چکی ہے، تو اس خطرے کا سامنا ہے کہ تحقیقی ترجیحات زیادہ تر منافع کے مقاصد سے متاثر ہو چکی ہیں اور عام انسان کی بھلائی کے لیے علم کی تلاش یا بنیادی مسائل کے حل کیلئے نہیں ہوتی بلکہ سرمایہ دار و صنعت کار کے کاروبار کی بڑھوتری کیلئے کام کرتی ہے نیز یہ مشاہدہ بھی ہے کہ سرمایہ دار زیادہ منافع حاصل کرنے کی غرض سے مثلاً صحت کے مسائل خود پیدا بھی کرواتا ہے اور پھر علاج فراہم کرکے دولت دوگنی چوگنی کرتا ہے نیز تفریحات کے شعبے میں انٹرٹینمنٹ کے نام پر، غذائی ضروریات کے نام پر اور دیگر شعبہ جات میں ایسی سائنسی تحقیقاتی اداروں اور یونیورسٹیوں جن کا علمی رعب ذرائع ابلاغ اور دیگر ذرائع سے پہلے ہی قائم کر دیا گیا ہے جھوٹے اعداد و شمار، سروے اور مطالعات شائع کرتا ہے جس سے عوامی ذہن کو مغالطہ میں مبتلا کرکے تفریحی، غذائی اور دیگر مصنوعات کو معاشرے کی اہم ضرورت اور ترجیح باور کراتا ہے اور سائنسی رعب و مصنوعات کی ظاہری چمک دمک کے ذریعے مارکیٹ پر قابو کرتا ہے ، صارفین بڑھاتا ہے اور منافع میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ حرکت سائنسدانوں اور محققین کی علمی حیثیت اور اس شعبے کی عظمت پر داغ لگاتی ہے، من مانے نتائج اور تحقیقی رپورٹس، سرویز، اعداد و شمار تیار کیے جاتے ہیں اور یقینی طور پر یہ حرکت عالم انسانیت کے اہم اور ترجیحی شعبوں اور

طبقات کی طرف سے توجہ ہٹاتی ہے بلکہ دھوکہ میں رکھتی ہیں اور یہ سب عالمی اسٹیبلشمنٹ جو چند خفیہ خاندانوں پر مبنی ہے، کی طرف سے دانستہ انجام دیا جاتا ہے۔ بعض مواقعوں پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سائنسی ترقی تک رسائی محدود کر دی جاتی ہے اور تجارتی اشرافیہ کی خفیہ حکومت کے مفادات و منافع کو غیر جانبدار محقق کی معلومات و دانش کی ملکیت پر ترجیح دی جاتی ہے نیز جو محققین اور سائنسدان یا علمی ادارے اس دھوکے کے کاروباروں میں تعاون سے انکار کرتے ہیں ان کیلئے زندگی سخت یا عدم سے ہمکنار کر دی جاتی ہے۔

اس المیہ کے تناظر میں یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ سائنسی تحقیق کی غیر جانبداری کی سالمیت برقرار رہے اور تحقیق پورے معاشرے کے فائدے کے لیے مساوی طور پر کی جائے۔ علم کی تلاش اور مختلف stakeholders اور انسانی برادری و عالمی معاشرے کے ذیلی طبقات کے مفادات میں توازن برقرار رکھنا ایک مسلسل چیلنج ہے۔ سائنسی عمل پر ناجائز اثر ورسوخ کو روکنے کے لیے ان تعاونوں کی رہنمائی کے لیے اخلاقی معیارات کا تعین اور تحقیقاتی شفافیت بہت اہم ہے۔

سائنسی تحقیقات اور پھر ٹیکنالوجی کو تجارتی بنانے اور سائنسی تحقیق کے بنیادی اصولوں کے درمیان توازن پیدا کرنا سائنسی تحقیق کی سالمیت اور سماجی فوائد کو بر قرار رکھنے کے لیے اہم ہے۔ اخلاقی پالیسی کا تعین مذکورہ تناظر میں اخلاقی رہنمائی اور اخلاقی پہلو فراہم کرنے کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر اکثر عدل و عدالت اور معاشرتی انصاف سماجی شعبہ جات میں اعلیٰ آسمانی اقدار پر زور دیتا ہے۔ مذہبی برادری اور مذہبی رہنماؤں کو تجارتی تناظر اور معاشرتی ترجیحات کے تعین میں سائنس کے اخلاقی اثرات کے بارے میں اپنا حصہ ڈالنا چاہیے، علمی و سائنسی شعبہ جات نیز عمومی طور پر معاشرے کو یہ یاد دلاتے رہیں تاکہ تمام افراد کی بہبود کی ترجیح اور انصاف وعدل کے ماحول کو تخلیق کیا جائے اور کرّہ ارض پر دیرپا انسانی زندگی کے قیام کیلئے حقیقت پر مبنی ترجیحات کا تعین کیا جائے۔ مثلاً دنیا کی 80٪ فیصد مسائل جن میں بھوک، صاف پانی اور چھت نیز ہنری قابلیتیں اور روزگار کے مواقع فراہم کرنا اور معاشرے کے اخلاقی کردار کے شعور کو فروغ دینے کے اقدامات سب سے زیادہ ترجیح رکھتے ہیں، چہ جائیکہ کہ اے آئی پر، مریخ پر، نئی اقسام کے جانوروں پر اور دیگر ٹیکنالوجی کی تیاری کیلیے تحقیقات میں سرمایہ لگایا جائے۔

مذہبی اصول کی روشنی میں سائنسی کوششوں میں اخلاقی معیارات پر مبنی پالیسیز تیار کریں، سائنسدانوں اور کاروباروں کو پابند کریں کہ وہ اپنے کام کے انسانیت اور زمین پر وسیع تر اثرات کو یقینی بنائیں۔ پالیسیز میں اخلاقی پہلو شامل کر کے، مذہبی و سماجی ماہرین کے ساتھ رابطے کے ذریعے زیادہ متوازن سائنسی تحقیق، ٹیکنالوجی کی تیاری اور پھر مارکیٹ کرنے کو فروغ دینے میں کردار ادا کیا جا سکتا ہے جو انسانی سماجی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ البتہ اس مورد میں یہ اہم ہے کہ پالیسیز ساز ہر طرح کے دھمکی، لالچ اور خوف سے مبرّا ہو کر ایسا قانون تیار کریں جس میں عالمی انسانی معاشرے کی فلاح ترجیحی بنیادوں پر عمومی اور مساوی طور پر نتیجہ خیز بنائی جا سکے۔ اور استحصالی عناصر کیلئے مکمل ضابطہ بنا کر ان کی اجارہ داری کو ختم کیا جا سکے۔

(نوٹ: لفظ "سائنس" کو انسانی سماج کے ستونوں جیسے کہ فلسفہ، تعلیم، مذہب، سیاست، ذرائع ابلاغ وغیرہ سے بدل کر فکر انگیز مطالب حاصل ہو سکتے ہیں، کیونکہ کرپٹ سرمایہ دار نے ہر ستون کو کمرشلائز کر دیا ہے، جس کا واحد حل یہ ہے کہ سرمایہ دار کے کنٹرول سے عالمی اور مقامی کنٹرول لے لیا جائے یا اس کو عالمی معاشرے کی فلاح کا پابند کرنے کیلئے قانون کے ضابطے میں لایا جائے، البتہ عمومی "بشر" جو کسی بھی طرح سے طاقت و قدرت میں آتا ہے خواہ قانون

سازی و عملیات بھی، اس کیلیے ممکن نہیں کہ وہ بشری منفی نفسانیات میں مبتلا نہ ہو، اسی باعث یہ امر زور پکڑتا ہے کہ مقدس نمائندہ قوتیں الہٰی طاقت اور قدرت کے ذریعے عالمی کنٹرول اور عالمی انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لیں جن سے حدوث اور غلطی وخطا کا امکان نہیں ہوتا)

اچھائی، برائی پرکھنے کا اصول

انسانی زندگی مختلف قسم کے شعبوں سے مربوط ہے،

اور انسان ایک مطمئن زندگی گذارنے کیلئے مختلف شعبوں سے منسلک ہوتا ہے، کچھ شعبوں سے منسلک رہنا انسان کی مجبوری ہے یا یوں کہا جائے کہ واجب اور فرض ہے، کہ ان سے رابطے میں رہے بغیر زندگی کی کامیابی کی شرط نہیں پوری ہوتی!

ان "بنیادی" شعبوں کے قوانین ہوتے ہیں جن پر عمل ہر انسان کیلئے ضروری ہے،

کچھ شعبے ایسے ہیں جن سے کبھی کبھار رابطہ ہوتا ہے اور کبھی تو زندگی بھر واسطہ نہیں پڑتا۔

مثلاً بنیادی شعبوں میں نظام تعلیم اور اس کی جزئیات و متعلقات، سیاسی نظام اور اس کے جزئیات و متعلقات، معاشی نظام اور اسکے جزئیات و متعلقات، ثقافتی اور تہذیبی نظام اور اس کے جزئیات و متعلقات،

درج بالا "بنیادی نظاموں" میں ایک عام آدمی کا رابطہ ان کے جزئیات و متعلقات سے رہتا ہی ہے،

ان "بنیادی نظاموں" کی تشکیل ان کی پالیسیز میں ردوبدل عام آدمی انفرادی سطح پر نہیں کر سکتا، بلکہ ان میں تبدیلی حکومتی انتظامیہ ہی کر سکتی ہے۔

عام انسان کی عائلی زندگی ان سب "بنیادی نظاموں" سے متاثر ہوتی ہے اور جو قوانین یہ نظامات تشکیل دیتے ہیں ایک عام آدمی کیلئے ان کو صرف follow کرنا ہوتا ہے، خواہ وہ اسے غلط سمجھے یا صحیح۔۔۔

انسانی زندگی میں تعلیم اور معیشت مادّی زندگی کیلئے "بنیادی ضرورت" ہیں، ضروری تو باقی شعبے بھی ہیں، مگر اگر ان میں شعوری طور پر حصہ نہ بھی لے تو انسان بہت کامیاب نہیں بھی تو ایک سادہ آرام دہ زندگی زہد و قناعت کے ساتھ مذہبی جھنڈے کے سائے تلے گذار سکتا ہے، اگر مذہبی نہیں ہے تو روتے سسکتے گذارتا ہے۔

پیسے والے انسان کیلئے شاید مذہب مادّی ترقی میں اتنا دخیل نہ ہو مگر اس نظریئے کے تحت کہ مادّی زندگی موت کے بعد کی زندگی کا مقدمہ ہے، یہاں بویا وہاں کاٹا جاتا ہے وغیرہ، مذہب ایک جامع تصور و نظامِ مادّی کی کامیابی کا مکمل ضابطہ ہے۔

مذہبی ہدایات کے مطابق اور عقلی اثبات بھی ان درج بالا "بنیادی" نظاموں کی اہمیت واضح کر دیتے ہیں۔ اگر انسان معاشی تگ و دو میں ہے اور رزق روزی کے کمانے میں مشغول ہے اور سیاسی حالات و مسائل سے واقف نہیں اور دلچسپی نہیں لیتا، جب کہ سیاسی حالات و واقعات کے اثرات معاشی پالیسیز پر بھی پڑتے ہیں، تو کسی سیاسی حادثہ یا سانحہ کے نتیجے میں، کسی سنجیدہ پریشانی سے دوچار ہو سکتا ہے۔ سیاسی تحولات و تبدیلیاں جس سے معاشی سسٹم پر اثرات پڑیں اور منافع بھی متاثر ہو رہے ہوں تو اگر ایسا شخص سیاسی حوالے سے update ہو تو اپنے لئے لائحہ عمل بنالیتا ہے۔ یہ ایک مثال ہے،

دوسری مثال یہ ہے کہ تعلیم معاشی ترقی میں بہت "بنیادی" اہمیت رکھتی ہے نیز سماجی زندگی کا بھی شعور دیتی ہے، فنی تعلیم خصوصاً انسان کی معاشی زندگی میں بہت "بنیادی"

اہمیت رکھتی ہے۔ اگر انسان ابتدائے زندگی میں فنی علوم حاصل نہیں کرتا یا اس کے پاس کوئی فنی مہارت نہ ہو تو مستقبل کی معاشی زندگی بہت سخت ہو جاتی ہے۔

تیسری مثال: گاڑی کے اہم اور غیر اہم پرزے اور حصے ہوتے ہیں، اہم حصے اگر درست کام نہ کریں تو گاڑی نہیں چل سکتی جیسے کہ انجن، ٹرانسمیشن، ڈرائیو ٹرین، پہیے اور ٹائر، بریک، سٹیئرنگ سسٹم، سسپنشن سسٹم، برقی نظام وغیرہ کچھ غیر اہم پرزے اور حصے بھی ہوتے ہیں جیسے کہ ہب کیپس، اینٹینا، کپ ہولڈرز، کارمیٹ، ایئر فینشنر، سیٹ کوور، ڈورلاک، وغیرہ

اہم پرزے وہ بنیادی رکن ہیں جن کے بغیر گاڑی کا مقصد باقی نہیں بچتا اسی طرح غیر اہم حصے وہ ہیں جن کے بغیر بھی گاڑی چل سکتی ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کر سکتی ہے جس کیلئے اسے تخلیق کیا گیا ہے۔

اسی طرح اگر انسان صرف وصرف معاشی زندگی کی بہتری کیلئے سیاسی نظام اور فنی تعلیم سے رابطہ رکھے اور مذہبی زندگی کو اہمیت نہ دے یا مذہب کو انفرادی ہی سطح پر عملی نہ کرے تو اس کی آخرت میں کامیابی کی گارنٹی کم رہ جاتی ہے، یا جیسے تجربہ بتاتا ہے کہ اگر مذہب کی سماجی وسیاسی و معاشی یا ثقافتی تعلیمات کو اہمیت نہ دے تو ایسا آدمی دقیق مادّی امور کو بھی منظم نہیں کر پاتا۔

بہت ہی سطحی ذہن رکھنے والے افراد کے مطابق جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مذہب صرف انسان کی روحانی اور انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اور سماجی امور (جو کہ بالائی سطور میں بطور معاشرتی نظام بیان کیے گئے) سے لاتعلق ہے، اور اس سطحی تعریف کے ساتھ بھی

اگر مادّی ترقی اور اُخروی ترقی وروحانی ترقی کو الگ الگ تصور کریں تب بھی دنیاوی ترقی کے کچھ شعبے "بنیادی"ہیں جن کے بغیر ترقی ناممکن ہے، اسی طرح روحانی زندگی کے بھی کچھ "بنیادی شعبے"ہیں جن پر توجہ مذہبی، اُخروی یاروحانی ترقی کیلیئے اولویت کی حامل ہیں۔

انسان اور گروہ و قبیلوں میں بھی کچھ امور "بنیادی اہمیت" کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی انسان میں نہ تو مکمل اچھائیاں ہوتی ہیں اور نہ ہی مکمل برائیاں، ملی جلی صفات کا حامل ہونا انسانی فطرت کا حصہ ہے،

بات جو اہم ہے وہ یہ کہ ترقی کیلیئے جب تک "بنیادی عقائد اور اصول " کو اہمیت دے کر انہیں روبعمل نہیں لایا جائے گا ترقی ناممکن ہے، اسی طرح مذہبی زندگی بھی کچھ ایسے "بنیادی عقائد و اصولوں" سے مرقع ہے جن پر عمل انسان کی کامیابی و ترقی کا دار ومدار ہے۔

بظاہر کوئی بہت اچھی جسامت کا مالک ہو مگر اس کا دل و دماغ بیمار ہو تو ان "بنیادی اعضاء" کی بیماری کے ساتھ اس شخص کی زندگی بہت مختصر ہو جاتی ہے، ہاتھ، پیر سلامت نہیں، سر پر بال نہیں، آنکھوں میں بینائی نہیں یا زبان میں گویائی نہیں۔۔۔ معاملہ چل جاتا ہے مگر دل و دماغ کے بغیر کچھ نہیں چل سکتا،

اسی طرح کچھ "بنیادی شعبے "مادّی زندگی اور سماجی و معاشرتی جسم میں بھی ہوتے ہیں، جن کی ترقی کیلیئے دین کی تعلیمات پیش کی گئیں اور اسی طرح ایسے "بنیادی شعبوں "میں مرض کا لگ جانا ایسا ہی خطرناک ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔خواہ ظاہر بظاہر معاشرہ چمک دمک، اور آسائشوں اور خوشیوں سے بھرپور ہو، مگر جس طرح ہارٹ اٹیک یا برین ہیمبرج بھی بلاوجہ یا کسی سبب کے بنا وقوع پذیر نہیں ہوتے بلکہ اس کے پیچھے گذری زندگی

میں انجام دی گئی بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور تدریجاً بڑھتے بڑھتے ایک خاص وقت پر یہ بے اعتدالیاں اپنے نتائج دکھاتی ہیں، اسی طرح سماج کے دل و دماغ بھی اگر کرپٹ ہوجائیں، مریض ہوجائیں تو اپنے وجود کے حجم کی مناسبت سے ایک خاص وقت پر علاج کی ضرورت رکھتے ہیں اور اگر علاج نہ کیا جائے تو ایسی اقوام تاریخ کیلئے درس عبرت کا نمونہ بن کر معدوم ہوجاتی ہیں۔

دین نے بھی سیاست و حکومت کو "بنیادی ترین سماجی شعبہ" اور اس پر ایمان اور اس کے مطابق عمل کو بنیادی عقیدہ قرار دیا ہے لہذا "امامت و ولایت" کو تمام دینی امور میں فوقیت حاصل ہے، ولی خدا، اسلامی معاشرے کا حاکم (جو خدا کی طرف سے منتخب شدہ ہو) ایسا عقیدہ ہے کہ اگر اس پر ایمان نہ رکھا جائے اور ایمان کے بعد اس امام کی نصرت نہ کی جائے تو تمام عبادات بے کار اور عبث چلی جاتی ہیں کیونکہ "امام ہی وہ مرکزی اکائی" ہوتا ہے جو پورے سسٹم و نظام کا آپریٹر ہوتا ہے، جس طرح نہ بغیر ڈرائیور کے گاڑی چلتی ہے، نہ کوئی الیکٹرک ڈیوائس بغیر آئی سی کے چلتی ہے یا جس طرح ہر وجود کے ایٹم و مالیکیول کا نیوکلیئس وہ "امام" ہی ہوتا ہے جو باقی متعلقات کی جان ہوتا ہے۔

یعنی کہ ممکن ہے کہ ایک شخص بہت نمازی، پرہیز گار، حاجی، روزہ دار، صدقہ خیرات کرنے والا، سماجی فلاح میں بے حد کوشش و جستجو کرنے والا ہو، بہت بڑی بڑی یونیورسٹیز کی ڈگریز اور اساتذہ کی طرف سے اسناد کا حامل ہو وغیرہ وغیرہ اور اس کا نظام امامت پر یا زمانے کے امام پر عقیدہ مضبوط نہ ہو کہ اس کی نصرت کے ذریعے سماجی فلاح اور نیکیوں اور اچھائیوں کے مرکز کو مضبوط کرے تو ایسا ایمان اور ایسی ترقی سب رائگاں چلی جاتی ہے،

جس طرح معاشرتی روابط میں بھی دل و دماغ کے احساسات و افکار اگر مثبت ہوں، تعمیری ہوں، تخلیقی ہوں تو انسان کا اندھا ہونا، لنگڑا ہونا وغیرہ انسان کی سماجی فضیلت پر داغ نہیں لگا سکتا، لیکن اگر بہت ہنڈسم انسان ہو، بہت مضبوط جسم کا باڈی بلڈر بھی ہو خوبصورت چمڑی اور جسامت بھی رکھتا ہو مگر دل و دماغ میں منفی، تخریبی احساسات و افکار موجود ہوں تو ایسے شخص کی خوبصورتی کسی کام کی نہیں ۔۔۔۔کیونکہ دل و دماغ سب سے "اہم اور مرکزی حصہ "ہوتے ہیں جس پر انسان کے فضائل ورذائل کی بنیاد ہوتی ہے۔

لہذا ہر اچھائی جو قابل تقلید و تعریف سمجھ کر کلّی طور پر بافضیلت ہونے کا اعلان کیا جارہا ہو تو اس موقع پر یہ دیکھنا چاہیے کہ "بنیادی فعل" درست ہے کہ نہیں۔۔۔!!

"بنیادی عقیدہ اور بنیادی شعبہ "یا" سماجی جسم کے بنیادی حصہ" میں کیسی دلچسپی اور کس طرح کی مداخلت ہے؟!

ایک عام آدمی کا گناہ اور غلطی، خواص کے گناہ و غلطی سے بہت فرق رکھتی ہے۔

اسی طرح "بنیادی اور خصوصی شعبوں" میں کوتاہی اور دیگر عام شعبوں میں کرپشن بھی فرق رکھتی ہے۔۔۔!!

انسانیت اور اعلیٰ تہذیب کے دعوے کرنے مگر عمل میں دہشت گردی، ناامنی اور انسان سوز اخلاقیات ،بہت فرق کرتی ہیں۔

یہ مذہبی معیار بھی ہے اور خالص دنیادار حلقوں کا بھی ایسا ہی معیار ہے۔

اس معیار کے ہوتے ہوئے نہ کوئی پورا صحیح ہے نہ پورا غلط نیز "بنیادی اور خاص شعبہ جات" جن پر دیگر متعلقہ سسٹم کے ارکان کا انحصار ہے، اُن کے صحیح ہونے اور غلط نہ ہونے کی فکر

کرنی چاہیے اور اسی بنیادی شعبے، عقیدے یا صفت کے تناظر میں کسی معاشرے یا شخص کی اچھائی یا برائی کو پرکھنا چاہیے۔

البتہ ایک اہم بات جو ہمیشہ ذہن میں رہنا ضروری ہے وہ یہ کہ حکمت کسی کی میراث نہیں۔۔۔ صرف اس کی میراث ہے جس نے عقلی اور عملی مشقوں سے خود کو اس قابل بنالیا ہے کہ حکمت اس کے قلب کو مزید نورانی کر دیتی ہے، خواہ وہ کوئی عام آدمی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ کوئی موچی یا کوئی نانبائی یا کوئی حجام وغیرہ البتہ پڑھے لکھوں میں بھی حکمت کی وراثت پانے کا یہی معیار ہے کہ جس نے عقلی اور عملی مشقوں سے خود کو اس قابل بنایا ہے، اس کی بات سنی جائے اور عمل کیا جائے، پرہیز گاری کے لبادے میں ابوجہل اور بظاہر پست لباس میں علامہ اسی کو نظر آتا ہے جو خود باعمل ہوتا ہے۔۔۔ لہذا کبھی یہ نہ دیکھیں کہ کون بول رہا ہے بلکہ یہ دیکھیں کہ کیا کہہ رہا ہے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: "حکمت حاصل کرو، خواہ منافق سے ہی کیوں نہ لینی پڑے۔" ایک علمی شغف رکھنے والے کیلئے یہ اہم نہیں ہوتا کہ فلاں شخص تو منحرف ہے، گمراہ ہے اس کی بات نہ سنی جائے یا فلاں شخص بہت بڑا آیت اللہ ہے لہذا اس کی ہر بات قبول کرلی جائے بلکہ وہ اپنے تجربے اور اپنی عقلی اور عملی مشقوں کے تناظر میں پرکھتا ہے، جس موضوع پر بات ہو رہی ہے اس کو عقل سلیم کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے بجائے اس کے کہ اس شخص کی دوسری صفات اور کردار کو کھنگالنا شروع کر دیا جائے اور آباءواجداد کی کردار کا آپریشن کرنے لگیں۔

نقد و اعتراض ہمیں اپنے آپ پر کرنے والوں کو خوش آمدید کہنا چاہیے نہ کہ دوسروں پر۔۔۔ نقاد ہمارا مصلح ہے، آداب و تہذیب کے دائرے میں نقد کامیابی کی چابی ہے۔ نقاد ہمیں آئینہ دکھاتا ہے۔ آئینہ سے دشمنی عقلمندانہ اقدام نہیں ہوتا۔ غلطیوں کے باوجود

ڈھٹائی دکھانا متکبر شخص کی نشانی ہوتی ہے اور یہ عمل خداوند کریم کو سخت ناپسند ہے قرآن کریم میں اس کو استکبار اور طاغوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اکثر اندرونِ مکتب اور inhouse کوئی نقد کرتا ہے تو وہ عموماً اصلاح کی نیت کے حامل ہوتے ہیں لہذا ایسے نقد کو بجائے سنجیدہ لینے کے اگر کوئی ایسے نقاد کی دیگر صفات اور کرداری خامیوں کو رگیدنا شروع کرے تو سمجھ لیں کہ اس کے پاس حقیقت کی تلاش کی جستجو نہیں ہے بلکہ یہ طاغوتی صفت کا حامل ہوگیا ہے۔ لہذا ایسے کردار جو خود پر حقیقی نقد کو براشت کرنے کا حوصلہ نہ رکھیں، ان کے مستقبل میں کامیابی کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔

قوانینِ اسباب و علل کے تقاضے

(ماخوذ-اضافہ جات کے ساتھ)

ہم مسلمان خوفناک حد تک ذہنی' نفسیاتی اور روحانی مغالطے کا شکار ہیں' ہم پوری زندگی روحانی و آسمانی معجزوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور اس انتظار میں یہ تک فراموش کر بیٹھتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے' وہ اپنے عصا سے سمندر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے لیکن وہ بھی اپنی امت کے لیے عالم اسباب کے تقاضے نرم نہ کر سکے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے لیکن وہ اور ان کے ساتھی رومن ایمپائر کے اسباب کا مقابلہ نہ کر سکے اور نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ کے آخری اور محبوب ترین نبی ہیں لیکن انھیں بھی عالم اسباب میں تلوار' گھوڑے' زرہ بکتر' اونٹ' پانی' خوراک اور لباس کا بندوبست کرنا پڑا۔ یہ بھی اپنا دفاع کرتے رہے' یہ بھی جنگیں لڑتے رہے اور یہ بھی پیٹ پر دو دو پتھر باندھتے رہے' انھیں بھی ساتھیوں' دوستوں' بھائیوں' ہجرتوں' معاہدوں اور معاش کی ضرورت پڑتی رہی' یہ بھی تجارت فرماتے رہے اور یہ بھی اپنے گھر آباد کرتے رہے. آپ کسی دن فرقے اور مسلک کی عینک اتار کر سیرت کا مطالعہ کیجیے' آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے. آپؐ نے پوری زندگی نہ کمزور تلوار خریدی اور نہ ہی بیمار گھوڑے اور لاغر اونٹ پر سفر کیا' آپؐ نے لباس بھی ہمیشہ صاف' ستھرا اور بے داغ پہنا اور رہائش کے لیے شہر بھی معتدل' پر

فضا اور مرکزی پسند کیا‘ آپؐ نے زندگی بھر عالم اسباب میں اسباب کا پورا خیال رکھا‘ اچھا کھانا کھایا‘ اچھا پھل پسند فرمایا‘ اچھی جگہ اور اچھے لوگ پسند کیے‘ آپ غور کیجیے عرب حملہ آوروں سے مقابلے کے لیے شہروں سے زیادہ دور نہیں جاتے تھے لیکن آپؐ جنگ بدر کے موقع پر مدینہ سے 156 کلو میٹر دور بدر کے میدان میں خیمہ زن ہوئے‘ آپؐ غزوہ احد کے موقع پر بھی احد کے پہاڑ پر چلے گئے۔

آپؐ نے عربوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مدینہ کے گرد خندق بھی کھودی اور آپؐ نے کافروں سے مقابلے کے لیے یہودیوں کے ساتھ معاہدے بھی کیے‘ یہ کیا تھا؟ یہ عالم اسباب میں اسباب کی بہترین مثالیں ہیں‘ نبی اکرمؐ چند سیکنڈ میں معراج سے مستفید ہو گئے‘ وہ واپس آئے تو دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی‘ آپؐ نے انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے بھی کر دیے لیکن آپؐ جب عالم اسباب میں واپس آئے تو آپؐ کا دندان مبارک بھی شہید ہوا‘ آپؐ طائف میں زخمی بھی ہوئے‘ آپ کو بھوک‘ پیاس‘ گرمی‘ سردی اور خوف بھی محسوس ہوتا رہا‘ آپؐ کی چھت بھی ٹپکتی رہی‘ آپؐ بیمار بھی ہوئے‘ آپؐ پر زہر کا اثر بھی ہوا۔ آپؐ جادو کے اثر سے نکلنے کا بندوبست بھی کرتے رہے اور آپؐ غربت اور بیماری سے پناہ بھی مانگتے رہے‘ یہ عالم اسباب کے وہ سبب ہیں جن سے کوئی ذی روح آزاد نہیں ہو سکتا. آپ اگر وجود رکھتے ہیں‘ آپ کی گردن پر اگر سر موجود ہے اور آپ اگر سانس لے رہے ہیں تو پھر آپ نبی ہوں‘ ولی ہوں یا پھر عام انسان ہوں آپ عالم اسباب کے تمام اسباب کے محتاج ہیں۔

آپ پھر والدہ کی قبر پر آنسو بھی بہائیں گے اور آپ کو پھر اچھی تلواروں' اچھے گھوڑوں' اچھے اونٹوں اور ٹرینڈ فوج کی ضرورت بھی پڑے گی' آپ کو پھر شفاف پانی' اچھی خوراک' طاقتور قانون' تیز رفتار انصاف' ماہر ڈاکٹرز' معیاری تعلیم' رواں سڑک کی ضرورت بھی ہو گی اور آپ کو پھر سردی' گرمی اور وباء تینوں کا مناسب بندوبست بھی کرنا پڑے گا. ہم اگر عالم اسباب میں ہیں تو پھر ہمیں اسباب کا انتظام کرنا ہو گا، ان سب مادّی اسباب کے ساتھ روحانی اور غیبی اسباب بھی ہیں۔۔۔ مگر وہ اسی وقت فعال ہوتے ہیں جب ہم مادّی اسباب کی قلت کے ساتھ ہی عمل شروع کر دیتے ہیں۔

ہمیں ایسی دوائیں بھی ایجاد کرنا ہوں گے جو امت مسلماں کو صحت مند رکھ سکیں، ہمیں ایسی ٹیکنالوجی بھی ایجاد کرنا ہو گی جو سردی میں گرمی اور گرمی میں سردی پیدا کر سکے' ہمیں انسانوں کے سکون اور آرام کا بندوبست بھی کرنا ہو گا' ہمیں کرہ ارض پر دم توڑتی حیات کا خیال بھی رکھنا ہو گا' ہمیں دنیا کو ماحولیاتی آلودگی سے بھی بچانا ہو گا' ہمیں مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے تحفظ بھی دینا ہو گا اور ہمیں یہ بھی ثابت کرنا ہو گا مومن اسباب کی دنیا میں بھی دنیا کو اپنے برابر نہیں آنے دیتا. ہم محمدی ہیں اور قینچی ہو یا راکٹ ہو ہم کسی بھی فیلڈ میں دنیا کو آگے نہیں نکلنے دیں گے۔

ہم کیسے مسلمان ہیں' ہمیں اللہ تعالیٰ نے اسباب کی دنیا میں بھیجا لیکن ہم اسباب ہی سے منہ موڑ کر بیٹھ گئے' * اس امت کو کون بتائے گا انسان اس عالم اسباب میں سبب کے بغیر بے سبب ہو جاتا ہے اور بے سبب لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں مار کھا جاتے ہیں*' آپ کو

یقین نہ آئے تو آپ کشمیر، انڈیا اور برما کے مسلمانوں کو دیکھ لیجیے' یہ لوگ اگر عالم اسباب میں اسباب کے مالک ہوتے تو کیا دنیا ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھتی؟ خدا کے لیے! آپ مسلمان ہو تو آپ عالم اسباب کو عالم اسباب مان کر اسباب کا بندوبست کرو' ورنہ دنیا آپ سے جینے کا حق تک چھین لے گی۔ اسی عالم اسباب میں امت اور قوم و گروہ کی امامت اور لیڈر شپ بھی ہے اور محنت و کوشش برائے رزق بھی ہے, مبتذلات سے دوری بھی کامیابی کا ایک سبب ہے, لہو لعب سے دور بھی یعنی بے وقت و بے جگہ کوئی کام انجام دینا جیسے فجر کے وقت ظہر پڑھنا یا قیام وقت سجدہ کرنا یا باتھ روم میں کھانا کھانا وغیرہ عمل کو ضایع کرنے وقت اور جگہ کے غلط استعمال کرنے میں آئیں گے اور منزل پر پہنچنے میں ناکامی کا بھی سبب ہیں نیز اسباب کی فراہمی کیلئے جدوجہد کوشش کے ساتھ توکل علی اللہ, دعا, توسل کی نفسیاتی قوت, دانش اور طاقت کی محدود قوت سے آگے عالم غیب کو بھی وہی اہمیت حاصل ہے جو ہاتھ پیر ہلانے کی ہے۔۔۔ اس ہاتھ پیر دماغ ہلانے کی حد کیا اور کہاں تک ہے؟ اس حد و سرحد کی شناخت کیلئے, اپنے کسی بھی عمل کیلئے اپنی ہمت و طاقت کو ناپنے کا صرف ایک ہی وسیلہ ہے اور وہ یہ کہ اپنی ہمتوں اور قوتوں کو کم از کم تین سے چار دفعہ اپنی آخری انتہا تک تجربہ کرنا چاہیے۔

استعداد و ہمت کی انتہا (EXTREME POTENTIAL) کو ناپنے کا اس کے علاوہ کوئی آلہ و وسیلہ نہیں کیونکہ ہر انسان کے حالات و امکانات مختلف ہوتے ہیں لہذا کسی دوسرے کے تجربہ کو ہر دفعہ کسی دوسرے کیلئے قیاس کرنا اور دوسرے پر منطبق کرنا

درست نہیں ہوتا۔ فلاں نے ایسے کرلیا تھا، فلاں تو یوں کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ نئے اصول ابتداء میں سخت لگتے ہیں مگر وقت گذرنے کے ساتھ سہل ہوجاتے ہیں اور "عادت" بن جاتے ہیں لہٰذا احد و دِعافیت (COMFORT ZONE) کو وقت کے ساتھ ساتھ وسعت دیتے رہنا چاہیے۔ ممکن تو یہ ہے کہ پرانی مثالوں سے آگے جایا جائے اور انسان پرانے اصولوں اور تجربوں کو نئے انداز میں نئے طریق سے انجام دے اور تجربہ کرے۔ پرانا اصول فائدہ نہیں دے رہا تو کیوں نہیں دے رہا لہٰذا نئے وسائل اور نئی امنگ کے ساتھ نیا تجربہ کریں اور نئے اصول تخلیق کریں۔

کائنات میں کچھ اصول مستقل یعنی غیر متغیر تبدیل نہ ہونے والے ہوتے ہیں اور کچھ اصول غیر متغیر ہوتے ہیں۔ یہاں فطرت کا کوئی جبر نہیں ہوتا بلکہ انسان مکمل مختار ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کو جہنم میں جھونک دے یا ہمت و حوصلہ سے مشکلات پریشانیوں اور گناہوں کے اثرات سے نکل جائے۔

یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ہم اُس وقت تک یہ نہیں جانچ سکتے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں اور کیا نہیں، کیا ہمارے بس میں ہے اور کیا نہیں جب تک ہم اپنی حدودعافیت سے نکل کر اپنی ہمتوں کو آخری انتہا تک تجربہ نہ کرلیں۔

خدا پسند زندگی میں خدا پسند اہداف کے حصول اور کامیابی کے سفر میں۔۔۔

مشکلات، پریشانیاں، مصیبتیں، بلائیں۔۔۔

مادّی اور روحانی (نفسیاتی) شعبوں میں تین طرح کی ہوتی ہیں:

1۔ خدا کی طرف سے ارتقائی مراحل کا لازمی جز ہیں جو ہر نئے مرحلے میں انسان کیلئے موجود ہوتی ہیں، نیز بعض اوقات اور بعض جگہیں یا بعض ذہنی ساختیں فطری اور قدرتی طور پر مشکلات آور ہوتی ہیں۔ جیسے کربلا کی سرزمین جس پر ہر نبی علیہ السلام اور ہر ولی علیہ السلام کو صعوبتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

2۔ افراط و تفریط، کاہلی، سستی، آرام طلبی، عیش کوشی، راحت طلبی، عافیت طلبی، حد سے نکل جانے، توازن برقرار نہ رکھنے کے نتیجے میں ہمارے اپنے ہاتھوں / اعمال کی پیدا کردہ۔
3۔ مومن کی خدا کے عطا کردہ وسائل سے غفلت اور بے بصیرتی / اپنے اور دشمن کے بارے میں حد سے زیادہ خوش فہمی, بد گمانی یا پھر دوستوں, خیر خواہوں سے تعصب اور حسد اور بد گمانی یا خوش فہمی کے نتیجے میں مشترکہ دشمنوں، حاسدوں کی طرف سے منصوبہ بندی کے تحت پیدا کی گئی مصیبتیں و مسائل۔

ان مصیبتوں کے حل کیلئے ہمیں۔۔۔

1۔ عظیم صبر و استقامت، کثرت سے دعاوتوسل, کثرت سے گریہ و استغفار

2۔ ہوشیاری اور زیرکی، متوازن عمل

3۔ کثرت حصول علم کی کوشش، علماء اور دانشمندوں سے مشورہ، محنت، ہمت، جانفشانی، تدبیر، تفکر وتعقل، نہ تھکنے والا بھرپور بروقت وفوری عمل وجدوجہد انجام دیناچاہیے۔۔۔۔

یہ سب عالم اسباب کے لوازمات ہیں۔۔۔

▪ مشکلات کی پہلی قسم دراصل مشکل نہیں بلکہ یہ کائنات کے الٰہی قوانین کے تحت پیش آنے والے واقعات ہوتے ہیں جس سے انسان آشنا نہ ہو تو اسے یہ مشکل لگتی ہے عذاب لگتا ہے۔ جبکہ آزمائش کے اس مرحلے پر صرف صبر وبرداشت اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے، اور دعاوتوسل کی۔ اپنے وقت پر یہ خود بخود خداوند تعالیٰ کے لطف وکرم کے قانون کے تحت آسانی میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

▪ البتہ بقیہ دو مشکلات حقیقتاً مشکل ہوتی ہیں جس میں سراسر قصور خود ہمارااپنا ہو تا ہے لہذا اس میں اگر فرد تنہا گرفتار ہے تو سب سے پہلے خود اُس کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ کثرت سے گریہ واستغفار کرے اور مشکلات سے نکلنے کی عملی کوشش و تدابیر اختیار کرے۔ البتہ اردگرد کے افراد پر بھی لازم ہے کہ اپنے دینی بھائی کے ساتھ مشکل سے نکلنے میں تعاون کریں اور اگر مشترکہ الہی اور خدائی اہداف رکھنے والا کوئی ایک گروہ یا طبقہ یا پورا معاشرہ گرفتار ہے تو سب ایک دوسرے کی مدد وتعاون سے جدوجہد کریں۔

پروردگارعالم سے دعا ہے کہ ہماری مشکلات وپریشانیوں اور آزمائشوں میں ہماری کمرہمت و قوت کو مضبوط بنادے اور ہمیں اسلام پر عمل کرنے کے توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

ہمارے مولا و آقا حضرت امامِ زمانہ (عج) کی نصرت کیلئے ہمیں اُس زندگی سے آشنا فرمادے جس کی ہمیں اپنے مولا کے ساتھ ضرورت ہو۔ آمین یارب العالمین

روایت یا درایت

کسی کی بھی کوئی نصیحت، مشورہ یا حکم ہر ایک کیلئے نہیں ہوتا، ہر شخص اپنے عمل کیلئے علم حاصل کرنے کا از خود مکلف ہے۔۔۔ کوئی کسی کو دقیقاً نہیں بتا سکتا کہ اس کیلئے کیا اچھا کیا برا ہے۔ قرآن حدیث بھی اس اصول سے مبرا نہیں ہیں، البتہ ان منابع میں واضح کلیاتی اصول ہیں اور ہر شخص اپنے لئے جزئیات میں جا کر دقیقاً استنباط کا از خود مکلف ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:"علم کو درایت سے سمجھو نہ کہ روایت سے۔" ایک اور جگہ فرماتے ہیں:"علم میں درایت کرنے والے کتنے کم ہیں۔"

قرآن کریم بھی روایتِ ہے، حدیث ہے۔

روایت سے مراد۔۔۔ نقل کرنا، کاپی کرنا، من و عن انہی الفاظ کے ساتھ ابلاغ جیسا سنا، دیکھا یا پڑھا ہے۔

درایت کی آسان لفظوں میں تعریف کی جائے تو یہ ہے کہ علم کو سائنٹفک انداز سے سمجھنا، یعنی منطق، فلسفہ اور تجربہ کی بنیاد پر۔۔۔ جس معیار کو سائنس و عقل تسلیم کرتی ہے۔ زمان و مکان اور شخصی خصوصیات ہر جگہ ہر وقت ہر ایک کے ساتھ ایک جیسی نہیں ہوتیں۔۔۔۔

لہذا تمام انسانوں کیلیئے، تمام اوقات میں، ہر جگہ پر ایک ہی جیسی بات یا حکم نہیں ہو سکتا۔۔۔۔

کلی طور پر تو کوئی حکم، مشورہ، فیصلہ، ارادہ سب کیلیئے تو ہو سکتا جیسے نماز سب پر واجب ہے، ہر وقت پر اور ہر جگہ پر، مگر۔۔۔ جب بھی انسان کی فردی اور شخصی حالات و کیفیات تبدیل ہو نگی تو حکم کی جز ئیات بھی جدا ہوں ہوتی ہیں۔

تقدس، عشق، غیب کی کوئی حدِ آخر نہیں۔۔۔ علم بڑھنے کے ساتھ تقدس معرفت میں، عشق حقیقت میں اور غیب شہود میں تبدیل ہوتے رہنا ایک مستقل فطری سلسلہ ہے، جس کی کوئی حد نہیں۔ معروضات پر سائنٹفک انداز سے تجربہ اور غور وفکر کے بعد علم کو انسان کی فلاح کی خاطر برتنا ضروری ہے۔

حدیثِ قرآن و حدیثِ معصومین علیہم السلام کو جس کا محور انسان اور انسان سے مربوط اُس کی روحانی و مادّی، دنیاوی و اُخروی ضروریات ہیں، جدید علمی و سائنٹفک انداز میں سمجھنا ہی افادیت کا باعث ہے۔ انسان اور انسانی سماج جو کہ اسلامی احکامات کا مرکز و محور ہے، جدید دور کی علمی تقسیم کے مطابق، علمی شعبوں کا بھی مرکز و محور ہونا چاہیے۔ خود انسان کا محور ابدی فلاح و نفسِ مطمئنہ کا حصول ہونا چاہیے۔ علم و حکمت و عرفان کیلیئے جس سائنٹفک اصولوں کا ذکر کیا گیا اُسی میں ایک بدیہی امر تقوا اور پرہیز گاری بھی ہے، یعنی اہداف تک پہنچنے میں رکاوٹ بننے والے مقاصد سے مطابقت نہ رکھنے والے اعمال و افکار و خیالات و احساسات سے خود کو دور رکھنا، تقوے اور پرہیز گاری کے بنا معلومات تو اکھٹے کیے جاسکتے

ہیں، دماغ کو انسائیکلو پیڈیا تو بنایا جاسکتا ہے مگر سائنٹفک فیصلے جس کو حکیمانہ فیصلے کہتے ہیں، نہیں کیے جاسکتے، حق و باطل میں جدائی نہیں کی جاسکتی، غلط و صحیح کے معیارات متعین نہیں کیے جاسکتے۔

یعنی انسان تقلیدی تو بن سکتا ہے، مجتہد و محقق نہیں بن سکتا۔ یہ ایک ایسا وسیلہ ہے جس کو جاننا اور اس کی حساسیت کو سمجھنا ہر صاحب بصیرت کیلئے ضروری ہوتا ہے۔

کسی موضوع پر ہزار حدیث اور درجن بھر آیات جمع کرلینا آسان ہے، مگر ان روایات و آیات کو زمانے کے تقاضوں یا ضرورت کی اہمیت سے مربوط کرنا، جدید مسائل کے حل تلاش کرنا بغیر سائنٹفک انداز کے تدبر اور غور و فکر و تجربہ کے ممکن نہیں۔

یہ دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے!!

سائنس اور مذہب کا جعلی جھگڑا کھڑا کر کے دونوں طرف مفاد پرستی اور دنیا پرستی کو فروغ دیا جارہا ہے۔ جب کہ حقیقت ان دونوں بیانیوں کے مختلف ہے۔ سائنس تحقیق کا ایسا طریقہ کار ہے جو صرف قوانین قدرت و فطرت کو کشف کرتا ہے، قوانین کو تخلیق نہیں کرتا ہے۔ اسی قوانین کی بنیاد پر میکینکس، انجینیرنگ یا دوسرے طبیعی و روحانی و نفسیاتی علوم کی کتابیں تیار کی جاتی ہیں، فلسفی نظریات دیئے جاتے ہیں۔ انہی قدرتی قوانین کو جو تمام عالم کائنات میں ابتدائے آفرینش سے جاری و ساری ہیں کشف کرنے کے بعد انہی کے فارمولے کی بنیاد پر انسان اپنی تخلیقی صلاحیت سے ٹیکنالوجی تیار کرتا ہے۔

ابتداً یہ کشفی کام (غور و فکر، تفکر و تدبر، تحقیق) مسلمانوں نے انجام دیا بعد میں جب مسلمان سماج نفس پرستی، دنیا پرستی، عیش کوشی، آرام طلبی اور غیر سنجیدگی میں مست ہوگئے تو یہ کام مغرب کے رسمی مذاہب سے متنفر بظاہر ملحد افراد نے انجام دیا۔ انہوں نے " میں خود سب کر سکتا ہوں " کے مقولے پر عمل پیرا ہو کر خود اعتمادی کے بدلے خدا پرستی کو فراموش کر دیا۔ مسلمانوں نے بھی خود کو مقدس اور بخش دیئے جانے کے بے سر و پا عقیدے کے تحت دنیا کا انتظام و انصرام ترک کر دیا کہ سب کچھ خدا کرتا اور مسلمان چونکہ اُس کے حبیب

صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں تو خدا سب کچھ خود کرے گا، جو کہ قرآن کریم کے منشور کے سراسر برخلاف شیطانی نظریہ ہے۔ جب کہ حدیث رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہے کہ: "دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے۔" جو کرنا ہے اسی دنیا میں کرنا ہے آخرت تو صرف نتیجے کا مرحلہ ہے۔

"اور یہ کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔" (قرآن کریم 53:39)

"اللہ کبھی اس نعمت کو تبدیل نہیں کرتا جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہے جب تک وہ خود اپنی حالت تبدیل نہ کر دیں اللہ بڑا سننے والا، بڑا جاننے والا ہے۔" (قرآن کریم 8:53) جو محنت کرے گا تو اسی کو پھل بھی ملے گا۔ یہی آزمائش اور امتحان ہے اور اسی کی بنیاد پر جنت (اچھے مستقبل) اور دوزخ (ناکام زندگی) کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

دنیاوی انتظام و انصرام کا مقصد ہی کمزوروں کو ہمت دینا، مساکین کی پرورش، اور مستضعفین کی مدد کرنا ہے، آسانیاں فراہم کرنا ہے چاہے وہ سیاست و حکومت کے قیام کا مرحلہ ہو، علمی تحقیق و جدوجہد سے مربوط ہو، معاشی سرگرمیوں اور تہذیبی رویوں میں نکھار کا موقع ہو۔ انسانی نیت اگر مخلوق خدا کی خدمت سے مربوط ہے اور دنیا پرست افعال یعنی استعماری و استثماری مقاصد نہیں رکھتی تو سائنس بھی فائدہ مند ہے اور مذہب بھی۔

لیکن اگر مذہب یا سائنس فلسفے کے معتقدوں کے پاس انسانی مسرتوں کے صرف دعوے ہیں تو نہ مذہب آخرت میں فائدہ مند ہے اور نہ ہی علم و دانش۔ اگر انسان چند سو سال علمی محنت و تحقیق یا ریاضت و سلوک کی بنیاد پر خود کو ہی کچھ سمجھنے لگے تو یہ فکر انسان کو خدا سے دور کر کے شیطان پرست بنا دیتی ہے۔

انسانی نفسیات پر کسی SUPER NATURAL HUMAN AGENCY پر اعتقاد رکھنا فطری طور پر واجب ہے لہذا اگر انسان خدا پرست نہیں ہے تو پھر وہ شیطان پرست ہے۔ شیطان انسان کو دنیا میں بھی ناکام کرتا ہے اور آخرت میں بھی رسوا کرتا ہے۔ عالم کائنات میں کوئی بھی چیز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے، نہ ہی علم عمل سے، نہ سائنس مذہب سے، نہ مادّہ روحانیت سے، نہ مشرق مغرب سے اور نہ ہی خدا خلقت سے وغیرہ۔ ہر وجود ایک دوسرے سے مربوط ہے، کہیں واضع اور ظاہر ہے کہیں دقت نظری کی ضرورت ہے۔ لہذا خواہ علوم کی ترویج کا موقع ہو، عمل کے میدان ہوں سب میں ہم آہنگی اور یکجہتی کی ضرورت ہے۔

"بس تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرو۔" (قرآن کریم 5:48) تفرقہ کی فکر ہی شیطانی ہے جس کے پیچھے دنیا پرستی، نفس پرستی، عیش کوشی، آرام طلبی، ناجائز منفعت اندوزی کی صفات پوشیدہ ہیں۔ کائنات کی تخلیق بھی مرحلہ بہ مرحلہ ایک پروسس کے تحت ہوئی اور جنت الفردوس کی تخلیق بھی انسان کو مرحلہ بہ مرحلہ فطری قوانین کے تناظر میں اپنے اعمال سے انجام دینی ہے۔ جو کچھ قرآن کریم میں ہے وہ قانون

کائنات میں بھی جاری وساری ہے، وہی عقلیات میں بھی ہے اور وہی سیر وسلوک میں بھی ہے۔

اگر کوئی نہیں بھی جانتا انسانی جسم پر میل کچیل کے علمی نقصانات کیا ہیں اور وہ مذہبی نقطہ نظر سے غسل وغیرہ انجام دیتا ہے تو وہ بھی اس سے وہی فائدہ اٹھائے گا جو علمی بصیرت کے ساتھ غسل انجام دیتا ہے۔ لہذا اچھائی اور نیکی اسی کا نام ہے جو چاہے دینی حکم کی صورت میں یا سائنسی تحقیق کے تناظر میں انجام دی جائے۔ البتہ دیانت داری، خلوص، صداقت اور ایمانداری ہر لحظہ خود انسان کی "نیت" میں ہونی چاہیے۔ سب کچھ اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے خدا کے علم و قدرت یعنی غیبی طاقت اور غیبی امداد پر بھی بھروسہ کرے۔ صرف خود پر بھروسہ کرنے والا بہت جلد شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے۔

انسان کو اپنی آخرت یعنی اطمینان بخش نتیجے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دنیاوی اعمال میں سنجیدگی، خلوص، صداقت، دیانتداری پیدا کرے اور اپنی نیت کو خالص کرے۔

" اور جو کوئی آخرت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش بھی کرے جیسی کہ کرنی چاہیئے درآنحالیکہ وہ مؤمن بھی ہو تو یہ وہ ہیں جن کی کوشش مشکور ہوگی۔" (قرآن کریم 17:19)

عقل، سائنس و مذہب

(ماخوذ - اضافہ جات کے ساتھ)

وہ شخص جو اپنے مذہب کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے، اسے محض آباءواجداد کے تقلیدی ایمان پر مطمئن نہیں رہنا چاہیے۔ اس کے ایمان کا یہ تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ اپنے عقائد کی جانچ پڑتال استدلال و دلیلوں، تجربات، مشاہدات و مطالعات کی بنیادوں پر کرے اور ان کے حق میں ایسے ہی دلائل مہیا کرے کہ وہ لوگ جو ایمان سے سرفراز نہیں اور جو صرف عقل کو معیارِ حق و باطل جانتے ہیں، انہیں سمجھ کر ان عقائد کو حق سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔ یہ ایک غیر فطری امر ہے کہ لوگ ایسے عقائد پر ایمان لائیں جن کو وہ سمجھ نہ سکیں اور جو اُن کی عقلِ سلیم کے معیار کے مطابق نہ ہو۔ عقائد و شریعت کے معاملے میں کسی قسم کا جبر وزبردستی کرنا ایک انتہائی ظلم ہے، حق و صداقت تک پہنچنے کیلئے شک کرنا ایک ضروری اور ناگزیر مرحلہ ہے اس منزل سے گزرے بغیر ایمان کی روشنی حاصل ہونا محال ہے خصوصا اس صورتحال میں جب منزل ایک اور طریقے جدا ہوں یا پھر ان میں تاریخی عرصے میں مفادات کے تحت خود ساختہ دینداری داخل کرنے کا بھی شائبہ ہو، یہ سب عقل ہی کی مدد سے تحقیق و تجربے سے سمجھی اور سمجھائی جاسکتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اسلاف کی جن کتابوں کو ہم نے مستند تسلیم کیا ہے ان میں عقائد اور سماجی و عائلی زندگی کے کافی اہم معاملات میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اب چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور خدا کی طرف سے فیصلہ کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں اور تحریفات کی خبریں بھی موجود ہیں اس لئے لازمی طور پر ہمارے سامنے یہی طریق کار ہے کہ ہم اپنی فطری عقل و دانش سے ان کا مطالعہ کریں، تجربی و مشاہداتی حقائق کی روشنی میں ان پر تنقید کریں اور ان کے تضادات اور اختلافات کو رفع کرنے کی کوشش کریں۔ اس چیز کے احساس سے منطقی طور پر قوانین کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ترغیب ملتی ہے کیوں کہ اختلافات کو رفع کرنے اور سب کو یا اکثریت کو کسی ایک موقف پر متفق کرنے کیلئے منطقی دلائل سے بہتر اور کوئی ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ متنوع نظریات /خیالات و اعتقادات میں یہ حقیقت عیاں ہے کہ اسلاف کی سند یا قرآن و حدیث، بائبل، توریت، زبور یا گیتا وغیرہ کا حوالہ کسی دعوے کے ثبوت میں پیش کرنا بے معنیٰ ہے کیوں کہ غیر جانبدار محققین کیلئے یہ چیزیں مستند نہیں ہیں اور قابل قبول نہیں ہو سکتی ہیں، اسلئے لازمی طور پر اپنے عقائد کے دفاع میں عقلی استدلال و دلیلوں کا سہارا لینا پڑے گا کیوں کہ یہی ایک چیز ہے جو سب انسانوں کے نزدیک قابل احترام اور قابل وثوق و قبول ہے۔ اگر ایمان اور عقائد کو استدلال سے صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے تو پھر کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اساسی اور اہم عقائد و شرعی قوانین کو استدلال سے اس طرح ثابت کیا جائے کہ انہی دلائل سے وحی اور غیب پر ایمان کی ضرورت کا بھی احساس پیدا ہو یا انسانی ضرورتوں کی

تکمیل کیلئے کسی روحانی شخصیت کو ماننا اور اطاعت کرنا ضروری سمجھا جائے اسی طرح مختلف مذاہب کے آسمانی صحیفوں کے متعلق فیصلہ کرنا کہ کون ساواقعی صحیح طور پر الہامی ہے، عقل ہی کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ الٰہیات کے اہم ترین موضوع، مثلاً اثبات باری تعالیٰ، روح کی ماہیت، فرشتے، غیب و شہود، اخلاق و کردار یا شخصی باطن، امامت اور قیادت, دعاوتوسل، دینی رسوم، اُخروی زندگی، قبور کی زیارت، جہاد، عالم برزخ وغیرہ بھی عقلی استدلال و تجربات سے ثابت کیے جاسکتے ہیں۔ اس طریق کار کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ وحی اور ایمانیات کے دائرے کو واضح طور پر تقدسی مباحث سے الگ کر دیا جائے کیوں کہ اگر کسی ایسے معاملے میں کوئی قاطع عقیدہ پیش کیا جائے جس کے متعلق انسانی عقل غلط ہونے کا فیصلہ صادر کر دے تو پھر مذہب زدہ ذہن کیلئے ایک سخت دشواری پیش آئے گی کیونکہ ہم کسی ایسی بات کی تصدیق نہیں کر سکتے جو وحی اور ایمان کے خلاف ہو اور مقدس ہو۔ اسی وجہ سے اس چیز کی اجازت بھی ہر گز نہیں دی جاسکتی کہ ہم اپنے ہر عقیدے کو صحیح سمجھنا شروع کر دیں اور اسے ایمانیات اور اپنی ثقافت و تہذیب کا ایک لازمی حصہ قرار دیں جو ہمیں ذاتی طور پر پسند ہو۔ اگر ہم کسی ایسی بات کو دانشمندوں کے سامنے بطور عقیدہ پیش کریں جو سائنسی تحقیقات یا سائنٹفک اندازِ فکر کے خلاف ہو تو ہم اپنے مذہب کی تذلیل کا باعث بنتے ہیں۔ صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم مذاہب کی تحقیق کیلئے وہ طریقہ اختیار کریں جو عقل و منطق کے عین مطابق ہو اور جس میں مذاہب کا اختلاف کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ معیار وہ ہے جو عیسائی، ہندو، یہودی، اہلسنت، اہل تشیع یا فرقہ در فرقہ وغیرہ سب

کیلئے برابر قابل قبول ہے۔ اب تک کی سائنسی تحقیقات خواہ علم طبیعیات میں ہوں یا ما بعد طبیعات جیسے کوانٹم فزکس، حیوانیات، کیمیا، سماجی سائنسز جیسے نفسیات، عمرانیات، سیاسیات یا معاشی علوم، مجموعی طور پر مذہب و دین کی حقانیت کو ہی واضح کرتی ہیں جیسے انسان اور انسانی سماج کی طبیعی ضروریات کو دین کبھی منع نہیں کرتا بلکہ ان ضروریات کی تکمیل کیلئے حدود و قیود کا تعین کرتا ہے لہذا جتنا ہمارا انسان کی فردی اور انسانی معاشرے کی طبیعی ضروریات کے حوالے سے علم بڑھتا جائے گا تو ہم کبھی بھی ایسے منطقی اور فطری ضرورت کی تکمیل کیلئے کسی خاص تائید کیلئے تشنہ نہیں رہیں گے۔ لہذا ایسا کارنامہ ہونا چاہیے کہ مذہب و دین سائنس بن جائے اور سائنس مذہب۔ اس کام کیلئے نہایت دقتِ نظر اور عقلی سلیقے کی ضرورت ہے۔

جبر و آزادی

(زیر نظر مضمون مختلف مطالعات کے اقتباسات اور پھر اس میں ترامیم و تجدید کے ساتھ ہے)

ریاست اور جبر لازم و ملزوم ہیں۔ زرعی انقلاب کے بعد ریاست وجود میں آئی تو شہری اپنے بعض انفرادی حقوق سے جن میں من مانی کرنے کی آزادی بھی تھی۔ دست بردار ہو گئے! زیادہ صحیح الفاظ میں حکام نے ان شہریوں کی بے مہار آزادی خود معاشرے کی بقا کیلئے اور ریاست کی بقا نیز اقتدار کے تحفظ کیلئے شہریوں پر پابندیاں عائد کر دیں۔ چناچہ صبح تاریخ سے ریاست خواہ وہ ملوکی رہی ہو یا مذہبی، جمہوری رہی ہو یا اشرافیہ، آمرانہ رہی ہو یا اشتراکی اپنے نظریے اور قانون کی حفاظت کی بنیاد پر جس کو وہ شہریوں کی بقاء اور تحفظ کیلئے ضروری خیال کرتے ہیں انفرادی قدر و اختیار کو سلب کرتی رہی ہے اور آج بھی کر رہی ہے۔

مسئلہ تو در اصل یہ ہے کہ جس قانون اور نظریے کے تحت کوئی بھی ریاست یا حکومت شہری آزادیوں پر پابندی لگاتی ہے وہ قانون یا بنیادی قانون کس زمین پر استوار ہے؟ کیوں کہ کوئی بھی مضبوط بنیاد بھی کسی مضبوط زمین پر رکھی جاتی ہے ہوا، خلاء یا پانی پر نہیں رکھی جاتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ تاریخِ انسانی کے تجربات کی بنیاد پر نظریات اور اخذ شدہ قوانین پر رکھی جاتی ہے تو یہ بھی صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ سیاسی تعصبات جس

کی بنیاد معاشی منافع ہوتے ہیں وہ بھی پوری قوم کے نہیں بلکہ چند جاگیرداروں یا صنعت کاروں، ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے ذاتی منافع خوری کی بنیاد پر ان قوانین کی زمین تیار کی جاتی ہے۔

کیا ان قوانین کی بنیاد ااُن زمین حقائق اور اصولوں پر نہیں ہونی چاہیے جو آج تک کی تاریخ کے مطالعے اور تجربے سے انسان کی سماجی نفسیات کے تناظر میں محکمات بن چکے ہیں اور جس کے ذریعے ہی اقوام ترقی کر سکتی ہیں۔ ایک عالمی حکومت کے دعوے کی بنیاد اگرچند سرمایہ داروں کی اقتصادی ہوس رہے گی تو اس صورت میں پوری دنیا میں تو امن قائم نہیں ہو سکتا۔

کسی بھی شہ کی قدر کی حقیقت یہ ہے کہ ہم جس شے میں دلچسپی لیں اس میں ہمارے لئے قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ ماحول کے سماجی اور معاشی تقاضوں کے بدلنے کے ساتھ ہماری دلچسپیاں بھی بدل جاتی ہیں اور دلچسپیوں کے بدلنے کے ساتھ قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔ مگر وہ قدریں جو ہم پر فطرت کی طرف سے جبراً نافذ ہیں اُن کو تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں سوائے خالق و مالک کے۔ سماجی اور معاشرتی فلاح اور سعادت کے قوانین و اصول بھی انہیں قدروں میں سے ہیں۔ عمومی طور پر اخلاقی قدریں معاشرے کے معاشی تقاضوں اور فرد کی دلچسپیوں کے باہمی تاثیر و تاثر سے وجود میں آتی ہیں اور کسی بھی صورت میں ان تقاضوں سے ماوراء نہیں ہوتیں۔ اخلاقیات کا ایک ہم اصول یہ ہے کہ اس کی قدریں کسی نہ کسی طرح مقصد یا نصب العین سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ظاہراً مقصد گھٹیا ہو گا تو متعلقہ قدریں بھی گھٹیا

ہوں گی اور مقصد اعلیٰ و ارفع ہو گا تو اس سے مربوط قدریں بھی اعلیٰ وارفع ہو نگی۔ فطرت کے جبر سے گھبرانااورخود کو قیدی یا محبوس سمجھنادرست نہیں بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ فطری قوانین کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر کے ان سے حسب منشاء کام لیاجائے اور جبر کا یہ شعور انسان کو اختیار سے بہرہ ور کر دیتا ہے۔ انسان ان قوانین کو بدل دینے سے قاصر ہے لیکن ان کے جبر کے دائرے میں رہ کر قدروا ختیار کو پالینا دانشمندی ہے۔ اسی طرح تاریخی عمل اور انسانی معاشرے کے قوانین کو توڑنا انسان کے بس کی بات نہیں ہے لیکن وہ ان کی حدود میں رہ کر اور جدوجہد کر کے اپنے لئے عادلانہ معاشرہ تعمیر کر سکتا ہے۔ یہ تعمیر و تخلیق خود قانون فطرت کے تحت ہی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ موٹے موٹے قوانین فطرت کو جان کر اقتصادی ہوس کو فروغ دینا قوانین فطرت میں ترقی نہیں تنزلی ہے۔ اسلام کی انقلابی سیرت کی رجائیت کا راز اسی بات میں مخفی ہے کہ ایک تو انہوں نے جبر میں اختیار کو پاکر بنی نوع انسان کو یاسیت، ناامیدی کے گھور اندھیرے میں امید کی کرن دکھائی ہے اور دوسرے وہ ایک اعلیٰ نصب العین کے حصول میں کوشاں ہیں اور بڑے اعتماد سے عبوری دور سے گذر کر عالمی اسلامی معاشرے کے قیام کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

ازدواجی زندگی! تفریح یا ذمہ داری

بیویوں اور دیگر خواتین پر طنز و مزاح کے جملے، لطیفے اور دیگر ایسی باتیں ابلیس کے چیلوں الیومناٹی اور بدذات سرمایہ داروں نے پھیلائی ہیں تاکہ لڑکے لڑکیاں شادیوں اور شریک حیات کے پاکیزہ و مقدس بندھنوں سے بدظن ہو کر آزاد روابط کا باعث بنیں جس میں صہیونیوں کے جنسی کاروبار کی دکانیں چلتی ہیں۔ خواتین کی جو کمزوریاں اور نقائص ہیں اس کا بڑا سبب ان کو غیر مربوط کاموں میں الجھا دینا ہے۔ مرد اور خواتین بلکہ مجموعی طور پر انسان کو کارپوریٹ کلچر میں ملوث کر دیا گیا جس سے نہ صرف انسان بلکہ پالتو جانور اور جنگلی حیات بھی متاثر ہو رہی ہے۔ خواتین مردوں پر یا مرد خواتین پر بے جا بوجھ نہ ڈالیں جس کی شریعت اور عقل اجازت نہیں دیتی. جب تک * حق * اپنی جگہ پر نہیں آ جاتا اور دنیا میں نظام امامت و عدالت رائج نہیں ہو جاتا اپنوں اور مومنین و مظلوم محنت کش حق پرستوں سے کامل کئیر و نگہداشت اور اپنے حقوق ملنے کی توقع نہ کریں.

اگر الیکٹریکل انجینئر کو سول انجینئر کا کام دے دیا جائے تو وہ آدھی عقل نہیں پوری عقل سے فارغ نظر آئے گا، یا دل کے ڈاکٹر کو ڈرماٹولوجسٹ کی جگہ بٹھا دیا جائے تو وہ بھی گدھا بن جائے گا۔

جدید دور کے شیطان نے جو سماجی کلچر فروغ دیا ہے اس میں ہر شہ اپنے غیر فطری اور غیر حقیقی سرکل میں آگئ ہے۔ جب تک یہ شیطانی اور ابلیسی چکر ختم نہیں ہو تا عالمی سماج ہر سطح پر مسائل کا شکار رہے گا، اس میں سے ایک خاندانی نظام بھی ہے۔

زوجہ شوہر کی یا شوہر زوجہ کی باتوں سے پریشان ہونے والے پھر زندگی سے بھی پریشان ہوں. ذمہ داری کے ساتھ پریشانی تو ہوتی ہی ہے. بیوی کو بوجھ سمجھنے والے پھر زندگی کو بھی بوجھ سمجھیں۔ بچوں اور معاشی جدوجہد زندگی کی ذمہ داری کا نام ہے عیاشی اور آرام طلبی من پسندی اور تفریح کا نام نہیں یہاں مشکلات کے ساتھ آسانیاں بھی ہیں. خدا سے مربوط رہیں دین دار رہیں صبر برداشت سے کام لیں خدا کی طرف سے دیئے گئے اس امتحانی پرچے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے پر ہی اگلا مرحلہ مزید ذمہ داریوں والا ہے۔ بڑے کینوس پر نظریں مرکوز رکھیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں اور مسائل پر واویلا نہ کریں ایک دوسرے کی اس مشکل دور میں اور عالمی سطح پر چھائے صیہونیت کی اندھیری تاریکی میں ایک دوسرے کیلیئے روشنی اور نور کی کرن بنیں، ایک دوسرے کا مددگار حوصلہ افزاء بنیں شکر ادا کریں خدا کی طرف سے ذمہ دار بنایا جانا نعمت اور فضیلت کا موقع ہے.

از دواجی زندگی خدا کی طرف سے ایک نئے سماج کو پروان چڑھانے کی ذمہ داری ہے۔ اس کی نزاکتوں کا احساس کریں۔

ورنہ روتے سسکتے شکایتیں اور شکوے کرتے اگلے سخت مراحل کی زندگی مزید مشکل بنالیں۔ اپنی ہمت و استطاعت میں اضافہ کریں دعا و توسل کریں اور زیادہ سے زیادہ ذمہ داریاں اٹھانے کی کوشش کریں۔

خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

ترقی و کامیابی! مگر کیسے ؟!

مہنگائی مہنگائی کا شور ہر کوئی کرتا ہے مگر اس کے پیچھے موجود عوامل کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ناخواندگی اور تعلیم کی کمی اس بات کا سب سے بڑا سبب ہے کہ یہ مختلف پریشانیوں کا باعث بھی بنتی ہے اور مہنگائی کے ساتھ ساتھ پریشانیوں کی پیدائش کی وجوہات اور پھر اس کے حل سے بھی قاصر کر دیتی ہے۔

پیسے کی قدر گرنے کی روزآنہ باتیں کی جاتی ہیں مگر کیا عام شہری جانتا ہے کہ پیسے کی قدر کیوں گرتی ہے اور مہنگائی کیوں ہوتی ہے۔ اشیائے صرف کی قیمتیں کیوں بڑھ جاتی ہیں اور اس چیز میں عام شہری کا کیا قصور ہو سکتا ہے۔عام شہری ہر پریشانی کا منبع حکومت اور حکومتی مشنری کو قرار دیتا ہے اور حکومت کو ہی قصوروار قرار دیتا ہے۔ مگر ہر دفعہ ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارا مذہب بھی اور تجربہ کار بزرگان بھی اس بات کی تاکید کرتے رہتے ہیں کہ محنت کرو، محنت میں عظمت ہے، جو بوؤ گے وہی کاٹو گے وغیرہ وغیرہ۔ نئی نسل کاہل ہے، کام نہیں کرتی، آسان پیسہ (easy money) کے پیچھے بھاگتے ہیں اور ایک رات میں کروڑ پتی بننے کے خواب دیکھتے ہیں۔ آسان کام تلاش کرتے ہیں اور اکثر تو کام کے بجائے دوسروں کی امداد اور اعانت کو بہتر سمجھتے ہیں اور کام کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ روزی و رزق کی

تلاش کیلئے ہمارے مذہب نے بھی بے انتہا تاکید کی ہے اور محنت و جدوجہد کرنے والوں کو بعض مقامات پر جہاد کے میدانوں سے زیادہ بافضیلت قرار دیا گیا ہے۔

جدید سرمایہ داری نظام یا سوشلسٹ نظام اور دیگر معاشی نظریات کے ادغام سے جسے مخلوط معیشت کہا جاتا ہے مغربی معاشی ماہرین کی صلاح کے مطابق موجودہ عالمی معاشی مسائل کے حل میں کارگر ہے، جس میں اسلامی اقتصادیات کی خصوصیات بھی ہیں مگر چونکہ یہ مسلمان دانشمند روحانی کے زیر سایہ نہیں لہذا اس کا نتیجہ اور اثرات خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ البتہ اگر اسلامی حکومت ہو تو اس نظام کی بہت سی جدید روشوں اور طریقوں کو اپنالیا جائے۔ سوائے ان چند معاشی اور اقتصادی شعبوں کے جہاں انسانی استحصال کی واضح مثالیں موجود ہیں، جدید معاشی نظام انسان کی معاشی زندگی کی ارتقائی شکل ہے۔ کاغذی کرنسی میں موجود مفاسد سے قطع نظر اس کے فائدے بھی ہیں۔

مہنگائی کی ایک وجہ عوام کا محنت نہ کرنا اور کام کاج نہ کرنا بھی ہے، کام کاج نہ کرنے کی وجوہات تعلیم کی کمی، ہنر اور skills کی کمی ہے۔ جدید دور میں روزآنہ کی بنیاد پر نت نئے قسم کے کام وجود میں آرہے ہیں۔ البتہ تیسری دنیا اپنی کاہلی، سستی، آرام طلبی، عیش کوشی اور غیر سنجیدگی کے باعث اپنی اپنی معاشی نظام کی تنزلی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

جس گھر میں کوئی کام نہ کرے اور کھانا بھر بھر کر کھائے تو بزرگوں کی چھوڑا ہوا لاکھوں کا خزانہ بھی خالی ہوجائے گا۔ اگر بزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو زیرکی، ہوشیاری اور

سمجھداری کے ساتھ کہیں سرمایہ کاری نہیں کرے گا خواہ اپنی تعلیمی اور ہنری قابلیت بڑھانے پر اور پھر اس کو کاروباری استعمال میں، تو یہ خزانہ ختم ہو جائے گا اور یہ گھر فقیر ہو جائے گا۔ اسی طرح کسی ملک و قوم کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ قرضہ لینا ابتدائی طور پر تو درست ہے مگر اس قرضہ یا وراثتی دولت کو تعلیمی اور ہنری قابلیتوں کو بڑھانے کیلئے سرمایہ کاری کریں۔ محنت، جدوجہد کرنا تو ہر ترقی کا بہت ہی بنیادی اصول ہے۔ کاہلی، سستی، آرام طلبی، عیش کوشی اور غیر سنجیدگی سے خود کو دور کرنا ہی اس بات کا سبب بنتا ہے کہ فردی اور معاشرتی طور پر علمی یا معاشی فلاح کا سبب قرار پائے۔

علمی اور معاشی ترقی کیلئے اخلاقی اصولوں میں بنیادی طور پر صداقت، دیانتداری اور امانتداری کو اہمیت دیے بغیر نہ کوئی فرد اور نہ ہی کوئی قوم ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی انسانی تہذیب سے آشنا کہلائی جا سکتی ہے۔

مہنگائی کی کمی کیلئے ضروری ہے کہ ہم محنت کریں اور اجتماعی طور پر ضروریات زندگی کی پیداوار میں اضافہ کریں۔ یہ معاشی اصطلاح میں GDP کہلاتا ہے۔ GDP کے بڑھنے کے ساتھ ہی کرنسی کی قدر میں بھی اضافہ ہوتا ہے GDP معاشی ترقی کا ایک سبب ہے۔ GDP بڑھنے کے عوامل میں سے یہ ہے کہ صنعتی پیداوار بھی بڑھائی جائے اور اس کیلئے صنعتوں کیلئے ماہرین تیار کیے جائیں جس میں صنعتی تعلیم و ہنر و فنون کو سیکھنا شامل ہوں۔ نیز ہر شعبے میں تخلیقی اور تعمیری جذبے کے ساتھ کام کام اور بس کام کیا جائے۔ حکومت صنعتوں کے قیام یا صنعتی تعلیم کیلئے قرضہ فراہم کرے، ملک کے زردار لوگ صنعتیں لگائیں

ان صنعتوں کیلئے ماہرین تیار کرنے کیلئے کالج، یونیورسٹیز وغیرہ قائم کریں وغیرہ۔جب پیداوار میں ملکی ضرورت سے زیادہ اضافہ ہو گا تو یہ اشیائے صرف باہر بر آمد کی جائیں گی اور ملک میں پیسہ آئے گا۔ پیسہ بڑھے گا تو اس کی قدر میں بھی اضافہ ہو گا اور یوں عوامی سطح پر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ چند روپوں میں زیادہ اشیاء خریدی جاسکیں گی۔لوگوں کی تنخواہوں اور صنعت مالکان کے منافع میں اضافہ ہو گا۔تو حکومتی ٹیکس بھی بڑھیں گے اور سرکاری خزانہ بھی بڑھے گا یوں حکومت اس پوزیشن میں ہو گی کہ شہریوں کی فلاح کیلئے کام کر سکے۔عوام کی فلاح و بہبود کیلئے سڑکیں، پل، پارکس، تعلیمی ادارے، میڈیا، تعلیمی ادارے، صحت کے ادارے اور ضرورت کی دوسری اشیاء کم قیمتوں میں ملنے لگیں گی۔دیانت دار، سچی، اور امانت دار حکومتوں (پچھلے صفحات میں تقوا اور پرہیز گاری!حاکم کی بنیادی صفات کو دیکھیں) کے خرچ بھی کم ہوتے ہیں اور یوں عوامی پیسہ حکومتی لوٹ کھسوٹ کی نظر نہیں ہوتا۔ بر آمدات میں اضافہ اور درآمدات میں کمی کرنسی کو قوت دینے عوامل میں سے ہے اس کیلئے قوم کو قناعت کرنے کی عادت ڈالنی ہو گی یا پھر درآمد کنندہ اشیاء کی موجودہ سطح پر تیاری کیلئے خود کو آمادہ کرنا ہو گا۔بیرونی اشیائے صرف کو REVERSE ENGINEERING کے ذریعے ملکی سطح پر تیار کیا جائے۔

عوام میں سچائی، دیانت داری اور امانت داری کاروبار، نوکری یا خدمات وغیرہ میں ترقی کا باعث بنتی ہے۔ اور معاشی اخلاقیات و تہذیب اس بات کا جواز فراہم کرتی ہے کہ قدرت اس عمل پر مذکورہ معاشرے کو ترقی اور کمال عطا کرے۔

معاشرے میں صحت مند سر گرمیاں اور نوجوانوں اور جوانوں کیلئے تعلیمی اور کام کے مواقع ، ہنر وفنون سیکھنے کے مواقع دینا حکومت کا کام ہے مگر حکومت بھی خود اکیلئے کچھ نہیں کر سکتی جب تک معاشرے کے سرمایہ دار لوگ حکومتی خزانے اور وسائل میں اضافہ یا مسائل میں کمی کا سبب نہیں بنیں گے۔ نیز عوام اپنے تئیں بھی جس کے پاس وسائل ہیں اپنے اور اپنے ہم وطنوں کیلئے راستے تیار کریں اور سب کو اور خود کو بھی محنت اور کام پر اور تعلیم وہنر کے حصول پر راغب کریں۔

پیداوار زیادہ ہونا، کام زیادہ کرنا، مطلوبہ شعبہ کا علم بڑھاتے رہنا، مصرف کی خواہشات کو کم کرنا، ہم وطنوں کی کام محنت تعلیم اور نیکیوں پر حوصلہ افزائی اور مواقع فراہم کرتے رہنا ہی معاشی، علمی، اخلاقی ترقی کا باعث بنتا ہے۔ غیر تخلیقی، منفی باتوں ،بے حوصلہ کرنے کے دشمن ساز پروپیگنڈوں سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے اور یہ شعبہ بھی بہت ضروری ہے۔ فرد یا قوم کے حاسد کبھی نہیں چاہتے کہ وہ ترقی کرے اور اس کے احسانوں سے آزاد ہو جائے، اس ابلیسی اور شیطانی سوچ کے حامل دشمنوں سے بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ امن و امان کیلئے ضروری ہے کہ پیسے اور وسائل کی نمائش سے اجتناب کیا جائے تاکہ معاشرے کے کم آمدن والے حسد و کینہ میں مبتلا نہ ہوں اور جرائم سے دور رہیں نیز اشرافی گری سے دور رہنا چاہیے بلکہ کمزور طبقات معاشرہ کو علم و دانش، اخلاقی حوصلہ افزائی یا پھر ان کی مدد کر کے ان کو معاشرے کا فعال شہری بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک مسلمان معاشرے پر فرض ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی حالت سے غافل نہ ہو

اور پورے معاشرے کیلئے کام کرے پہلے پہل اپنی ملکی حدود پھر بیرونی حدود میں جہاں جہاں مدد کی ضرورت ہو وہاں پہنچے اور ان کی حوصلہ افزائی کرے۔

تعلیم اور معاش دونوں ضروری ہیں انہی کی بنیاد پر شستہ تہذیب وجود میں آتی ہے اور ان سارے پروسس کیلئے خداوند کریم نے ہمیں قران کریم جیسا دستور دیا رسول کریم جیسی عظیم سیرت دی اور ہمارے لئے آخرت کی کھیتی کے طور پر دنیا میں تہذیب یافتہ بننا سکھادیا۔ اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی دنیا کو بھی اور آخرت کو بھی بہتر بنانے کیلئے اسی دنیا سے اپنا توشہ حاصل کریں اور خود بھی دیانت، صداقت اور امانت دار بن کر اپنے دوست، رہبر و قائد، شریک حیات تلاش کریں اور آئندہ نسلوں کی بھی انہی خطور پر تربیت کریں۔ مثبت، تعمیری اور تخلیقی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اور منفی، فساد پرور، کرپشن زدہ کاموں سے خود کو بھی دور رکھیں اور دوسروں کو بھی احسن و بہترین طریقے سے ان اصولوں کی تعلیم دیں اور تبلیغ کریں۔ اپنی زندگی میں بھی اور دوسروں کیلئے بھی آسانی و فلاح کا سبب بنیں نیز زندگیوں میں اعتدال BALANCE کے قدرتی اصول کو فراموش نہ کریں۔

ترقی و فضیلت مرحلہ بہ مرحلہ حاصل ہوتی ہے خداوند قدوس نے اس کائنات کو بھی چھ دن (چھ مراحل–6 steps) میں خلق کیا، اس کائنات میں کوئی کام بھی یک دم نہیں ہوجاتا ہے بلکہ مراحل و پروسس کا طلب گار ہے۔ یہ ارتقائی عمل ہی ہے جس سے منصوبوں کاموں اور نظریوں کو ان سے مثبت نتائج کے حصول کیلئے قدرتی ترتیب اور قدرتی مراحل

سے انجام دینا ہی فائدہ مند ہوتا ہے۔ معاشی ترقی اور دنیاوی چمک دمک میں مگن ہو کر اخلاقیات و مذہب اور انسانی اقدار سے لاپرواہی ایسا گناہ و جرم ہے جس میں مبتلا ہو کر ماضی کی بڑی بڑی سلطنتیں اور ایمپائر زوال وتباہی سے دوچار ہوئیں۔ معاش انسانی اقدار و تہذیب کی شستگی کیلئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وسیلہ ہے ہدف نہیں لہذا ہدف خداوند تعالیٰ کی خوشنودی جو کہ اسی دنیا میں کیے جانے والے تعمیری، تخلیقی اور مثبت کاموں سے مربوط ہے اور وسیلے کو وسیلہ ہی رکھیں یعنی ان دنیاوی ترقیوں اور کامیابیوں پر اکڑ و غرور میں مبتلا ہونے سے بھی بچیں۔ دنیاوی علوم کے ساتھ مذہب اور سماجی علوم پر بھی تحقیقات و پھر اسی کے تناظر میں عمل ایک مکمل انسانی معاشرے کیلئے اشد ضروری ہے۔

خداوند متعال سے دعا کہ ہمیں دنیا اور آخرت کے حسنات عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

تجربے اور نتیجے

سماجی، سیاسی و معاشی عدل کے تناظر میں جدید دور کے عقلائے عالم کی فکری معراج مارکسیت پر ختم ہو جاتی ہے تو مابعد جدید دور (Post Modernism) کے مالیخولیائی فلاسفہ تاریخ کے اختتام کی شکل میں بہکی بہکی باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ فکری میدان میں شیعہ مسلمانوں کی انتہا ملا صدرا اور آگے مصباح یزدی، جوادی آملی تک آتی ہے۔ اہلسنت کی ذہنی وسعت غزالی کے بعد اقبال، احسن اصلاحی، غامدی وغیرہ تک ہے اور پھر خلا ہی خلا ہے۔ مذہبی سیاسی نظاموں کے حوالے سے مسلمانوں کے دو بڑے فرق، اہلسنت اور شیعہ میں اہلسنت مکتب کی مذہبی حکومتیں بنی اُمیہ، بنو عباس، خلافتِ عثمانیہ، ہندوستان کی مغل حکومت وغیرہ اپنے طمطراق دکھا کر بجھ گئیں۔ مغرب میں زرعی اور صنعتی انقلابات کے بعد خالص مادّی مکاتب کی حکومتیں اور نظام جیسے کہ سیکولر لبرل جمہوری نظام اور ان کے معاشی مکاتب سرمایہ داری اور اس کے ردِ عمل میں اشتراکیت و اشتمالیت کی شکل میں عالمِ انسانی نے اپنے تجربات میں اضافہ کیا۔ عظیم فلسفی اور اُستاد علی ابن ابی طالب کے قول "کامیابی کیلئے بزرگان کی نصیحت و تجربہ سے استفادہ کرنا چاہیے یا پھر خود سے تجربہ کرنا چاہیے" کے تناظر میں حضرتِ انسان نے بزرگان کی نصیحت کے بجائے خود کو تجربہ گاہ کا مواد قرار دیا۔ درج بالا سیاسی، سماجی اور معاشی تجربات کی روشنی میں انسانی ذہن و نفسیات، مادّیات اور

روحانیات وغیرہ کے ساتھ جو تجربات انجام دیے گئے ان کے نتائج عالمی انسانی معاشرے سے مسائل کا خاتمہ نہ کر سکے۔ کبھی کسی رُخ پر زیادہ توجہ دی جاتی رہی اور کبھی کسی دوسرے رُخ پر، کبھی عقلانیت کا چرچا ہوا کبھی جذبات و احساسات کا، کبھی مذہب کا رواج رہا کبھی سائنس کا، اور اس طرح انسان اپنے اختیار و قدرت کے جبر کے درمیان گھن چکر بن رہ گیا۔ مسائل حل کرنے کے جذبے بڑھتے گئے نت نئے فلسفے اور ایجادات ہوتی گئیں مگر انسانی سماج کے مسائل کبھی ایک رُخ سے ختم ہوتے تو کبھی دوسرے رُخ سے سر ابھارتے رہے ہیں۔ ان تاریخی تجربات میں انسان اپنی جتنی قوت اور ہمت نیز جس جس رُخ سے کوشش کر سکتا تھا کر چکا۔ جس جس زاویہ سے مسائل حل کرنے کی کوشش ہو سکتی تھی ہو چکیں۔ صنعتی دور اور پھر information technology کے دور میں سوویت روس کے ٹوٹنے، سرد جنگ کے خاتمے کے بعد ایک بار پھر سرمایہ داری نظام کے اعادے کی بات کی جارہی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک میں اخلاقی و خاندانی فساد کے ساتھ سیاسی اور معاشی فساد بھی سر اٹھانے لگے ہیں سرمایہ داری کی ڈوبتی ہوئی کشتی کے مد مقابل اشتراکی ممالک ایک دفعہ پھر اکیسویں صدی میں اپنی کمر ہمت کستے نظر آرہے ہیں مگر دنیا کے مکینوں کو ایک ہی سوراخ سے دوسری بار خود کو ڈسوانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کبھی جاگیرداروں کی غلامی، کبھی صنعتکاروں اور بینکاروں اور کبھی مزدوروں کی غلامی میں پھنسے ہوئے اس انسانی سماج کو ماضی کے تجربات کی روشنی میں صرف ایک فلسفہ اور نظام جو کہ ابھی صرف نظریاتی شکل میں موجود رہا ہے پریکٹکل نہیں کیا گیا یعنی تعلیماتِ محمد و آل محمد۔ آج کے دور میں اس

بات کا تقاضا عقل و تجربے کی روشنی میں زور پکڑتا ہے کہ مذہب اہلبیت علیہم السلام کو بغور جائزہ لیا جائے اور اپنی فکری اصلاح کے ساتھ عملی طور پر دنیا کے مسائل کے خاتمے کی پُرخلوص کوشش کی جائے۔ مکتبِ تشیع کی مادّی اور روحانی، سیاسی و معاشی، سماجی و تہذیبی معتدل تعلیمات و تصورات کو ابھی تک درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ مذاہبِ عالم اور اسلام کا واحد فرقہ اہل تشیع بطور نظام عالمی انسانی تجربے سے گذرنا باقی ہے، یہ نظام جس کا اوّل و آخر، ظاہر و باطن سب نظریہ و نظامِ ولایت و اِمامت سے وابستہ ہے۔ تشیع کے فلسفے میں کسی بھی غیرِ خالق قوت کی طرف جھکاؤ سے گریز کے نتیجے میں عالمی انسانی سماج کیلئے وافر اطمینانی کیفیت موجود ہے اس نظام کو عملی شکل دینے کیلئے عالمِ انسانیت میں اور انسانی سماج کے ہر شعبے میں کام کیے جانے کی ضرورت ہے اور عام مومنین کا اعلیٰ کردار کا نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں اب جبکہ انسان مختلف النوع تجربات کی روشنی میں اپنی فطرت سے کماحقہ آگاہ ہو چکا ہے اور اپنی سماجی، سیاسی معاشی ضرورتوں اور نزاکتوں کو بھی سمجھ چکا ہے اور ہر زاویے سے ان ابعاد کے سکون کیلئے بھاگ دوڑ بھی کرچکا ہے تو اس صورتحال میں عالمی مسائل کے حل کیلئے ایک پُرخلوص نگاہِ مطالعہ ومشاہدہ شیعہ نکتہ نظر اور فارمولوں پر ڈال لینی چاہیے۔ اور مذاہب کی حکومت کے خوف کو شیعہ تاریخی شخصیات کے مطالعہ کے بعد جانچا جاسکتا ہے یعنی کہ شیعہ مذہب کی سیاست، سماجی حالت اور معاشی رویے ماضی کی برسر اقتدار مذہبی حکومتوں اور نظاموں سے یکسر جداگاہ حیثیت رکھتے ہیں۔ قرون اولیٰ کی مسیحی حکومتوں سے اور دیگر مذاہب، اسلامی فرقوں اور دوسرے مادی مکاتب فکر کی

حکومتوں سے مذہب اہلبیت کا سیاسی و حکومتی فلسفہ بہت زیادہ فرق کا حامل ہے۔ مذہب اہلبیت کے علاوہ وہ مذاہب اور ہیں جہاں انسان کی فطری ضروریات کا خیال نہیں رکھا جاتا، مذہبِ اہلبیت انسانی سماج کے ہر شعبے میں اعتدال بھی رکھتا ہے اور جولانی بھی، یہاں امامت وولایت کا شعبہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کیلئے نہیں ہوتا۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مسائل حل کرنے کیلئے جن کے پاس قوت و طاقت ہے وہ اپنے ذاتی اور وقتی مفادات کے خلاف اور کسی صورت اپنے تیار کردہ فکری اور انتظامی ڈھانچے کے خلاف کچھ سننے اور کرنے کو تیار نہیں ہیں اور دنیا میں "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" کے مصداق پالیسیاں اور منصوبے بنائے جارہے ہیں۔ سرمایہ داری مردہ باد کہنے والے مظلومین اَب اشتراکیت و اشتمالیت مردہ باد کے نعرے لگارہے ہیں، امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ چین مردہ باد کے نعرے بھی لگائیں گے، کیونکہ صیہونی (Kings) نے دکان کی جگہ بدل لی ہے اب وہ پچھلی گلی میں چلی گئی ہے۔

الیومیناٹی کے روتھ چائلڈ، روک فیلر وغیرہ اب اپنی سرمایہ داری کی دکان اشتراکیت و اشتمالیت کے نام سے چلارہے ہیں۔ چین کے انقلابی سوشلسٹ اب صیہونی سرمایہ داری کو پناہ دے رہے ہیں۔۔۔۔ اصل اشتراکی و ترقی پسندی کا فلسفہ کہیں پیچھے رہ گیا ہے، مظلوم کی حمایت، مزدور اور کسان کے حقوق کا نعرہ اب صرف جہلا کا رہ گیا ہے یا پھر کم معرفت اسلامسٹ افراد کا، اشتراکیت کے پیکٹ میں سرمایہ داری بکنے لگی ہے۔۔۔۔۔ صیہونیوں کی چین میں سرمایہ کاری کی مثال ایسے دی جاسکتی ہے جیسے کسی شہر میں بہت بڑا اڈا کو ہوتا ہے اور

جب سرکار اُس کے خلاف کریک ڈاؤن کرتی ہے تو قانونی طور پر مستحکم عظیم صنعت کار اُس ڈاکو کو اپنی صنعتوں میں سرمایہ کاری کرواتا ہے اور اپنے اثر رسوخ سے اُس ڈاکو کو safe place دیتا ہے۔ یہی کام آج چین صیہونی ڈاکوؤں کے ساتھ کر رہا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا برا نہ ہوگا کہ چین ان معاشی غارت گروں کو بچا کر اپنی ماضی کی مارکسی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر اور دوسری اور تیسری دنیا کی غربت کو نظر انداز کرتے ہوئے بچانے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ صیہونی سرمائے کی بہتی گنگا میں ہاتھ ڈالے رہے۔ چینی پریمیئر نے کچھ دن پہلے ہی اسرائیل کے ساتھ اپنے کاروباری تعلقات بڑھانے اور اس عمل کو تیز تر کرنے پر زور دیا ہے۔(2014ء کی خبر)

لیکن مظلوم خواہ مسلمان ہوں یا دنیا کی باقی 98٪ افراد اگر اپنے فکری اور نظریاتی ڈھانچہ کو درست نہیں کریں گے تو ایسے ہی روتے رہیں گے، پستے رہیں گے، بھیک مانگتے رہیں گے ۔۔۔۔ کرکٹ و فٹبال کھیلنا، رونا، شکوے کرنا، ماتم کرنا، مرثیے پڑھنا، نوحے پڑھنا، فلاں و فلاں کو قصوروار کہنا ہی رہ جائے گا!

شیطان روپ اور محاذ بدل بدل کر آرہا ہے، علماء ہر دور میں محنتِ شاقہ کرکے، کبھی اپنے خون سے انسان کو آزادی کیلے محنت وجد وجہد کی تلقین کیے جا رہے ہیں مگر کوتاہ مقاصد کے حامل پیروکار کبھی سامراجی ممالک کے ویزے پر بک جاتے ہیں، کبھی اپنے ہی وطن میں کسی سست و مست کر دینے والی غذاؤں اور رزق سے پیٹ بھر کر سو جاتے ہیں، ہر وہ رزق جس سے بندگی اور اطاعت میں سستی ہے حرام ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اگر بنو امیہ کو کوئی ایسا فرد نہ ملتا جو ان کے لیے (سرکاری) کتابت کرے، ان کے لیے غنیمت وفئہ کا مال لے کر آئے، ان کی خاطر جنگ و قتال کرے اور ان کے گروہ پر شاہد (و گواہ) بنے تو وہ کسی صورت ہمارا حق ہم سے چھین نہ پاتے، اگر لوگ ان (ظالم حکمرانوں) کو ترک کر دیتے اور جو کچھ ان کے ہاتھ میں (مال و اسباب) ہے سے کنارہ کش ہو جاتے تو لوگ صرف وہی کچھ اپنے پاس پاتے جو ان کے ہاتھ میں ہے۔ (الکافی ج۵، ص۱۰۶ اور ج۱، ص۴۷۴)

کب تک حق شناس دانشور و علماء ان آرام طلبوں، عیش کوشوں، غیر سنجیدہ افراد کو بیدار کرنے کی کوششیں کرتے رہیں گے۔۔۔۔

یاد رکھو مظلوموں ہدایت تمام ہونے کا بھی وقت ہوتا ہے، ڈرو اس وقت سے جب حجت تمام ہو جائے اور رسولانِ زمانہ تمہارے اوپر (خدا نخواستہ) لعنت کریں اور بدعا کریں۔ آج مستقبل میں کیا ہوتا ہے خدا خیر کرے۔ خود مسلمانوں اور شیعہ ہونے کے دعوے دار افراد اپنے اُس آئین عظیم شخصیات جن کی مخالفت پر یہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں کس طرح اس آئین اور ان کی سیرت پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور ظالموں کو رسوا کرنے یا دوسروں کی ذمہ داریاں تعین کرنے اور اپنے حقوق کے نعرے لگانے کے بجائے خود اپنی ذمہ داریوں اور دوسروں کے حقوق ادا کرکے کس طرح عہدہ برا ہونے کی سعی کرتے ہیں، خود ان کے ارادوں اور ہمتوں پر منحصر ہے۔ خدا اس عالم انسانیت کو امن و تہذیب کے ساتھ اس کے مکینوں کو دنیا اور آخرت کی سعادتیں نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین

معیار ہمت و استطاعت

انسان کے بس میں کیا ہے ؟!

کتنی ہمت ہے اور حالات کتنا ساتھ دیتے ہیں ؟!

مصلحتیں کہاں سے شروع ہوتی ہیں ؟

انسان کی قلبی وسعت کتنی ہے ؟!وغیرہ وغیرہ

ایمر جنسی کی صورتحال DECLARE کرنے والے کسی فرد، گروہ یا قوم کو اجتماعی یا فردی صورت میں جانباز اعمال کی تلقین و نصیحت کرتے ہیں۔

اس نصیحت پر اکثر و بیشتر توجہ کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

سمندر کی گہرائی کا اندازہ اُس میں اترنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، ساحل پر کھڑے کوئی طغیانی میں ڈوب جانے یا بچ جانے کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ مگر یہ کہ تجربہ کار۔۔۔۔۔ پہاڑ پر چڑھنا ممکن ہے یا نہیں! یہ اُسی وقت درک کیا جا سکتا ہے جب تک کوہ نوردی کا تجربہ نہ کیا جائے۔

ہمارے اکثر مشکل معاملات میں گھبر اجانا اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ ہم اپنی ہمت اور حوصلہ کو تجربہ نہیں کرتے اور حدود عافیت سے باہر نہیں آنا چاہتے۔

ہمیں کسی بھی عمل کی مشکل یا آسانی کا معیار طے کرنے کیلئے کم از کم تین سے چار دفعہ ضرور تجربہ کرنا چاہیے۔ تکراری تجربے کے زمان و مکان اور مجرب ہر دفعہ خواہ ایک ہوں یا مختلف۔۔۔

انسانی نفسیات بلکہ نہ صرف انسانی بلکہ تمام موجودات کی نفسیات اور وجود ایک چیز جسے ہم "عادت" کہتے ہیں بہت زیادہ آشنا ہوتا ہے۔ ہم عادتیں نئی نئی بناتے بھی ہیں اور چھوڑتے بھی ہیں۔

بعض افراد کی نفسیات اصول بنانے والی (TREND SETTER) کی ہوتی ہے جبکہ بعض اصولوں کی پیروی (TREND FOLLOWER) کی سی ہوتی ہے۔ اصول بنانے والے نت نئی چیزوں اور اعمال کے تجربے کرتے رہتے ہیں جبکہ اصول فالو کرنے والے بھی صرف فالو نہیں کر رہے ہوتے بلکہ اپنی یاد اشت اور تجربے میں موجود حقیقتوں کی بنیاد پر ہی ان اصولوں کی سچائی کو پر کھ کر قبول یا رد کر رہے ہوتے ہیں۔ اصول بنانے والے اعلیٰ دماغ جب ظاہر ہو جائیں اور سچائی کے ساتھ وابستہ ہوں تو ان کی اطاعت میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

کسی بھی عمل کی حدو سرحد اور اپنی ہمت وطاقت کو ناپنے کا صرف ایک ہی وسیلہ ہے اور وہ یہ کہ اپنی ہمتوں اور قوتوں کو کم از کم تین سے چار دفعہ اپنی آخری انتہا تک تجربہ کرنا چاہیے۔ استعداد و ہمت کی انتہا (EXTREME POTENTIAL) کو ناپنے کا اس کے علاوہ کوئی آلہ وو سیلہ نہیں کیونکہ ہر انسان کے حالات و امکانات مختلف ہوتے ہیں لہذا کسی دوسرے کے تجربہ کو ہر دفعہ کسی دوسرے کیلئے قیاس کرنا اور دوسرے پر منطبق کرنا درست نہیں ہوتا۔ فلاں نے ایسے کرلیا تھا، فلاں تو یوں کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ نئے اصول ابتداء میں سخت لگتے ہیں مگر وقت گذرنے کے ساتھ سہل ہوجاتے ہیں اور "عادت" بن جاتے ہیں لہذا حدودِ عافیت (COMFORT ZONE) کو وقت کے ساتھ ساتھ وسعت دیتے رہنا چاہیے۔ ممکن تو یہ ہے کہ پرانی مثالوں سے آگے جایا جائے اور انسان پرانے اصولوں اور تجربوں کو نئے انداز میں نئے طریق سے انجام دے اور تجربہ کرے۔ پرانا اصول فائدہ نہیں دے رہاتو کیوں نہیں دے رہالہذا نئے وسائل اور نئی امنگ کے ساتھ نیا تجربہ کریں اور نئے اصول تخلیق کریں۔

کائنات میں کچھ اصول مستقل یعنی غیر متغیر تبدیل نہ ہونے والے ہوتے ہیں اور کچھ اصول غیر متغیر ہوتے ہیں۔ یہاں فطرت کا کوئی جبر نہیں ہوتا بلکہ انسان مکمل مختار ہوتا ہے کہ اپنی زندگی کو جہنم میں جھونک دے یا ہمت و حوصلہ سے مشکلات پریشانیوں اور گناہوں کے اثرات سے نکل جائے۔

یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ہم اُس وقت تک یہ نہیں جانچ سکتے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں، کیا ہمارے بس میں ہے اور کیا نہیں جب تک ہم اپنی حدود عافیت سے نکل کر اپنی ہمتوں کو آخری انتہا تک تجربہ نہ کر لیں۔

پروردگار عالم سے دعا ہے کہ ہماری مشکلات و پریشانیوں اور آزمائشوں میں ہماری کمر ہمت و قوت کو مضبوط بنادے اور ہمیں اسلام پر عمل کرنے کے توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ ہمارے مولا و آقا حضرت امامِ زمانہ (عج) کی نصرت کیلئے ہمیں اُس زندگی سے آشنا فرمادے جس کی ہمیں اپنے مولا کے ساتھ ضرورت ہو۔ آمین یارب العالمین

قدرتی علوم اور معاشرتی علوم

نیچرل سائنسز کے ساتھ سوشل سائنسز کو بھی فروغ دینے کی ضرورت ہے، آج اس دور میں جب دنیا نے صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے منفی استعمال کے باعث اور صرف معاشی سرگرمیوں کے ارتقاء کے نتیجے میں جن سماجی آفات کا سامنا کیا ہے تو اس سے سبق لیتے ہوئے ہمیں معاشرتی علوم کو بھی اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں اولین ترجیح دینی چاہیے۔ مشرق کی زمین مذاہب کی زمین کہی جاتی ہے جب کہ مغرب کی زمین کو سیکیولر کہاجاتا ہے یہ شاید ان کی ظاہری توجہ کے باعث کہاجاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انسان نہ تو عقل و دانش کے بغیر رہ سکتا ہے اور نہ ہی جذبات و احساسات کے بغیر۔ لہذا اس بات کا تقاضازور پکڑتا ہے کہ معیشت کو بہتر بنانے والے علم و دانش کے ساتھ انسانی اخلاق ورویوں کو بہتر بنانے والے علم و دانش کو بھی فروغ حاصل ہو۔ جب جب دنیا میں زور، زبردستی، دھونس، بدمعاشی کا چلن ہوا کرہ ارض کے مکینوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ یہ زور وزبردستی کے پس پشت ہمیشہ معاشی طاقت و مادّی طاقتیں رہیں۔ اگر کہیں مذاہب کے ماننے والوں میں بھی ان صفات نے جنم لیاتو وہ بھی مادّی مفادات کے تحت۔۔۔۔

مغربی نشاۃ ثانیہ کے بعد اور دنیا میں عقل و دانش کے فروغ کے ذریعے دنیا کی جس سعادت و خوش بختی اور مسرت کیلئے دعوے کیے گئے تھے وہ سب پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈھیر ہو گئے۔ آج کے دور میں ہمیں نیچرل سائنسز کے ساتھ سوشل سائنسز کے فروغ کی بات اسی لئے کرنی پڑی تا کہ دنیا انسانی مزاج کو جو جسم و روح اور عقل و جذبات پر مشتمل ہوتا ہے اس کی تسکین کیلئے جامع منصوبہ تشکیل دیں اور اس کیلئے بغیر کسی مکتب سے تعصب کے تحقیقات کریں ہمارے سامنے ماضی کے تجربات بھی ہیں جو ہماری ہدایت کیلئے کافی و وافی ہیں۔ آج دنیا نے اپنے تمام فنون اور ہنر جتنے انسانی دماغ میں موجود ہو سکتے تھے آزما لئے آج 21 ویں صدی میں دنیا کی سربراہی تبدیل ہو رہی ہے اور مغرب سے مشرق کی طرف چین کی ترقی کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہی ہے اور یہ بھی تقریباً وہی پالیسیز کو اپنے سربراہی میں جگہ دے رہے ہیں جو مغربی استعمار استعمال کر چکا ہے اور دنیا کے سامنے یہ تمام حقائق موجود ہیں۔ لہذا دانشمند ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ لیکن کیا ہمیشہ ترقی اور فضیلت کا معیار اقتصادی ترقی کو گردانا درست ہے؟؟ کیا انسانی اقدار اور انسانی رویئے کسی قوم کے اس قابل نہیں ہوتے کہ اس کو دنیا میں سپر پاور کہا جائے۔۔۔ بے شک معاش انسان کی ریڑھ کی ہڈی ہے لیکن یہ دماغ نہیں قلب نہیں ہے۔ انسانی رویئے، مزاج اور نفسانی صفات درست نہیں ہونگی تو معاش کو بڑھانے والی قوتیں بھی زوال پذیر ہو جاتی ہیں، حکومت و سربراہی اگر قوانین قدرت سے ہٹ کر خود کو خدا سمجھ کر کی جائیں گی تو بہت جلد یہ زوال پا جاتی ہیں۔

قوانین قدرت انسانی مزاجوں اور نفسیات و روحانیات (SPRITUALITY/PSYCHOLOGY) سے بھی مربوط ہیں، صرف طبعیات (PHYSICS) اور دیگر ماڈی چیزوں سے ہی مربوط نہیں ہیں۔

مغرب کی اندھی تقلید اور صرف مغرب کے زرق برق تمدن سے فریب کھانے والے جب دوسری اور تیسری دنیا سے کوئی فساد اٹھتا ہے تو بہت شور مچاتے ہیں مگر اسی مغرب میں جو روحانیت اور سماجی و معاشرتی تعمیری اور مثبت اقدار ہیں ان پر ان کی کبھی توجہ نہیں جاتی اور مغرب کی ماڈی سائنس و ٹیکنالوجی کے اصنام کی پرستش میں مشغول رہتے ہیں۔ اسی مغرب میں سوشل سائنسز پر جتنا کام ہورہا ہے ہمارے ہاں عشر عشیر بھی نہیں۔۔۔۔ مغرب میں عمومی طور پر انسانی اقدار، انسانی رویوں، اخلاق و کردار جو کہ ان کی حکومتوں سے مختلف ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ نیچرل سائنسز کے ساتھ یہاں معاشرتی علوم پر بھی تحقیقات کی گئی ہیں اور عوام کا مزاج تحقیقی ہے۔ لہذا ان سائنسدانوں سے قطع نظر جو خاص استعماری اور استکباری مقاصد کے تحت سائنسز کو استعمال کرتے ہیں یا وہ افراد جو خفیہ خاندانوں کی سرپرستی میں چلنے والے استحصالی اداروں کے ایجنٹ ہیں، عوام اپنے عوامی پن اور سادہ زندگی کے باعث اپنی ان حکومتوں پر تنقید اور احتجاج بھی کرتے ہیں۔ ہمیں دور رس نتائج کے حصول کیلئے اور ایک جامع منصوبہ کے تحت انسانی ماڈی ضروریات کے ساتھ ان کی روحانی اور نفسیاتی اور معاشرتی ضروریات جن میں سب سے سر فہرست انسانی رویئے اور انسانی اقدار ہیں، پورا کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ دنیا کو ہمیشہ سے ماڈی ترقی کے ساتھ

ساتھ روحانی و اخلاقی ترقی کی بھی ضرورت رہی ہے مگر دنیا نے ہمیشہ مادّیات کو روحانیت پر فوقیت دی۔ آج جب کے انفارمیشن انقلاب کا دور ہے اور معلومات اور دانش کا طوفان ہے تو یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر ہم تاریخ سے سیکھیں گے اور خداوند تعالیٰ جو کہ انسان کو کمال کی طرف لے جارہا ہے اور جو قوانین اس نے طبیعات اور روحانیات میں جاری و ساری کیے ہیں، انفارمیشن ٹیکنالوجی کی معلومات و دانش ان تاریخی حکیمانہ نکات کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائے گی اور انسان اپنے تابناک مستقبل کیلئے یقیناً جدوجہد کرے گا، ماضی کی غلطیاں نہیں دہرائی جائیں گی اور بالآخر دنیا پر روحانیت کا راج ہو گا۔ انسان اس دنیا میں ایک گھر کی طرح بھائیوں اور بہنوں کا خیال کریں گے اور دنیا کے روحانی حکام کو اپنے بزرگ اور والدین کی طرح سرپرست مانیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے، نئے انسانوں کیلئے اس دنیا کو اس طرح تیار کریں گے کہ ان اعمال کے ذریعے اپنی آئندہ کی دنیا کیلئے زادِ راہ فراہم کرنے کا باعث بنیں گے۔ انشاء اللہ

دینی راہنماؤں کی ضرورت کیوں ہے ؟!!

فرض کریں ایک انسان نے طے کیا کہ اُسے کراچی سے لاہور تک جانا ہے، اُس کا مقصد، ہدف اور منزل لاہور ہو گئی، اب طے یہ کرنا ہے کہ کیسے جانا ہے؟ ہوائی جہاز سے؟ ٹرین سے؟ کوچ سے؟ یا ذاتی ٹرانسپورٹ سے۔۔۔؟ اگر راستے کئی ہیں تو کس راستے سے جانا ہے؟

ہوائی جہاز کی کون سی کمپنی سے؟ یا کون سی سواری سے؟

اب یہ تو کوئی نہیں چاہے گا کہ سفر طویل ہو، آرام دہ نہ ہو، یا راستہ اچھا نہ ہو؟ وغیرہ نیز اگر یہ سب سہولیات میسر نہ بھی ہوں سکتی ہوں تو کم از کم اتنا یقین ضرور ہو کہ لاہور پہنچ ہی جاؤں۔۔۔ کوئی بھی ایسی سواری ہو یا راستہ کتنا ہی طویل اور تکلیف دہ کیوں نہ ہو اور کسی سہولت کی فراہمی ممکن نہ ہو تو یہ یقین ہونا کہ فلاں راستہ، فلاں سواری کسی نہ کسی طرح مجھے لاہور پہنچا تو دے بس۔۔۔!

لاہور کو منزل سمجھنا اور وہاں تک پہنچنے کے راستے اور سواری اور وقت کا تعین کرنا "علم" پر منحصر ہے۔۔۔۔

سواری بنانے والے کا نام مجھے نہ بھی پتا ہو،

سواری چلانے والے کا نام اور تاریخ پیدائش مجھے نہ بھی پتا ہو،

راستہ بنانے والے انجینئر کا نام اور قابلیت مجھے کچھ نہ پتا ہو،

بس یہ پتا ہو کہ،

ڈرائیور کو راستہ پتا ہے، گاڑی صحیح چلا لیتا ہے، سڑک کے قوانین جانتا ہے، راستہ صحیح ہے وغیرہ، تو میں اپنی منزل پر پہنچ جاؤں گا۔

میرے مطلب کی باتیں پتا کرنا کہ یہ کہاں سے معلوم ہوں گی یا کون ان معلومات کی اطلاع دے سکتا ہے، میری عقل و سمجھ دانی پر منحصر ہے۔۔۔ ضروری نہیں میں سواری کے خالق کے پاس ہی جاؤں یا میونسپلٹی کے دفتر جا کر سڑک کے تفصیلات معلوم کروں۔۔۔ بہت سی معلومات عمومی استعمال کے بعد زبان زد عام ہو جاتی ہیں، کس سے، کب، کس وقت کیا بات معلوم ہو سکتی ہے۔۔۔۔ یہ پتا ہونا چاہیے۔

اہلبیت علیہم السلام کی مثال زندگی کے سفر میں ایسے ہی راہنما، امام، رہبر اور ڈرائیور کی سی ہے۔ جن کی تاریخ پیدائش اور تاریخ شہادت ممکن ہو ہمارے لیے کسی مرحلہ میں فائدہ مند ہو مگر عمومی طور پر ہمارے لیے ان کا کردار ہمارے لئے منزل پر پہنچانے کیلئے مشعل راہ ہے،

MILE STONE ہے۔ انہوں نے کب، کس ماحول میں، کس کے ساتھ، کیا، کیوں کس لئے انجام دیا۔

اِن کی زندگیوں کے مطالعہ کے بعد ان کی زندگیوں میں غور و فکر پہلا مرحلہ اور اُس کے بعد اُس پر عمل کرنا ہی ہم کو منزل تک پہنچا سکے گا۔

منزل کا علم راستے خود تعین کرتی ہے، پہلے منزل کو طے کریں کہ جانا کہاں ہے، راستہ خود بخود مل جائے گا۔ راستہ مل جائے گا تو راہوار و رہبر بھی مل جائے گا۔ بغیر رہبر و گائیڈ کے بھٹک جانا فطری امر ہے۔

مہدویت

(مختصر الفاظ میں)

تمام عالم روحانیت (اسلام، یہودیت، عیسائیت، ہندو، بدھ، زرتشت وغیرہ) میں بھی یہ روایات موجود ہیں کہ آخری زمانے میں ایک نورانی شخص کے ذریعے دنیا سے ظلم و جور کا خاتمہ کیا جائے گا اور دنیا اخلاق و تہذیب اور امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ تاریخی تناظر میں تدریجاً انسانی شعور کو بلندی عطا ہوئی اور انسان نے اپنی دنیوی فلاح کیلئے بے انتہا محنت و جدوجہد کی اور مشکلات و پریشانیوں کو اپنی ہمت و صلاحیتوں سے کم کیا نیز سائنسدانوں، فلسفیوں یا انبیاء نے چاہے قدیم ہوں یا جدید ہمیشہ سے انسانی مادّی فلاح، نظریاتی فلاح اور روحانی و اُخروی فلاح (پیار، محبت اور امن) کی کوشش کی، وہیں بہت سے ایسے افراد بھی تھے جو ٹیکنالوجی اور صنعت کی ان نعمتوں کو لالچ کے تحت صرف اپنے پاس جمع کرنے کے خوگر رہے۔ قدیم زمانوں میں یہ قبیلوں کے سرداروں پھر جاگیرداروں اور آج سرمایہ داروں میں یہ صفت نمایاں نظر آتی ہے۔ ہر دور میں ان تین طبقات (سرداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں) نے ہر قسم کے علماء کا استحصال کیا اور علم کو انسانی استحصال کا ذریعہ بنایا نیز سائنس، فلسفہ اور روحانی علوم کے ماہروں نے بھی جب جب دنیا کی لذتوں پر توجہ کی یا دین کی طرف راغب افراد پر سختی و جبر کیا تو معاشرے کے دیگر طبقات اور خود ان کی اپنی

گمراہی کا بھی موجب ہوا۔ آج اکیسویں صدی میں جب علم اپنے جوبن پر ہے تو خصوصا یہ تین واضح استحصالی طبقات (سرداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں) پہلی، دوسری اور تیسری دنیاکے مصداق کے مطابق ہر درجے پر انسانی استحصال میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ ان کی قوت کی ایک وجہ خود کمزوروں کی آرام طلبی، عیش کوشی، غیر سنجیدگی، راحت طلبی بھی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ہر زمانے میں اسی استحصال سے نکالنے کیلئے انہی کمزور انسانوں میں سے بلند ہمت، بلند حوصلہ خداپرست، سنجیدہ، ذمہ دار مہربان اور رحم دل قسم کے انسانوں کو اپنی رسالت عطا کی دنیوی زعامت کی صلاحیتوں سے نواز کر انسانوں کو اس ظلم و جور سے نکالنے کیلئے اپنی طرف سے منتخب کیا۔ کبھی آدم اپنے ہی بیٹے کی طرف سے اذیت کا شکار نظر آتے ہیں، کبھی موسیٰ فرعون کے مد مقابل، کبھی عیسیٰ جھوٹ، دھوکے کے خلاف محاذ آرا، ابراہیم اور کبھی محمد رسول اللہ فکری اور مادّی استحصال کے خلاف نبرد آزما ہوتے ہیں۔ نبوت کے بعد آل محمد اسی محبت، امن، پیار، مہربانی و رحم دلی کے نفاذ کی خاطر اس نظام کے مخالفین سے رزم و جہاد کا پیکر نظر آتے ہیں۔ انسانی شعور میں مرکزیت کی اہمیت کا احساس اور معاشرے کی بھی مرکزی قوت انتظامی قوت و حکومت کا شعور پیدا ہونے کے ساتھ جابروں اور ان کے مدد گاروں نے بھی حکومت کی جدوجہد شروع کی اور دینداروں نے بھی۔ فرق یہ رہا کہ جابر، توحید کے انکار کے ساتھ ہر لذت اور دنیااندوزی کی خاطر اس حکومت کے حصول کیلئے ہر طرح کے وسیلے اختیار کرنے لگا جبکہ دینداروں نے حکومت کو معاشرے سے ہرج و مرج دور کرنے، ظلم و فساد سے روکنے اور کمزوروں کے

حقوق کی ادائیگی کے ذریعے صداقت، دیانت اور امانت کو اپنابنیادی اصول قرار دیا۔ آج بھی جب دنیا میں یک طرفہ ترقی اور تہذیب کی بات کی جارہی ہے تو دوسری طرف98٪ انسانی طبقات2٪ سرمایہ داروں کے رحم وکرم پر ظلم وسفاکیت کا شکار بنے ہوئے ہیں۔عالمی امن کے ادارے ہوں،یاعالمی معاشی واقتصادی ادارے ہوں، تعلیم وفنون وہنر وابلاغ کے میدان ہو، سیاسی معاملات ہوں یا مذہبی رسومات۔ ہر طرف شیطان پرست سرمایہ دار نے اپنی دنیوی لذت اندوزی کیلئے ہر سطح اور جگہ پر استحصال کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ دوسری طرف صورتحال یہ ہے کہ کمزور اپنی کم ہمتی، کم حوصلگی، آرام طلبی، عیش کوشی کو ختم کرنے کے بجائے، ظلم و سفاکیت کو مٹانے کے بجائے انتہائی کم قیمت پر اپنی خداداد صلاحیتوں کو سرمایہ داروں کی صنعتوں میں پیدا ہونے والے مال کے معاوضے کے طور پر بیچ رہاہے۔دین جو بلند ہمت انسانوں کی طرف سے معاشرے کو ہر طرح کی نفسیاتی الجھنوں اور مادّی جکڑ بندیوں سے نجات دینے آیا تھا اُس کو اسی کمزور معاشروں نے صرف رسومات کا مرقع بنا دیا۔ خدا کی طرف سے آخری نمائندہ اسی سبب ظاہر نہیں ہورہاہے کہ ہم98٪ اس دنیا کی عوام اگر اپنے حقوق اور آزادیوں سے آگاہ بھی ہیں تو کم ہمت ہیں، کم حوصلہ ہیں، آرام طلب و عیش کوش اور راحت طلب ہیں اور اسی سبب ہمارے پاس جدید زمانے کے مطابق جدید شیطان سے لڑنے کیلئے جدید وسائل و ذرائع ہی نہیں ہیں جس سے ہم اس سرمایہ پرست شیطان کو زیر کر سکیں۔ ہمیں ہر شعبے میں ماہرین بنانے ہوں گے تاکہ اس آخری ہادی وحاکم کیلئے ٹیم تشکیل دے سکیں۔اپنے فروعی اختلافات کو بھلاکر، دنیاپرستی اور لذت

اندوزی کو ترک کر کے بلند اہداف کیلئے جدوجہد کرنی ہے۔لہذا خود کو نہایت سنجیدگی، سخت کوشی اور دوسروں کیلئے رحم دلی، نرم دلی کے ساتھ اپنی محدود زندگی کو بامقصد بنانا چاہیے ایسی معاشرتی منصوبہ بندی جس میں اہل دانش و دیندار قائد کی محبت و اطاعت سے معاشرے کو آخری حجت خدا کیلئے تیار کر سکیں۔ انشاء اللہ المستعان

جذباتی نعرے اور سنجیدہ عمل

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نعرہ کسی شخص۔ خاندان۔ گروہ یا قوم کی شناخت ہوا کرتی تھی۔ اپنے اس نعرے یا قول کی خاطر فرد۔ خاندان۔ گروہ یا قوم اپنی جان تک قربان کر دیتے تھے مگر یہ گوارا نہیں کرتے تھے کہ کوئی اُن کو یہ کہے کہ "نعرہ کچھ ہے اور عمل کچھ اور"۔ نعرے اب بھی ہیں اور پرانے وقتوں کی طرح حِلم سے نہیں بلکہ ببانگِ دہل لگائے جاتے ہیں مگر اب ان نعروں کا مقصد عام طور پر اپنے گھناؤنے عمل پر پردہ ڈالنا ہوتا ہے۔ جہاں نظریہ حیات اور آئیڈیالوجی نہ ہو یا نظریہ تو ہو لیکن عملی رفتار اس نظریے کے مطابق نہ ہو تو وہاں جذباتی نعروں سے خلا پُر کیا جاتا ہے۔ نعرے اُس وقت کارآمد ہیں جب ہم اپنے ہاتھوں اور دماغ کو بھی استعمال کر رہے ہوں۔

میلاد کی محافل ہوں، عزاداری کی محافل ہوں، زیارت گاہیں ہوں، مساجد ہوں، نمازِ جماعت ہوں، حتیٰ حج و عمرہ ہوں یا دیگر مذہبی محافل! ہزاروں اور لاکھوں کا جمِ غفیر نظر آتا ہے۔ شاعروں اور نکتہ گوئیوں، مداح سراؤں کی خیال بافیاں ہم بہت شوق سے سنتے ہیں، واہ واہ کرتے ہیں، جھومتے ہیں۔ عشق رسول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عشقِ امام حُسین علیہ السلام میں لاکھوں اربوں قصیدے اور منقبتیں ہم لکھ چکے ہیں اور پڑھ چکے ہیں اور جھوم

چکے ہیں مگر اسی رسول دوجہاں صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے شہزادے حسن و حُسین علیہ السلام کی سیرت پر چلنے کیلئے ہمیں خدا معلوم کون سے حالات درکار ہیں؟؟

مگر جہاں زحمت و سختی ہو وہاں عوام الناس کم ہی نظر آتی ہے، جیسے بازار میں دھوکہ بازی سے بچنے میں، لین دین میں کھرا ہونے میں، مصیبت زدہ کی مدد کرنے میں، کسی مسکین کو کھانے کھلانے میں، کسی یتیم مفلس بچے کا تعلیمی خرچ اٹھانے میں، بے لباس کو لباس دلانے میں، حلال تفریح کے مواقع پیدا کرنے میں، تعمیری اور تخلیقی انسانوں سے میل ملاپ کرنے میں، کردار اور اخلاق کی آبیاری کرنے میں، کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے میں، کسی کو روزگار دلانے میں وغیرہ وغیرہ

مسلمان معاشرے کی بنیادی مادّی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان، پانی، سواری وغیرہ فراہم کرنے میں ہم کس قدر ملاوٹ اور دھوکہ بازیاں کرتے ہیں۔ کبھی گائے کی گوشت کی جگہ کتے اور گدھے کا گوشت ملتا ہے، پینے کے پانی کی جگہ سیوریج کا پانی ملتا ہے، مصالحوں میں عمارتی رنگ اور لکڑی کے برادے ملتے ہیں، دودھ میں پانی، دواؤں میں ملاوٹ، ڈاکٹر دو نمبر، وکیل دو نمبر، مولوی دو نمبر، مکینک دو نمبر وغیرہ وغیرہ

اداروں میں کرپشن، دو نمبر مال بیچتے ہوئے ریڑھی پر کرپشن، قوانین توڑتے ہوئے سڑک پر کرپشن، گھر بناتے ہوئے کرپشن، وغیرہ

کیا ہمارے سماج میں چرس، ہیروئن، شراب کے اڈے نہیں ہیں؟ کیا یہاں قحبہ خانے اور جنسی تسکین کے مراکز نہیں ہیں؟ اس سماج میں فحش محافل کا انعقاد نہیں ہوتا؟ اگر ہیں تو یہاں کیا ہندو، عیسائی، یہودی، آغاخانی اور احمدی جاتے ہیں؟؟

انٹرٹینمنٹ کے نام پر ٹی وی چینلز کون سی حلال اور اسلامی تفریح فراہم کر رہے ہیں، ان چینلز کو دیکھنے والے کیا سارے ولی اللہ بن گئے ہیں؟ یا کیا پوری قوم سائنسدان اور دانشور بن گئی ہے؟

تحریک پاکستان کا دعویٰ تھا کہ ہم اپنی مذہبی رسومات اور عبادات بجالانے میں ہندوؤں کے ساتھ مشکل سے دوچار ہیں، ہندو اور مسلم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔۔۔وغیرہ وغیرہ، سوال یہ ہے کہ وہ مذہبی رسومات کون سی ہیں؟ جن کیلئے الگ سے وطن کا مطالبہ کیا گیا؟ دین کے نام پر فرقہ بازیاں، تکفیری فتوے، جبر و تشدد، دہشت گردی، کرپشن، ملاوٹ، دھوکہ و فریب، معاشی، سیاسی، سماجی استحصال۔۔۔؟؟؟!!!

تعلیم کے نام پر کاروبار ہم چلاتے ہیں، مسلمانوں کو منافع دینے کے نام پر فراڈی کمپنیاں ہم نے بنائی ہوئی ہیں، رکشہ ٹیکسی اور موچی تک کرپشن میں ملوث ہے، سرکاری اداروں اور اہلکاروں کو رہنے دیں، وہ توبقول شخصے ہیں ہی حرام خور۔ مگر یہ عوام جو خود کو بہت مظلوم اور لاچار بے یار و مددگار ظاہر کرتی ہے خود کون سی آسمانی ملائکہ کی ہم صحبت ہے۔ ایک بھنگی

تک کرپشن میں مبتلا ہے، اسلام و قرآن کا صرف نام ہے، بلند و بانگ دعوے اور نعرے! مگر عمل میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ زیرو!!

صرف خالی خولی دعوؤں یا سلبی افکار و اعمال کافی نہیں بلکہ دین و دنیا کا منطقی ربط اور مثبت اعمال، موقع اور جگہ کی مناسبت سے صالح اور پاکیزہ عمل بارگاہ الٰہی میں قبول ہے۔ دعوؤں اور نعروں کے ساتھ سنجیدہ اعمال ہمارے لئے جنت کی بشارت ہیں۔ لہذا اپنے دعویٰ ایمانی کو اعمال صالحہ اور دانشورانہ بصیرت کے ساتھ انجام دینے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔ ہم ایک طرف جہاں مغرب و کفّار کی چالبازیوں اور دھوکہ بازیوں کی مذمت کرتے نہیں تھکتے وہیں ہم کو اپنی ذات اور اپنی قوم پر تنقید کرنی چاہیے، خود تنقیدی ایک ایسا عمل ہے جس سے گزر کر قومیں اپنی شناخت حاصل کرتی ہیں اور اپنی اصلاح کرتی ہیں۔ خود تنقیدی اُس آئینے کی طرح ہے جو ہمارے چہرے کے میل کچیل کو ہمیں دکھا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ میں اُسے صاف کروں اور ستھرا بنوں، لیکن اگر میں آئینہ توڑ دوں کہ یہ مجھ سے تعصب کرتا ہے تو میری یہ جہالت میری اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی روحانی و معنوی سرحدوں کی بھی حفاظت فرمائے، ہمیں دینِ اسلام کے منابع (قرآن، حدیث، سیرت) پر غور و فکر، تدبر و تعقل کرنے اور درست، منطقی معارف و تعلیمات سے آگاہ فرمائے، ہمارے دینی اور دنیاوی علوم کے خزانوں کے حصول میں میں برکت مرحمت فرمائے نیز ہم کو ان معارف پر چلتے رہنے کی ہمیشہ توفیق عطا فرمائے۔

ہجرت یا فرار!!

☆ جن لوگوں کو ملائکہ نے اس حال میں اٹھایا کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے تھے ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے - انہوں نے کہا کہ ہم زمین میں کمزور بنادئے گئے تھے ملائکہ نے کہا کہ کیا زمینِ خدا وسیع نہیں تھی کہ تم ہجرت کر جاتے - ان لوگوں کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ بدترین منزل ہے۔(سورہ نساء /97)

☆ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا وہ رحمت الٰہی کی امید رکھتے ہیں اور خدا بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (سورہ بقرہ /218)
☆ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور راہِ خدا میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا اور جنہوں نے (مہاجرین کو) پناہ دی اور مدد کی یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اور جن لوگوں نے ایمان اختیار کر کے ہجرت نہیں کی ان کی ولایت سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک ہجرت نہ کریں اور اگر دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو تمہارا فرض ہے کہ مدد کردو علاوہ اس قوم کے مقابلہ کے جس سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے کہ اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔(سورہ انفال /82)

☆ بیشک جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت کی اور راہِ خدا میں جان اور مال سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک عظیم درجہ کے مالک ہیں اور درحقیقت وہی کامیاب بھی ہیں۔ (سورہ توبہ /20)

☆ اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ہجرت کی اور پھر قتل ہوگئے یا انہیں موت آگئی تو یقیناخدا انہیں بہترین رزق عطا کرے گا کہ وہ بیشک بہترین رزق دینے والا ہے۔ (سورہ حج /58)

☆ یہ منافقین چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ اور سب برابر ہو جائیں تو خبردار تم انہیں اپنا دوست نہ بنانا جب تک راہِ خدا میں ہجرت نہ کریں پھر یہ انحراف کریں تو انہیں گرفتار کرلو اور جہاں پا جاؤ قتل کردو اور خبردار ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بنانا۔ (سورہ نساء /89)

☆ کہہ دیجئے کہ اے میرے ایماندار بندو! اپنے پروردگار سے ڈرو جو لوگ اس دار دنیا میں نیکی کرتے ہیں ان کے لئے نیکی ہے اور اللہ کی زمین بہت وسیع ہے بس صبر کرنے والے ہی وہ ہیں جن کو بے حساب اجر دیا جاتا ہے۔ (سورہ زمر /10)

☆ اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کروگے تو ان کی مدد خدا نے کی ہے اس وقت جب کفاّر نے انہیں وطن سے باہر نکال دیا اور وہ ایک شخص کے ساتھ نکلے اور دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ رنج نہ کرو خدا ہمارے ساتھ ہے پھر خدا نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبر پر سکون نازل کر دیا اور ان کی تائید ان لشکروں سے کر دی جنہیں تم نہ دیکھ سکے

اور اللہ ہی نے کفّار کے کلمہ کو پست بنا دیا ہے اور اللہ کا کلمہ درحقیقت بہت بلند ہے کہ وہ صاحبِ عزت و غلبہ بھی ہے اور صاحبِ حکمت بھی ہے ۔ (سورہ توبہ /40)
☆ اور جو بھی راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے گا اس کے بعد اسے موت بھی آجائے گی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورہ نساء /100)

مندرجہ بالا آیات مقدسہ کی روشنی میں مختصر تشریح یہ ہے کہ ہجرت کا مقصد ایمانِ اسلامی کے ساتھ جان کی حفاظت ہے تاکہ تبلیغاتِ اسلامی کو نشر کرنے کا موقع حاصل کیا جا سکے یا وطن کے حالات بہتر ہونے تک کسی ایسی غیر جگہ رہا جائے جہاں اسلامی اعتقادات کے ساتھ اپنے روزمرہ اسلام کے تبلیغاتی کاموں کو انجام دینا ممکن ہو، عموماً اگر کفار ممالک میں ایمان بالاسلام کے ساتھ روزمرہ زندگی گذارنا ممکن نہ ہو تو ایسی جگہ ہجرت کرنا جائز نہیں۔ نیز ہجرت وطن واپسی کی نیت یا اسلام کی ترقی کی نیت اور کوششوں کے ساتھ ہو۔ یعنی ہجرتِ اسلامی کو بہانا بنا کر دُنیا داری کی خاطر سفر اختیار کرنا یا وطن کو چھوڑ دینا ہجرت نہیں فرار ہے۔ البتہ معاشی سفر بھی اگر ایمان و اسلامی فکر کے ساتھ نہ ہو تو یہ بھی مقصد انسانی سے فرار ہے۔۔۔۔۔!!

فرار کے مفاسد بہت ہیں نیز یہ فرار جہادی زندگی یعنی کوشش و محنت سے فرار کا استعارہ ہے۔ اسلام و مسلمین کی فلاح و ترقی کیلئے کیا جانے والا ہر عمل جہاد ہے جس کا پہلا فریضہ

وطن میں ہے اور اسی عمل جہاد کی خاطر سفر کرنے والا یا وطن ترک کرنے والا مہاجر ہے۔ وہ لوگ جو کمزور عقیدہ اور جہادی جذبہ سے سرشار نہیں ہوتے اور اپنی جانوں کو عظیم اسلامی مقاصد کے تحت بچانے کے بجائے دنیا کی زندگی کی خاطر وطن ترک کرتے ہیں مہاجر نہیں کہلائیں گے۔ شاید ان کو حامیِ دین کہا جائے گا حاملِ دین یا مہاجر کہنا صحیح نہیں ہے، ہر وہ عمل جو اسلام کے نام پر کیا جائے مگر بلند سیاسی اہداف سے عاری ہو عبث اور لغو ہے۔ خلاصہ یہ کہ دین کی ترقی کی خاطر ترک کیا جانے والا ترکِ وطن ہجرت اور دنیا کی خاطر ترک وطن کرنا فرار ہے۔

جدید دور میں عالمی مقتدر اسلامی نظام کی ضرورت

خوف، جاہ و حشم کی طرح مال و زر دنیا پرستی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، جسمانی بالغ افراد میں اسی مال وزر کی لالچ میں تمام برائیاں جنم لیتی ہیں، سماجیات، جنسیات، سیاسیات، علمیات، ذاتیات وغیرہ میں جب جب بھی فساد و کرپشن پیدا ہوا دیگر رذیلہ کرداروں کے ساتھ اسی مال زر کی ہوس اور لالچ کے سبب عالم انسانیت کو عظیم مصیبتوں میں مبتلا کیا۔

خداوند کریم نے جو ہدایات زندگی کو سعادت مند بنانے کیلئے اپنی کتابوں، صحیفوں اور انسانی راہنماؤں کی صورت میں تحفے کے طور پر اس زمین پر اتاریں وہ انسانوں کو ایام بلوغت میں پیدا ہونے والے مفاسد سے دور رکھنے کیلئے اس انداز سے پیش کی گئیں کہ بچپن سے ہی مذہبی تربیت پر زور دیا گیا۔

اخلاق حسنہ کی تربیت کے تمام جواہر اور تعلیمات کتابی صورت سے لیکر عمل کرکے بھی انسانوں کو دکھائی گئیں اور کافی حد تک تربیت کی گئی۔ رسول خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن پر تمام ابعادِ معاشرہ کے تناظر میں اخلاقی تربیت کے تمام رموز اور ہدایات تمام ہوئے اور انسان فکری و ذہنی سطح کے اس مرحلے پر آ گیا کہ سائنس و ٹیکنالوجی کتنی ہی ترقی کرلے وہ فطرت نفس جس میں اخلاق حسنہ پرورش پاتا ہے نیز دنیا اور معاشرے کو منظم کرنے والے وہ تمام ابعاد جو اپنی آخری سطح پر پہنچ چکے تھے اور اب کسی نئے نظریے اور روش سے لاتعلق

ہو گئے۔ ان کلی ہدایات کی روشنی میں معاشرے کو نظم دینا بھی نبی اور جانشینانِ رسول کی ذمہ داری ہے۔

علم خواہ مذہبی ہو یا سائنسی اور جب بھی خلوص نیت کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے اور برتا جاتا ہے تو دنیاوی خوف، دنیوی جاہ و حشم، مادی لالچ، رعونت، تکبر، دھونس اور جبر سے پاک ہوتا ہے۔ نئ شریعت جب بھی معاشرے میں پیش کی گئ وہ انہی اصولوں کا احیاء تھا جو متروک کر دیئے گئے تھے اور نئ اخترعات کے ساتھ ان اصولوں میں بھی من مانی تحریفات ہوئیں جن کا مقصد شیطانی مقتدر قوتوں کے مفادات کا تحفظ تھا۔

قرآن مجید اور سیرت معصومین علیہم السلام کی روشنی میں انسان نے علم و دانش کے وہ رموز جو قرآن و معصومین علیہم السلام کے توسط سے انسانی معاشرے میں پیش کیے گئے تھے، تحقیق، تدبر کو جب سے استقرائی اور استخراجی انداز میں علمی مراحل سے گذارنا شروع کیا تو مذہبی تعلیمات مختلف علمی تناظر میں حقیقت اور یقین حاصل کرتی گئیں۔

یعنی پہلے جو مذہب صرف تقدس اور احترام یا غیب کی صورت میں انسانی اعمال کی بنیاد تھا اب تحقیق، تدبر، غور و فکر اور تجربے کی صورت میں ان احکامات کے فلسفے سے بھی روشناس ہو گیا اور پھر انسانوں کے پاس اس بات کی کوئی وجہ نہیں رہ گئی کہ مذہب غیر ضروری ہے۔ البتہ دیگر اخلاقی تبلیغات کے ساتھ آج کے دور میں دینی تشہیر و تبلیغ کے ساتھ دین کو دیندار معاشروں میں بطور مقتدر سیاسی قوت کے پھیلانا چاہیے۔ دین کا سماجی پہلو مقتدر سیاسی قوت

کے صرف زبانی کلامی باتیں ہیں۔ عبادات جہاں نفسیاتی استحکام عطا کرتی ہیں اور اخروی فوائد کی حامل ہیں تو ان کے مادی اور ظاہری فوائد بنا مقتدر سیاسی قوت و نظام کے عبث ہیں۔ اخلاقی کمال تو آج کے دور میں علم نفسیات اور اخلاقیات کے ذریعے قرآن حدیث کے بنا یعنی مذہب کے بغیر بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ آج جب ہم مذہب کی پہچان کرائیں تو اسی مقتدر سیاسی قوت و نظام کے کرائیں جس میں سب کو اخلاقی نظم و ضبط میں رہنا لازمی ہے۔ چاہے سائنس دان کوئی نئی اختراع کرے, فلسفی نیا نظریہ دے, نیا تجربہ کیا جائے وغیرہ مگر مذہبی قیادت کے زیر نگرانی۔۔۔ اس دائرہ میں رہ کر آزادی ہے۔۔۔ اور یہ دائرہ قرآن و سنت کا ہے۔

آئندہ ادوار میں صرف وہ مذہب باقی رہے گا جس کے پاس ٹھوس سیاسی نظام ہو نظریے کی صورت میں یا عملی شکل میں۔۔۔ وہ مذاہب جو صرف قلبی تسکین اور ذاتی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں ناپید ہو جائیں گے۔

ماضی کے مذہب کی طرح سائنس بھی آج سرمایہ داروں، صنعتکاروں اور بینکاروں کی لونڈی بن چکی ہے۔ اسی طرح سے جب مذہب کے نام پر سرمایہ داروں نے مولویوں پادریوں پنڈتوں ربیوں کی شکل میں مذہب میں من مانیاں کیں اور اصل مذہب کی جگہ مفاد پرست دنیوی احکام انسانوں پر لادے تو خدا کی طرف سے ایسے مہین اور غیبی دروازوں سے خداوند کریم نے مصلح انسانیت کو ارسال کیا اور مسائل کو حل کیا۔ آج جب سائنس کو مذہب کے مقابل لاکر سرمایہ داروں، صنعتکاروں نے دنیا پرستی، مال و زر کا دھندہ شروع کر دیا ہے تو

ضروری ہے کہ ہم خدا کی مدد کرتے ہوئے ایسے تمام فریبی مذہبی احکامات اور فریبی سائنسی کلیوں کے مقابلے پر مذہب کی مقتدر سیاسی قوت و نظام کے اجراء کی کوششیں اور مجاہدت کریں جو جدید دور کی رعونت و تکبر، لالچ و جھوٹ، دھوکہ وفریب کے مقابلے میں مستضعف انسانوں کی مددگار ہو۔

خدا پر عقیدہ رذیلہ صفات سے اجتناب کا ایک موثر ذریعہ ہے،لہذا رذیلہ صفات سے دور عالمی معاشرے کیلئے ضروری ہے کہ اخلاق حسنہ کی حامل مقتدر طاقت، جو رذیلہ صفات کے حاملوں کی تربیت کرے اور اگر وہ حاملین تربیت کے قابل نہ ہوں تو ان سے سختی سے برخورد کرے، عالمی معاشرے کی سعادت و مسرت کیلئے ناگزیر ہے۔

دین ہمارا مددگار یا ہم دین کے مددگار

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔(سورہ محمد 47- آیت 7)

خدا اور آل محمد علیہم السلام کے اختیارات کے بارے میں جو غالی و اصولی کی بحث آجکل پورے زور شور سے بعض حلقوں میں جاری ہے اور ہر ایک خدا اور معصومین علیہم السلام کے اختیارات طے کرنے کا ٹھیکیدار بنا ہوا ہے بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ اور معصومین علیہم السلام کی ذمہ داریاں اور اختیارات پر بحث کریں ان ہستیوں نے جو تعلیمات ہمیں دی ہیں وہ ہمارے مسائل، مشکلات، پریشانیوں، مصائب، سختیوں وغیرہ کے حل کیلئے کافی ووافی ہیں، ہم کو اِن وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے خود کو ائمہ معصومین علیہم السلام کی نصرت کیلئے تیار کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنے مسائل و حاجات کیلئے ان ہستیوں سے رابطے کے بجائے ان ہستیوں کے مسائل اور احتیاجات کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، یعنی ہمیں اُس سسٹم اور نظام کیلئے خود کو تیار کرنا ہے جو ان ہستیوں کی بدولت یا ان کی آسانی رفع کرنے کیلئے ہمیں عطا کیا گیا ہے تا کہ ہم

اپنی ذمہ داری ادا کریں، الہامی کتب اور ان عظیم ہستیوں کے بنائے ہوئے قوانین کو اس کائنات کے نظام کو اپنے فطری تقاضوں کے مطابق چلنے کیلئے بنایا گیا ہے۔

ہمیں اپنی حاجات کے بجائے ان ہستیوں کے نام کی بلندی اور ان کے حمایت یافتہ، ان کے مطیع نظام کے قیام کیلئے کام کرنا ہے، ہمیں ان کا مطیع بن کر تقویٰ پرہیز گاری کے ساتھ دنیاوی علوم و فنون میں مہارت کے ذریعے ان کو غیبت اور مصائب سے باہر لانا ہے، اس زندگی میں یہ ہماری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ ان عظیم ہستیوں کی مشکلات و مصائب ہماری وجہ سے ہیں اسی وجہ سے ان کی آسانی ہماری آسانی ہے، ان کی مشکل ہماری مشکل ہے، یہ ہیں تو ہم ہیں لہذا ہمیں ان کے وجود کیلئے عملی جدوجہد کرنی ہے اور ایسے معاشرے کا قیام عمل میں لانا ہے جو ان کی زندگیوں، آسانیوں اور اطمینان کیلئے آمادہ بہ عمل ہو۔ ہمیں ان کی مدد کرنی ہے تب وہ ہماری مدد کریں گے جب ہم ان کی ولایت و امامت کے قیام کیلئے جدوجہد کرلیں گے اور ولایت و امامت کا اطاعت گذار معاشرہ تشکیل دے دیا جائے گا تو پھر ہماری معاشی، تہذیبی و ثقافتی، سیاسی، تعلیمی، تفریحی تمام مسائل کا حل ایک دم نہیں بھی تو ایک نہ ایک دن ہو ہی جائے گا، کیونکہ نظام اپنے فطری سانچے میں آجائے گا اور گاڑی درست سمت میں چل پڑے گی۔ یا علی علیہ السلام مدد کہنا، یا اللہ مدد کہنا، معصومین علیہم السلام سے مانگنا یا خدا سے مانگنے کے نعرے اس بات کا اظہار ہیں کہ ہم ان کی مشکلات و ھل من ناصر اً کے جواب میں اپنے مسائل لیے بیٹھے ہیں، ہمیں ہماری شادی، اولاد نرینہ، روزگار کیلئے تعلیمی اداروں میں داخلوں، نوکری کیلئے بلاد کفر کے ویزے وغیرہ درکار ہیں۔ ہمیں آل

محمد کی مدد کرنی چاہیے بجائے اس کے ہم اپنے فنا پذیر دکھڑے روتے رہتے ہیں، ہم اگر سماجی اور معاشتی مسائل کے حل کیلئے معصومین علیہم السلام کو اُن کی اصل جگہ جو خداوند خدا نے انہیں عطا کی تھی اور ہمارے لئے امتحان قرار دیا تھا کہ تمھاری بصیرت اور ہمت سے یہ نظام قائم ہو گا ورنہ خدا خود چاہتا تو سب انسان سجدے میں گر جاتے، علی علیہ السلام اور معصومین علیہ السلام چاہتے تو کوئی چوں بھی نہ کر پاتا مگر مولا نے ہماری آزمائش کیلئے یہ فیصلہ ہمارے سپرد کیا کہ ہم اپنے اور دوسرے انسانوں کے استحصال سے پاک معاشرے کیلئے ان کا انتخاب کرتے ہیں یا اپنی نفسانی خواہشات، خوف و دہشت کے زیر اثر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ ہم کو اس سوچ کو ختم کر کے خود کو اس بات کا اہل ثابت کرنا ہے کہ ہم اپنی مشکلات و پریشانیوں سے زیادہ ان ہستیوں کی مشکلات و مصائب کو دور کرنا چاہتے ہیں اور ہم اپنے تھوڑے تھوڑے عمل سے زیادہ عمل کرنے تک کے ذریعے اس بات کو خدا فرشتوں اور ابلیس پر ثابت کریں کہ ہم وہ نہیں جس کے بارے میں ملائکہ نے خدا سے تعجب کیا تھا کہ اُس بشر کو پیدا کر رہے ہیں جو زمین میں فساد برپا کرے گا!!

خدا ہم سب کو ہماری ذمہ داریاں بحسن ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جس سے حق خدا اور حقِ معصومین علیہم السلام ادا کرنے کی سعی کر سکیں۔

سستی و کاہلی کی وجوہات اور ان کا تدارک

ہر انسان یا قوم میں ہمت و استطاعت کے معیار مختلف ہوتے ہیں، جس کا بنیادی سبب اس شخص یا قوم کے اہداف (goals) سے ہوتا ہے جس کو وہ اپنی زندگی میں حاصل کرنا چاہتے ہیں، جس کی خاطر جدوجہد کرتے ہیں یا زندگی گذارتے ہیں۔ ان بنیادی اہداف کے ذیل میں کچھ جزئی اہداف ہوتے ہیں، جن تک رسائی انسان کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ہمت و انرجی بڑھاتی ہے اور یہ انرجی اگلے جزئی اہداف اور اصل ہدف سے قریب کرنے کی ہمت کا باعث بنتی ہے۔

اہداف یا خواب جھوٹے اور کاذب بھی ہوتے ہیں، جن کی حقیقت میں کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ اس کا ادراک کہ کوئی ہدف یا خواب تعبیر رکھتا ہے یا نہیں اسی وقت پتا چلتا ہے جب اس کیلئے جدوجہد کرنے کیلئے مطلوبہ انرجی حاصل ہونا مفقود ہو جائے۔ جب ہمتیں ٹوٹنے لگتی ہیں، تھکن اور غصہ میں اضافہ ہونے لگتا ہے، جب اہداف تک رسائی نہ ہو پا رہی ہو۔ یہ امر کم ہمتی، حوصلہ شکنی، نا امیدی اور پھر سستی و کاہلی کا سبب بھی بنتا ہے۔ یہ فردی اور معاشرتی زوال کی نشانی ہے۔ معیارِ ہمت و استطاعت وقت اور جگہ کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ مفکرین معیشت کو ہمت و استطاعت کا بنیادی معیار قرار دیتے ہیں۔ شاید

تیسری دنیا کی کم ہمتیں اسی وجہ سے ہیں؛ جس میں استعماری طاقتوں کے سازشی اسباب بھی شامل ہیں، البتہ میں اس فکر سے اتفاق نہیں کرتا۔

عظیم اہداف کے حصول کیلئے جب منصوبہ بندی کی جائے تو اس کی بنیاد الٰہی تعلیمات پر ہونی چاہیے، اور دراصل اہداف عظمت حاصل ہی اس وقت کرتے ہیں جب وہ الٰہی بنیادوں پر استوار ہوں جن کے حصول کیلئے اسٹریٹیجی اور طریق کار الٰہی ہوں۔ ترجیحات کا معیار زمان و مکان و شخصی کیفیت کے تناظر میں الٰہی ہو۔ موجودہ وقت میں حاصل ہونے والے کامیابیوں سے حوصلہ لینے کے ساتھ ماضی کے الٰہی کرداروں سے بھی حوصلہ لینا اسٹریٹیجی میں شامل ہونا چاہیے۔ ماضی اور حال کی یکجائی جہاں اہداف کے تعین میں کامیاب کرتی ہے وہیں ان اہداف کی عملی کامیابی میں بھی مددگار ہوتی ہے۔

غرض سستی، کاہلی، آرام طلبی، عیش کوشی محدود اہداف کے حصول کے بعد وقوع پذیر ہوتی ہے، مگر خدا جو کہ لامحدود ہے اور جس کی جنت میں پہنچنے کیلئے لامحدود جدوجہد کرنی ہے کبھی بھی سستی، کاہلی اور آرام طلبی کا باعث نہیں بنتا۔ بظاہر کسی قوم کی عیش کوشی، راحت اندوزی وغیرہ اس بات کی دلیل ہیں کہ عقیدہ توحید سمجھ نہیں آیا ہے اور قوم یا شخص کنفیوز ہے۔ بنیادی عقائد کی تفہیم حاصل نہ ہونے کی وجہ علم کے حصول کا شوق نہ ہونا ہے۔ علم خدا کی صفت ہونے کے باعث لامحدود ہے لہذا طالب علمی کی اشتہا بھی انسان کو یا قوم کو آرام طلبی اور سستی و کاہلی سے دور کرتی ہے۔

دائرہ سکون (comfort zone) جب پیدا ہو جاتا ہے اور وسعت پانے لگتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اہداف کی عظمت و معراج حاصل ہو چکی ہے۔ لہذا جب بھی ایسا ہو تو اہداف کی وسعت اور بلندی کو بڑھا دینا چاہیے۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جب زندگی کا پروگرام و نظام الٰہی بنیادوں پر چل رہا ہو، کیونکہ غیر فطری اور غیر انسانی اہداف ایک خاص حد پر جا کر نہ صرف یہ کہ تکمیل نہیں پاتے اور دائرہ سکون نہیں حاصل کر پاتے بلکہ مستقبل کیلئے صرف خوابِ غیر تعبیر شدہ کی طرح ہو جاتے ہیں۔

مختلف افراد یا مختلف معاشروں میں دائرہ سکون کی کیفیت الگ الگ ہو سکتی ہے، ایک سطحی مثال ہے جیسے کہ کوئی 1000 روپے پر قناعت و سکون کی وادی میں آ جاتا ہے اور کوئی کروڑوں روپے پر بھی سکون میں نہیں آتا۔ ایک مذہبی مثال ہے کہ کوئی واجبات و فرائض پر قانع ہو کر سکون پا جاتا ہے کوئی ان کے ساتھ مستحبات و نوافل وغیرہ سے بھی سکون نہیں پاتا۔

لہذا سستی، کاہلی، آرام طلبی، عیاشی، راحت و سکون وغیرہ جس کا انجام کار تھکن، غصہ وغیرہ ہے جو نابودی کی نشانیوں میں سے ہے، سے بچنے اور دور رہنے کیلئے ضروری ہے کہ عظیم اہداف سے پہلے عقائد کو، کائناتی نظریہ کو (world view) عظیم بنائیں، اس کیلئے علم و دانش کو صرف دلیل و منطق کی بنیاد پر حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ کیونکہ منطقی علم و دانش کی بنیاد پر بنائے گئے اہداف (Goals) ہی ہونگے جو فطری ہوں گے، عظمت کے حامل ہونگے اور جن کی تعبیر ممکن ہو گی۔ کوئی قوم ہو یا فرد، سب کیلئے ایک ہی نسخہ ہے۔

آج بر صغیر اگر اپنی ماضی کے طمطراق کے بعد زوال یافتہ ہے تو اسی طرز پر مغرب بھی اپنے طمطراق پر زوال سے نزدیک ہے اور کچھ دوسرے معاشرے بلند الٰہی یا انسانی اہداف کی بنیادوں پر آگے آرہے ہیں۔ لہذا قوانین کائنات و سماج کو سمجھتے ہوئے۔ ایسے عظیم اہداف کا تعین ضروری ہے جو خدا کی طرح لامحدود ہوں اور عظیم انسانی اقداروں سے بھرپور ہوں، جن کی تعبیر اس دنیا کو جنت کے نمونے کے طور پر حاصل ہو۔ ان شاء اللہ

اتحاد بین الناس و اتحاد بین المظلومین

انسانی تہذیب، انسانی فطرت، انسان سے اس بات کی متقاضی ہیں کہ کوئی بھی ہمارے ساتھ برائی کرے تو بدلے میں ہم اُس کے ساتھ برائی نہ کریں۔ مجمع میں سے کوئی ہماری چپل پہن گیا تو ہم کسی دوسرے کی چپل بدلے میں نہ پہن آئیں۔

ظلم و مہربانی، ذلت و عزت، محبت و نفرت، دوستی و دشمنی، انسانیت و حیوانیت وغیرہ وغیرہ کے احساسات ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ ان احساسات کے دعوے داروں میں کسی وقت ان میں سیاسی یا معاشی مفادات بھی آجاتے ہیں۔ مگر وہ خالص احساس جس کو ہم خود یا ہر انسان اپنے اندر بغیر کسی بد دیانتی و ملاوٹ کے موجود پاتا ہے، وہ احساس اگر نمو پاجائے اور بغیر کسی مفاد کے صرف سچائی اور حق کی فتح کیلئے اُس احساس کو بڑھاوا دیا جائے تو کسی بھی مذہب، مکتب و فلسفہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

ظالم کا ظلم، کسی امین کی امانت داری، کسی نبی و فلسفی کے سکھانے، دکھانے، سمجھانے، پڑھانے سے ابلاغ نہیں کی جاسکتی۔ یہ تو احساس ہے جو ہر انسان میں موجود ہے اور یہی احساس اور اس کے تناظر میں انجام دیا جانے والا عمل دانشمندی ہے، عقلانیت ہے۔ ظالم کے خلاف حرکت کرنا ضروری نہیں کہ کوئی نبی، پیغمبر، امام، ولی، لیڈر، فلسفی یا فوجی جنرل کہے تو ہم

کریں گے بلکہ یہ تو انسانی ضمیر کی آواز ہے، انسانی احساس ہے۔ البتہ سادہ لوح افراد کو اس احساس کے ذریعے گمراہ کیا جاتا ہے یعنی جس کو ظالم کہا جا رہا ہوتا ہے وہ درحقیقت ایسا نہیں ہوتا یا جس کو انسانی حقوق کا پاسدار کہا جا رہا ہوتا ہے وہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ الٹ ہوتا ہے، اس بات کو ان سادہ لوح یا کم علم افراد کو اِن کے اسی فطری احساس یعنی "ظلم سے نفرت" یا " مخلوق سے محبت " کے تحت بڑھاوا دیا جا رہا ہوتا ہے اور ان کم علم افراد کو وہ خاص گمراہ کنندہ گروہ یا شخص اپنے سیاسی یا معاشی مفادات کی خاطر mobilize کرنا چاہ رہا ہوتا ہے۔ مذہب کی بنیادی ضرورت بھی انسانی نفسیات کیلئے انسانی سماجی نظام کے استحکام کیلئے ایسی ہی ہے جیسے مچھلی کیلئے پانی۔ البتہ اسلامی احکامات یا نصائح کو زبردستی خود پر یا دوسروں پر ٹھونسنا اور طاری نہیں چاہیے، یہ ایسے ہی جیسے کسی دو سال کے چھوٹے بچے کو مجبور کیا جائے کہ وہ بھاگنا شروع کر دے۔ یہ ایک غیر فطری عمل ہے، کبھی داڑھی مونچھوں والے دو سال کے بچے کا ذہن رکھتے ہیں۔ لہذا احتیاط رہنا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات ہر ذہنی سطح کو فطری قوانین، ضمیر کی آواز اور عقل و منطق کی طرف ہی راہنمائی کرتی ہیں یا یوں کہا جائے کہ ہر ضمیر بیدار، منطقی ذہن، فطرت شناس و دانشمند، انسان دوست، فطرت دوست شخص اسلامی تعلیمات ہی کی طرف راغب ہوتا ہے۔ انسانی فطرت، عقل، ضمیر و منطق و دانشمندی جس تہذیب سے آشنا ہے وہ وہی انسانی اور اسلامِ ناب کی تہذیب ہے جس سے ہر فرد کا ضمیر و ذہن آشنا ہے اور جو اسوہ محمد رسول اللہ، قرآن و اہلبیت علیہم السلام سے آشکار ہے۔

لہذا اسلام کے دعوے داروں سے اسلام ناب کی تعلیمات کو نہ سمجھیں بلکہ اسلام ناب کی شناخت کیلئے فطری قوانین یعنی انسان کی کامیابی و تنزلی، سکون و راحت قلبی، سعادت کے حصول و بدبختی سے بچنے، ناکامی سے دور رہنے کیلئے قدرتی قوانین کو سمجھیں۔ جب یہ علم حاصل ہو جائے تو پھر قرآن بھی سمجھ میں آئے گا اور سیرت رسول اور اولیاء اللہ بھی۔ سورہ بقرہ میں ہے:

"ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ"۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے. یہ صاحبانِ تقویٰ اور پرہیز گار لوگوں کے لئے مجسم ہدایت ہے۔

یہاں قرآن اُن لوگوں کیلئے ہدایت کا مرکز بتایا جارہا ہے جو ماقبل تلاوت قرآن زندگی کی حقیقتوں کو سمجھتے ہیں، فطری اور قدرتی قوانین کو سمجھتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنے کیلئے نیز ناکامی سے بچنے کیلئے ایک حد تک قوانین قدرت کا علم رکھتے ہیں مگر یہ قرآن ان کو مکمل سعادت کیلئے long term کامیابی کے طریقے بتاتا ہے۔

حقیقتوں اور واقعیتوں، سچائیوں، قوانین قدرت خواہ انفرادی کمال سے وابستہ ہوں یا سماجی، آگاہ ہو جانے والے پر پھر سچے مذاہب اور فلسفے بھی واضح ہو جاتے ہیں اور کھوکھلے دعوے دار بھی سامنے آجاتے ہیں اور اُن کے سیاسی و معاشی مفادات کی قلعی بھی کھل جاتی ہے، ایسے موقعوں پر تعصب اور "اپنے عقیدے" کے بھرم کو توڑ کر سچائی کی طرف رغبت کرنا چاہیے، ورنہ تاریخ ہم کو خود تباہ و برباد کر دیتی ہے۔

کم علمی و بے خبری کی بنیاد پر یا ناقص و کوتاہ معلومات کی بنا پر کسی کے بھی خلاف پروپگنڈہ کا حصہ بننے کے بجائے دانشمندی اور عقل و فہم استعمال کریں کیونکہ کسی کو نقصان فائدہ ہو نہ ہو ہمارا اس سے براہ راست رابطہ ہوتا ہے۔ علم و معلومات و حقائق کے جاننے کیلئے کبھی بھی، کسی قیمت پر ڈر، خوف، کاہلی، سستی، آرام طلبی، عیش کوشی، عافیت پناہی، غیر سنجیدگی کو ترک کریں۔ سچائی اور حقیقت بہت نایاب ہے جیسے تیل، گیس اور ہیرے جواہرات ہوتے ہیں اور جیسے یہ دولتیں آسانی سے ہاتھ نہیں آتیں، سخت جدوجہد و سالوں سال محنت و جانفشانی کرنی پڑتی ہے اسی طرح علم و معرفت کی دولت بھی آسانی سے ہاتھ نہیں آتی۔ دماغ اور اعضاءوجوارح کا سخت محنت و جستجو سے تیل نکال دیں تب آپ کو تھوڑی بہت معرفت نصیب ہوتی مگر وہ تھوڑی بہت بھی بہت ہوتی ہے۔

لہذا خلاصتاً یہ کہ کسی بھی فلسفے، مذہب کو سمجھنے کیلئے یا موجودہ کسی پریشان کردہ مسئلے یا فکر کو حل کرنے کیلئے خود ہماری آپ کی ذات معیار ہے۔ فلسفے و مذہب کی تعلیمات کو خود اُس کی اصل کتب اور منابع سے حاصل کریں۔ حُب ذات یا ذات کے اظہار اور آباو اجداد کی یا کسی خاص شخصیت کی اندھی تقلید کے بجائے اپنی زندگی کے تجربات و احساسات کو معیار قرار دیں اور ضرورت پڑنے پر علم و مطالعہ و مشاہدہ کو وسیع کریں۔ حق و حقیقت کو جاننے کے اس تعلیمی پروسس سے گذرنے کے بعد شخصیتوں کے بھرم ٹوٹتے بھی ہیں اور بنتے بھی ہیں یا مزید نمو پاتے ہیں۔ واحد یہی ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم کسی نفسانی فردی یا معاشرتی یا عالمی جنت کی توقع کرسکتے ہیں خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا مرنے کے بعد۔

معرفتِ العجل

مغرب میں نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE)دور میں جب اُن مذہبی بیانیوں (RELIGIOUS DISCOURSE)کو رد کیا گیا جو پاپائیت کی علوم وحی کی بدترین تعبیر اور کلی طور سے مذہب سے ہی بدظنی کے نتیجے میں پیش آئے تھے تو پھر عقلیت، منطق و فلسفہ کو رواج دیا گیا، روشن خیالی دور میں بھی عقلیت، انسان دوستی، معروضیت، انفرادی موضوعیت، مرکزیت، آفاقیت، کلیت، حتمیت اور غیر مختتم ترقی کو اس دور کی آفاقی سچائیاں قرار دیا گیا، مگر عملی میدانوں میں سامراجی گروہوں نے ان فلسفوں اور افکار کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھادیا اور پھر صنعتی انقلاب کے بعد اس میں اضافہ ہی کرتے چلے گئے اور یوں عقل وفلسفہ و منطق وریاضیات اور سائنس و ٹیکنالوجی کو بھرپور طریقے سے سرمایہ دارانہ گروہوں اور خاندانوں کی خدمت کیلئے معین کر دیا گیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی عظیم تباہ کاریوں، وحشت و بربریت کے بعد ترقی یافتہ دنیا میں روشن خیالی دور کے تمام سائنسی اور عقلی مہابیانیوں (META NARRATIVE)سے بھی بدظن ہو کر اس کا بھی انکار کیا گیا، جن کا تعلق ترقی، سچ اور انصاف کی ہمہ گیریت وغیرہ سے تھا، اس کی رد تشکیل (DECONSTRUCTION) کی گئی، ہماری نظر میں ان کی بنیادیں جس فلسفے، عقلیت اور سائنس کے قضایا پر تھیں وہ قضایا ہی باطل تھے جبکہ تیسری دنیا میں ترقی،

سچ اور انصاف کے تناظر میں عقلیت، انسان دوستی، معروضیت، انفرادی موضوعیت، مرکزیت، آفاقیت، کلیت، حتمیت اور غیر مختتم ترقی کے مہابیانیے مذہب اور سائنس کے انضمام کے ساتھ جب جب پیش کیے گئے نہ صرف معتدل ترقی یافتہ دنیا میں قبول کیے گئے بلکہ مشرقی تیسری دنیا میں بھی دانشمند اہل مذاہب، اہل مطالعہ، مشاہدہ اور اہل تجربہ و مشق نے خوش آمدید کہا۔

جس طرح مشرق میں ناعاقب اندیشوں نے یک لخت سائنس و صنعت کے استعمال اور اس کی تعلیم پر قدغن لگایا اسی طرح مغرب نے بھی تمام مذاہب کو تولے بغیر یک لخت ہر مذہب کو ترک کر دیا۔ جس طرح مشرق میں شاعرانہ مزاج اور مذہبی تقدس کے تناظر میں ایسے مہابیانیے تشکیل دیئے گئے تھے جس نے مشرق میں مذاہب کے پیروکاروں کو تجربہ، تحقیق کے فقدان کے نتیجے میں نظریاتی تشکیل اور رد تشکیل کے عمل سے دور رکھا نیز صنعت اور ٹیکنالوجی کو مذہب مخالف گردانا اور اس گردانئے میں مغربی استعمار کا مذہب مخالف رویہ نیز اہل مذاہب کے معاشی استحصال کا بھی کردار بھی گنایا جاتا ہے، اس سازشی نظریہ سے ہٹ کر صنعت و ٹکنالوجی کی مخالفت کی اصل وجوہات میں خود اہل مذاہب کی جہالت، مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ یعنی فلسفی، منطقی اور ریاضیاتی ذہن کے فقدان کا ہونا ہے۔

اسی طرح مغرب یا صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں بھی ادوار جہالت کے ایام کے تلخ مذہبی تجربات کی روشنی میں تشکیل دیئے گئے اُن مذہبی مہابیانیوں کی رد تشکیل کے نتیجے میں سائنسی و صنعت و فلسفہ و منطق و ٹیکنالوجی کے افراط نے دیگر مذہبی بیانیوں کی تعبیر نو سے

دور رکھا اور مغربیوں نے باقی مذاہب کے ساتھ خصوصاً اسلام و تعلیماتِ اہلبیت علیہم السلام کو بھی اپنے ادوار جہالت کے مذہبی تجربے کے ہی تناظر میں باور کیا جب کہ یہ ایک ایسا مغالطہ تھا جس نے اہل مغرب کو اسلام ناب محمدی کی تعلیمات سے دور رکھا یا پھر اگر اُن تعلیمات پر عمل بھی کیا گیا تو وہ صرف جدید دور کی صنعتی ترقی کیلئے فطری رموز کے حصول تک محدود رہا نیز اکثر جگہ تعلیمات ناب محمدی سے تعصب بھی نظر آتا ہے اور مذہبِ اہلبیت کو خاص گروہ کی نسبت سے سمجھا گیا، جبکہ قرآن اور معصومین علیہم السلام عالم انسانیت کے راہنما ہیں اس تصدیق کے ساتھ کہ ان کی تعلیمات سے دنیوی ترقی بھی حاصل کی جائے گی اور اُخروی سعادت کیلئے بھی ظلم و استکبار اور احسان فراموشی سے دور رہا جائے گا۔

اگر اہل مغرب اس طرح احسان فراموشی کا رویہ ترک نہیں کریں گے تو اس کے نتیجے میں کسی بھی صورت ذہن و نفس کا اعتدال و اطمینان نصیب نہیں ہو گا، نفسیاتی امراض بڑھتے جائیں گے اور ترقی یافتہ ممالک اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ جائیں گے، بالکل ریشم کی کیڑے کی طرح اور ان کی علم و صنعت سے تیسری دنیا مستفید ہو گی، بشرطیکہ تیسری دنیا اپنی کوتاہیوں سے توبہ کر کے اعتدال کی راہ پر چلنے کا ارادہ کرے۔ ترقی یافتہ دنیا کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی سائنس، ٹیکنالوجی اور فلسفے اور ریاضیات کے ساتھ مذہب کے مہابیانیے جیسا کہ غیب، توحید، معاد و قیامت پر ایمانیات وغیرہ کو قبول کریں ورنہ یک بُعدی سماج انسانی وجود کو اپاہج یا مالیخولیائی بنا رکھے گا۔ مذہب کے پیروکاروں کیلئے بھی

ضروری ہے کہ وہ مذہبی تعلیمات کو عقل، منطق، فلسفے، سائنس، تجربات، تحقیق کو خصوصا سماجی مسائل کے حل کیلئے کوشش شروع کردیں ورنہ آج کسی سامراج کے خلاف زبان چلاتے ہیں تو کل کسی اور سامراج کے خلاف بولتے رہیں گے اور کشکول ایک در سے دوسرے در پر اور ایک بیساکھی سے دوسری بیساکھی بدلتے رہیں گے۔

ترقی یافتہ ممالک نے جن مذہبی مہابیانیوں کو اپنے خاص ماحول میں تجربہ کیا اور اب رد تشکیل کی طرف آئے ہیں ان کو اِن مہابیانیوں کو اپنے نئے تجربات اور نئے اسلوب اور اپنی نئی تعبیر کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے یعنی ان مہابیانیوں کو سائنس، منطق و ریاضیاتی معیار پر جانچنے کی ضرورت ہے نیز کسی بھی بیانیے یا مہابیانیہ یا سائنس و ٹیکنالوجی کی نسبت سے عالمی پیش گوئی کرنے کیلئے عالمی اقتصادی اور معاشی نظامِ فطرت و معاشی نفسیات کو جاننا بھی ضروری ہے۔ معاشی و اقتصادی زیروزبر کے فطری قوانین جانے بغیر کسی بھی قوم یا عالمی علم و فلسفہ یا کسی قوم کے عروج و زوال کے متعلق کچھ بیان کرنا ناممکن ہے۔

معاشی نظام اور علمی، فلسفی و فکری نظام کے ساتھ ہی "نظامِ حکومت "مذہبِ اہلبیت علیہم السلام کا خاص نظریاتی و سماجی اصولوں و قوانین کے نظام کا بہت حساس مسئلہ ہے۔ دنیا کے مسائل جن کو ظاہر بظاہر دانشمند افراد معاشی و اقتصادی قرار دیتے ہیں اور مستقیماً معاشی و اقتصادی مسائل کو اقتصادی ذرائع و اداروں سے حل کرنا چاہتے ہیں جبکہ اقتصادی نظام سیاسی نظام کے بغیر ناممکن ہے، اسی طرح مضبوط تعلیمی نظام بھی محکم سیاسی نظام کے بغیر ناممکن ہے، مضبوط سیاسی نظام مضبوط فوجی طاقت کے بغیر ناممکن ہے۔ لہذا اس الٰہی حکومتی

نظام کے قیام کیلئے جو جدوجہد کی جاتی ہے وہ ابتدائی مرحلہ میں رائے عامّہ کی ہمواری سے مربوط ہے عوامی طاقت ہی کسی نظام کی پشت پناہی کرکے اُسے عقلی اور سائنٹفک بنیادوں پر ہر جہت سے محکم بناسکتی ہے۔ شرط یہی ہے کہ قوم اپنی فکری بصیرت سے خود ایسے الٰہی نظام کو قبول کرے اور نافذ کرے۔ فوجی قوت اور دیگر سماجی قوتیں اس امامت کے قیام کے بعد کی شکلیں ہیں نہ کہ رائے عامہ کی ہمواری کے وقت کی نیز اس جدوجہد کے عرصے میں سختیوں اور مصائب کی جزا مستقبل میں نہ صرف نظامِ ولایت و امامت کے قیام کی شکل میں ہے بلکہ اس زندگی کے بعد بھی ہے۔ لہذا تعلیم و معرفت و فکر و شعور جو کہ ہر مرحلے میں اپنی خاص قوت رکھتے ہیں اُسے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ المیہ یہ ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کو خداوند تبارک و تعالیٰ نے نبوت و رسالت کے اختتام کے بعد عالمی سماج کیلئے بطور حاکم انتخاب کیا اور اسی حکمیت کے ذیل میں تمام ذمہ داریاں عطا فرمائی تھیں جیسے کہ علمی و روحانی و نفسیاتی ترقی، تہذیب و تمدن کا قیام، عادلانہ معاشی نظام، مہذب سماجی و ثقافتی رویوں، رسوم اور عائلی زندگی کی تنظیم وغیرہ۔

امامت ہی ہے جو معاشرے کے انجن کو اسٹارٹ کرتی ہے اور درست راستے پر لے کر چلتی ہے اور منزل مقصود تک پہنچانے کا حوصلہ اور ایندھن رکھتی ہے۔ ہم غیر معصوم افراد کو اختیار تو دیا گیا لیکن ہم اپنی سعادتوں اور مسرتوں کیلئے مجبور ہیں کہ خداوند قدوس کی رحمت اور نعمت کو اپنے اختیار و ارادے سے منتخب کریں، ہمیں اختیار ہے کہ ہم علم و دانش کے تحت تجربات کریں، مشقیں کریں تا کہ ہم پر واضح ہو سکے کہ اس امر امامت و ولایت

کے بغیر ہمارے پاس نہ تو دنیوی مسائل کا حل ہے نہ ہی اُخروی اور اگر نظریاتی بنیادوں پر ہم حل جان بھی لیں تو اُن SOLUTIONS کو ہم اپنی کوتاہ صلاحیتوں کے ساتھ EXECUTE نہیں کرسکتے۔

ہم نے ائمہ معصومین علیہم السلام کو بطور مشاور، حکیم، قبر اور آخرت میں شفاعت کروانے والا یا پھر بہت زیادہ اپنی ماڈی زرق برق زندگی کی رنگینیاں بڑھانے کیلئے توسل یا انسانی نفسیات دان وروحانی پیشوا کی حیثیت تو قبول کیا مگر اُن کو بطور حاکم ہم نے تسلیم نہیں کیا۔ مغرب کے غیر دینی دانشوروں نے بھی آپ حضرات کو بطور فلسفی، ماہر نفسیات، عظیم معلم ، عظیم سیاستدان، عظیم ماہر سماجیات، عظیم سائنسدان وغیرہ تو قبول کیا مگر بطور حاکم انہوں نے بھی قبول نہیں کیا۔

بطور مجموعی انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی فلاحِ دنیوی اور اُخروی کیلئے امامت کے ادارے کے بارے میں بصیرت اور معرفت میں اضافہ کرے اور اس ادارے کی قوت اور قیام کیلئے جو فردی اور معاشرتی مقدمات چاہیے ہیں اُن کیلئے جدوجہد کریں۔ آج جس تاریخ کے اختتام کی باتیں کی جارہی ہیں یا عظیم عالمی استکباری نظام کے احیاء کیلئے پیش گوئیاں کی جارہی ہیں ان سب کی وجہ یہ بے اعتدالیاں ہیں جن کے سبب نہ تو غیر مسلم بلکہ مسلم بھی اور خود بظاہر مذہب اہلبیت کے چاہنے والے بھی قصوروار ہیں۔ ہم لاکھ اپنی مصیبتوں کا رونا روتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم درجہ بدرجہ، قدم بقدم، مرحلہ وار نظام امامت کے مقدمات فراہم نہیں کریں گے کہ مستقبل میں یہ ادارہ قائم ہو تو ہم لاکھ معاشی و

علمی تحقیقات، کانفرنسز، سیمینارز، فورمز، سمٹس وغیرہ قائم کرلیں ہمارے مقصد وجود ان عالمی مسائل کے حل کرنے میں ناکافی ہیں۔ اگر ہم خود اعتمادی، مضبوط ارادے، مستقل مزاجی یا دیگر مثبت اور تعمیری و تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں بھی تو ہم کو اپنا انتہائی ہدف اسی امر کو قرار دینا چاہیے کہ ہماری تمام زحمتیں اور کوششیں مستقبل میں نظام امامت کے قیام کا وسیلہ بن سکیں۔

انسان کو پے درپے زرق وبرق نعمتیں اور سختیوں، مصائب و آلام میں مبتلا کرکے انسان سے خداوند قدوس نے یہی چاہا ہے کہ اُس آدم کی اطاعت کریں جس کو اُس نے لاریب خلق کیا ہے، جس کی معرفت کیلئے ہمیں ہر طرح کی آزمائشیں درکار ہیں اور خود اس لاریب آدم کی آزمائش "ہمارے وجود" ہیں کہ ہماری ذراسی کوتاہی اِن شخصیات کو ہم سے دور لیجاتی ہیں۔ غیبت میں چلے جانا اِن ہستیوں کی آزمائش نہیں ہماری آزمائش ہے، ہمارا امتحان ہے کہ ہم کس طرح سے اس معرفت کو حاصل کرکے اس شخصِ لاریب کو اُس کی اصل جگہ پر بٹھاتے ہیں جس سے خود ہماری بھی سعادتیں اور مسرتیں منسوب ہیں۔

مسلمان اور سازشی نظریے

(مذکورہ مضمون میں عمران شاہد بھنڈر صاحب کی کتاب سے اقتباسات ہیں جن میں ترامیم کر کے یہاں شائع کیا جارہاہے)

مسلمان خصوصا تیسری دنیاکے اس مذہبی انسان کی کمزوریاں اور خامیاں ہی ہیں جن کی وجہ سے سرمایہ دار کو اپنے مفادات کے حصول میں کچھ مشکل پیش نہیں آرہی۔ سرمایہ دار کا آسان ہدف وہ مذہبی انسان ہے جو اسلامی تہذیبی و ثقافتی روایات سے تو وابستہ رہناچاہتاہے مگر 'ہستی کا علم' اور منطق سے بے خبر مذہبی تعلیمات کو فکری مشقوں اور عملی مشقوں سے سمجھنے کے بجائے صرف آباءواجداد کی تقلید پر گذارناچاہتاہے۔ جس دنیامیں وہ رہتاہے اس سے اس کے وجود کا کیارشتہ ہے اسے سمجھناہی نہیں چاہتا، وہ تحقیق کرکے اپنی سماجی اور تاریخی یک رُخی روایات کے خلاف اصل بات سننے کو تیار نہیں ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے تاریخی یک رُخی اور اسلام کی اصل تعبیر کے درمیان فرق کو دیکھا جاسکتا ہے۔

پوری دنیامیں اس وقت مسلمان ریاستوں کا کردار قابلِ مذمت ہے جو تاریخی غلطیوں سے بھی سیکھنے کو تیار نظر نہیں آتے (سوائے چند ایک کے) اور ان ریاستوں کے رہنے والے اس بات سے بے خبر ہیں کہ کس طرح سے سامراج نے فلسفیانہ علوم کی بنیاد پر نہ صرف سرمایہ

داری نظام کو ترقی دی ہے، بلکہ انھی علوم نے سامراج کو اور بھی مکار اور عیار بنادیا ہے کہ وہ انھی علوم کے ذریعے پہلے سے زیادہ مہذب طریقے سے انسانیت کا استحصال کر رہا ہے۔ اس نے انسان کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔ سرمایہ داری نظام جو فردیت کی نشو نما کا دعویدار ہے اسی نے درحقیقت پوری دنیا کے انسان کی اصل انفرادیت کو چھین کر اسے نہ صرف پارہ پارہ کر دیا ہے، بلکہ سرمایہ داری نظام اور فرد کی انفرادیت کا سفر دو مختلف سمتوں میں جاری ہے، جسے عہدِ حاضر کا انسان جبر تلے آکر طے کرنے پر مجبور ہے، جب کہ سامراج اپنے سفر کو جاری رکھنے کے لیے مختلف "نظریاتی" راستے ہموار کرتا رہتا ہے۔

آج کی ریڈیکل اسلام کے نام پر ہونے والی دہشت گردی بھی اسی نظریاتی جنگ کی ایک کڑی ہے اور موجودہ بنیاد پرستی کا اصل ذمے دار سامراج ہے وہ چاہے ہندو ہے مسیحی یا یہودی ہے اور ان کا معاون و مددگار مسلمان ہے جس کی شناخت ایک زرخرید سے زیادہ نہیں ہے۔ مسلمان جہاں بھی شیطان کا مددگار بناوہاں شیطان نے اُس کے دین کی نادرست تعبیر کے دروازے ہی سے نفوذ پیدا کیا اور اُس کو جھانسا دیا، جب کہ قرآن اور سیرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس تعبیر سے الٹ ہے جو یہ جاہل ملّا اور اس کے حواری کرتے ہیں، جس کا بنیادی سبب اندھی تقلید اور تاریخی اور موجودہ تعصب بھی ہے، خود تحقیق اور مطالعہ سے بے اعتنائی اور حق کی پیروی میں کاہلی، سستی آرام طلبی، عیش کوشی، آسانی طلبی اور غیر سنجیدگی ہے، اسی باعث مسلمان کو سامراج نے اپنا آلۂ کار بنایا ہوا ہے۔ روشن خیالی فلسفیوں کے فلسفوں میں انسان دوستی کا عنصر نمایاں تھا۔ ان کے فلسفوں میں علمیہ اتی کے برعکس

اخلاقی پہلو فطرتِ انسانی کے قریب تر تھا۔ روشن خیال اپنے فلسفے کے حقیقی تضادات کی تحلیل کرتے ہوئے ان کو دباتے تھے، لیکن اس کو خالصتاً علمیاتی پہلو قرار دیتے تھے اور مخفی طور پر اپنے اقتصادی مفادات کیلئے استعمال کرتے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

علمیاتی پہلو جس میں تعقل کی سربلندی کا پہلو نکلتا ہے، اسے سرمایہ داری نظام میں ''انتظامی معاشرے'' کے قیام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ تاہم بیسویں صدی کے فلسفی و دانشور مغربی درسگاہوں میں بھاری معاوضوں کے عوض سرمایہ داری کے فروغ کے لیے ایسی ایسی تھیوریوں کی تشکیل میں مصروف ہیں جو سامراج کے ظلم کو جواز فراہم کرتی ہیں اور ان میں سرِفہرست ''مابعد جدیدیت'' اور ''لاتشکیل'' ہے۔ ان کے تحت مسیحی و یہودی بنیاد پرستی کو خصوصاً نظریاتی مضبوطی بخشی گئی ہے۔

مغربی بنیاد پرستوں اور سامراج کی بین المربوط چالیں یہ ہیں کہ وہ ایک طرف تو مسلمانوں اور تیسری دنیا کے لوگوں کو اپنے فلسفوں کے تناظر میں جدیدیت کے نعروں کے ذریعے آسانی سے بے وقوف بنا کر اپنے اقتصادی و معاشی مفادات حاصل کر رہے ہیں تو دوسری طرف مسیحی و یہودی بنیاد پرست نظریے کو بھی تحفظ فراہم کر رہے ہیں، اس کے برعکس مسلمان عملی نہیں صرف نظری حد تک ہی مذہبی 'خیالیات' پر انحصار کیے ہوئے ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ بنیاد پرست نہ ہو کر بھی مسیحی و یہودی بنیاد پرستوں کے نرغے میں ''دہشت گرد'' بنا ہوا ہے اور اپنی شناخت کو ''التوا'' میں اس لیے رکھے ہوئے ہے کہ اس نے جدید علوم کو ترقی دے کر اپنے اسلامی اقدار اور سائنس اور منطق کے رشتے کے ساتھ، مشترک

قدر کو نہ تو دریافت کیا ہے اور نہ ہی کبھی اس بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے، سوائے شیعہ مسلمان کے۔۔۔ باقی مسلمان یہ سمجھتا ہے ایسا کرنے سے اُس کی تاریخی یک رُخی بنیاد پرستی پر ضرب لگے گی اور اسے چھوڑنا پڑے گا۔ جس دن اس مشرک مسلمان نے اپنا یہ بت توڑ دیا تو بہت کچھ بہتر ہو جائے گا۔

اسی وجہ سے سب سے ضروری یہ ہے کہ ہم اپنی مذہبی تعلیمات اور اقدار کو سائنٹفک تحقیق سے مربوط کریں اور اپنے عقائد سے لیکر معاملات (سیاسی، اقتصادی، تہذیبی) کو جانچیں اور ان تعلیمات میں جعلی اور مفاد پرست شخصیات کی روایات و سنتوں کو ترک کریں اور دین کے ٹھیکیدار بنے ان تاریخی شخصیات کو اپنے ہمت اور حوصلے سے مسترد کر دیں، یہ عمل ہمارے لیے نہ صرف اس دنیا میں سامراجی طاقتوں سے دور کرنے، خود کو سامراجی نہ بننے سے دور کرے گا بلکہ دنیاوی ترقی کے ساتھ اُخروی سعادت بھی دے گا اور فطری دین یعنی حق پرستی کی راہ پر ہمارے قدم استوار کرے گا جس میں ہماری نفسیاتی حالت خود اعتمادی، یقین، حوصلے، قوت وغیرہ سے بھرپور ہو گی۔

معاشی مسائل اور مذہبِ اسلام

ایک مسلمان کیلئے کسی طور پر بھی جائز نہیں کہ وہ کسی کافر کی اقتصادی حالت سے مرعوب ہو، غیر کے لوازمات زندگی خواہ کتنے ہی زرق و برق کیوں نہ ہوں، کتنا ہی اُن کی دنیاوی طاقت و شوکت ارفع و اعلیٰ کیوں نہ ہو، نہ تو کسی ایک فرد مسلمان نہ ہی تمام امتِ مسلمان کو کفار سے دبنے اور زیر اثر آنے کی ضرورت ہے۔ البتہ اسلام مسلمانوں کو جس چیز میں مقابلہ کی دعوت دیتا ہے وہ ایک دوسرے کا تقویٰ اور پرہیز گاری ہے۔ کفار اپنی مادّی شان وشوکت کو ہی اپنے حق پر ہونے کی دلیل گردانتے ہیں، اِن کے نزدیک انسان کی کرامت اور بزرگواری اس میں ہے کہ اُس کے پاس کتنامال ودولت ہے، کتنے لوگ اس کے دست نگر ہیں، کتنا اسلحہ اس کے پاس ہے نیز اُس کے پاس علم کتنا ہے۔ البتہ کفار علمی طاقت کو باطل کے مفاد کیلئے ،انسان کا استحصال کرنے میں زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا۔ اِن (کافر) لوگوں کو جب ہماری کھُلی کھُلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں "بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر (اقتصادی) حالت میں ہے اور کس کی (سماجی) مجلسیں / محفلیں زیادہ شاندار ہیں؟" (سورہ مریم /73)

ضرورت کو ایجاد کرنا یا جو ضروری ہے اس کو حاصل کرنے کی راہ دکھانا۔ اشیائے صرف کی تیاری اور ان اشیاء کیلئے دنیا کو صرف ایک تجارتی منڈی سمجھنا، انسانوں کو مزدور یا صارف گردانا۔ دُنیا کے قدرتی ذرائع پر بہانے بازیوں سے قبضہ کرنا، اخلاقیات و سچے مذاہب کی معنوی اقدار کو دقیانوسی و بیک ورڈ گردانا، جعلی مذاہب کی ترویج کے ذریعے اور قدرتی اجناس و معدنیات کو کاغذی کرنسی سے فضیلت دیناوہ سازش ہے جس میں انسانی معاشرے کے چند سرمایہ پرست اشراف اور دنیا پرست کاہل دین فروشوں نے عبودیت کا سودا دنیا کے زرق و برق مدہوش لذت سے کر لیا اور یہ چند لوگوں کے اعمال ہیں جو مجموعی طور پر دنیا کے تمام انسانوں کو معاشی استحصال کی طرف لے گئے نیز انسان کی کرامت و شرافت کو داغ دار کرکے دنیا کے معاشرے کو زبون حالی کی طرف دھکیل دیا۔ ایسے اشراف کی مثال یہ ہے کہ یہ اپنے مال و دولت پر اکڑتے ہیں اور کمزوروں کو اہمیت نہیں دیتے اور پست اور گھٹیا تصور کرتے ہیں۔

قَدْ كَانَتْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ - مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا تَهْجُرُونَ۔

جب ہماری آیتیں تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم الٹے پاؤں واپس چلے جارہے تھے ۔اکڑتے ہوئے اور کہانیاں کہتے اور بکتے ہوئے۔(سورہ مومنون /66،67)

استحصال کرنے والا استعمار / استکبار قانون فطرت (اسلام) کو اپنی ناجائز مطلب بر آری کیلئے استعمال کرتا ہے، علوم پر دسترس رکھتا ہے مگر روزِ جزا و سزا کا انکار کرکے خدا کا انکار کرتا ہے

اور پھر حقدار کو اُس کا حق نہیں دیتا اور دنیاوی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی یعنی روزگار معیشت و اقتصادیات پر قبضہ کرکے دنیا کو محکوم و غلام بنانے اور اپنے لئے آسائشات زندگی مہیا کرنے کی غرض سے سیاسی نظاموں، تعلیمی نظاموں، ثقافتوں کو دھوکہ اور لالچ کے ذریعے مجروح کرتا ہے، زورزبردستی سے بغیر کسی منطق و گفتگو کے اپنے فیصلے جبراً نافذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صرف اپنی تجارتی منڈیوں کی وسعت اور زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے ثقافت و تمدن کے حریمِ عفت و پاکدامنی کو فحشاء کے ذریعے مسموم داغدار کرتا ہے، انسانی ضمیر کو خود غرضی کی راہ پر چلانے کیلئے ابلاغ عامہ، تعلیمی نظاموں اور سیاسی و عسکری، اقتصادی نظاموں کے سرکردہ افراد میں سے پست فطرت نفوس کو خریدتا ہے اور مستقل دہشت و ناامنی کی فضا کے ذریعے ذہنی خلفشار میں مبتلا کرتا ہے اور معاشرہ ہائے انسانی کے شعبوں میں ایسے ہی پست فطرت انسان نما شیطانوں کو سبز باغ دکھا کر غیرت و حمیت، رحمدلی و انکساری اور حتی الامکان نیک فطرت کو دنیاوی چکاچوند میں مبتلا کرکے روز جزاو سزا کا تصور، خدا پر ایمان اور حقدار کو حق دلانے میں بے ایمانی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ ایسے مستکبروں کے مدمقابل مسلمانوں کا رویہ بہت واضح ہے۔ ارشاد رب العزّت ہے: لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے. ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہو چکی ہے. اب جو شخص بھی طاغوت کا انکار کرکے اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کی مضبوط رسّی سے متمسک

ہو گیا ہے جس کے ٹوٹنے کا امکان نہیں ہے اور خدا سمیع بھی ہے اور علیم بھی ہے۔(سورہ بقرہ /256)

استکبار اپنے اسی اقتصادی مفاد کی خاطر گمراہ /باطل نظریات کو علمی حیثیت دلانے کی کوشش میں اپنا وقت، پیسہ خرچ کرتا ہے، عملی زحمت کرتا ہے۔ دنیا کے قدرتی وسائل سے بھرپور خطوں میں کبھی حقوق انسانی کے بہانے، کبھی خواتین کی آزادی کے بہانے، کبھی جمہوریت کے بہانے، کبھی امن وامان ودہشتگردی سے نمٹنے کے بہانے (جس کو خود کاشت کرتا ہے) اِن خطوں میں مداخلت استعمار کا روز کا معمول ہے۔ تاکہ سیاسی چپقلشیں پیدا کی جائیں اور مستقل دہشت وناامی کے ذریعے خاص مطلوبہ نفسیاتی فضا پیدا کر کے سیاسی فوائد لیکر اپنا اقتصادی مفاد کا الوسیدھا کیا جائے۔

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَىٰ مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنفَضُّوا ۗ وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ

یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ رسول اللہ (اسلامی رہبر) کے ساتھیوں پر کچھ خرچ نہ کرو تاکہ اِن لوگوں کی صفیں منتشر ہو جائیں حالانکہ آسمان و زمین کے سارے خزانے اللہ ہی کے لئے ہیں اور یہ منافقین اس بات کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔(سورہ منافقون /7)
مومن کی پوری زندگی کو ہائی الرٹ رہنے کی نصیحت خدا نے اسی وجہ سے کی ہے تاکہ انہی شیطانوں کی معاشی سازشوں سے انسانی معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی کو بچایا جائے! یہ شیطان کے

پجاری اپنے پاس مال و دولت اکھٹا کر کے کمزور ایمان مسلمانوں کی خریدنا چاہتے ہیں اور اِن کے قلوب کو دنیاوی چکاچوند سے متاثر کر کے ارادہ رکھتے ہیں کہ ایمان والے ایمان چھوڑ دیں اور دولت کی پیداوار میں ان کا ساتھ دیں۔

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً ۖ فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ ۖ وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا

یہ منافقین چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی طرح کافر ہو جاؤ اور سب برابر ہو جائیں تو خبر دار تم انہیں اپنا دوست نہ بنانا جب تک راہِ خدا میں ہجرت نہ کریں پھر یہ انحراف کریں تو انہیں گرفتار کر لو اور جہاں پاجاؤ قتل کر دو اور خبر دار ان میں سے کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بنانا۔(سورہ نساء /89)

یہ شیطان انسانی شکلوں میں دنیا کے معاشروں میں مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں نیز ان کا مقصد دنیاوی لذّات اور آسائشوں کا حصول ہوتا ہے اس مورد میں یہ مخلوقات کسی مروت اور انکساری اور حق و باطل کی تمیز کیے بغیر اپنے مقاصد کے حصول کیلئے کوشاں رہتی ہیں۔ مذہبی نکتہ نگاہ سے دنیا سے بے رغبتی یا زہد کا مطلب منفی جذبات پر مبنی دنیا پرستی ہے نہ کے تعمیری و تخلیقی و مثبت میدانوں میں انسان کو خدمت کرنے سے منع کیا گیا ہے! اور زن، زر، زمین سے اسی طرح ہشیار رہنے کو کہا گیا ہے جیسے بل کھاتے ناگ سے !یعنی ان سب کے

تعمیری و تخلیقی پہلو موجود ہیں تاکہ ان پہلوؤں پر توجہ کر کے انسان زن، زر، زمین کی فطری خواہشات کو مثبت و حلال طریقے سے ہی حاصل کرے اور اُس حلال میں بھی تجاوز نہ کرے کہ زندگی کے اہم منصوبے غیر اہم حرکات کی نظر ہو جائیں۔

امام علی ابن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام فرماتے ہیں: دنیاو آخرت کی بھلائی دو خصلتوں میں ہے، دولت مندی اور پرہیز گاری۔(شرح ابن ابی الحدید 20/301)

اور چونکہ اقتصاد، جو انسان کے زن و زمین کا مالک بننے یا نہ بننے میں اہم کردار کرتی ہے، اس معاملے میں عالمی معاشرے کی زندگی کے تمام شعبہ جات سمیت، بنیادی شعبوں میں (تعلیم، سیاست، ثقافت، معاشرت) میں دشمن یعنی استحصال پسند اور معاشی ضرورتوں کو اپنے پاس محدود کر لینے والے غیر عادلانہ و غیر منصفانہ سوچ کے حامل فرعونوں اور ان کے چیلے چانٹوں سے ہشیار رہنے کی ضرورت ہے اور ان کے منصوبوں کو اپنے علم و عمل سے خاک کرتے رہنے میں ہی فردی و معاشرتی نیز دنیوی و اُخروی سعادت ہے۔ پھر دوسری طرف ان تمام شعبہ جات زندگی میں ترقی و خلاقیت و معماری کے ساتھ پرہیز گاری اور تقوے کے ساتھ روبہ عمل رہنا چاہیے اور صرف منفیات یعنی کفّار کی دشمنی اور سازش کے الزامات میں گم نہیں ہو جانا چاہیے۔ مسلمان سماج میں موجود منافقین یعنی کالی بھیڑوں کو بھی پہچاننا چاہیے نیز اپنی ذات کا بھی اسی طرح محاسبہ کرنا چاہیے جیسے لین دین کے موقع پر فریق مخالف سے کرتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کو انسان کی فلاح و بہبود کیلئے وقف کر دینا ایک دنیاوی اور معنوی ترقی کا فطری دروازہ ہے۔ جب تک ایمان والے فنون کے ماہرین نہ بنیں

گے اور جدید علوم سے لیس نہیں ہوں گے اُس وقت تک معاشی طاقتوں کے دست نگر بنے رہیں گے۔ اپنے آپ کو اس جذبہ سے کہ "ہم کرسکتے ہیں" عمل کی میدان میں آجانا چاہیے اور خود کو یا امت کو کسی طور پر بھی کمتر اور حقیر نہ سمجھنا چاہیے، دشمن بھی غفلت یا سادہ لوحی میں وار کرتا ہے جب ایمان والے خود تعلیم، معیشت، ثقافت انسانی رابطوں میں مستحکم ہوں گے اور سادہ گذر بسر کرنے والے دیانت دار بالغ نظر و باشعور سیاسی راہنما کی اطاعت کریں گے تو تمام نظام درستگی کی طرف چل پڑیں گے۔ اگر ایمان والے سیاسی رہبری میں خدا کی پسند کے بجائے اپنی پسند نافذ کریں گے تو دنیا کے نظام الٹ پلٹ جائیں گے اور پھر نہ سماج میں امن و امان رہے گا نہ ہی دیانت داری نہ ہی حق و باطل میں تمیز، گناہ و زیادتی عام ہوگی اور ظلم کا دور دورا ہوگا، جیسے کہ آج کی دنیا میں ہورہا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا

اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے (معاشرہ کے مسائل کے حل کیلئے) راہنمائی کرتے تھے۔ (سورہ سجدہ /24)

ہر دور کے فرعونوں، نمرودوں، یزیدیوں نے اپنی تمام شیطنت کے ساتھ اپنی اقتصادی حالت کو ہر ناجائز طریقے سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اگر یہ سیاست میں بھی آئے تو مقصد اقتصادی، اگر دینی رہنما کی شکل حاصل کی تو اس کے پیچھے بھی اسی اقتصادی خواہش کا عمل دخل، اگر جنگ کی تو اس کا مقصد بھی حکومتوں کو دوام دینا اور اپنی اقتصادی حالت کی

بہتری، مگر گمراہ پروپیگنڈے اور باطل کی روش پر چلتے ہوئے۔ جبکہ دوسری طرف خالص اسلامی راہنماؤں کا طرز زندگی جس میں اپنے گھر میں روٹی نہ ہو مگر کوئی بھائی بھوکا نہ رہے، اپنے تن پر پیوند زدہ کپڑا ہو مگر بھائی کے پاس اچھا لباس ہو، ایسی مثالیں ہیں جو انسانیت کے ہمدردوں کے مقابلے میں منافقوں کی شناخت واضح کر دیتی ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ

(اے ایمان والو) تمھیں ان (کفار و منافقین) کے اموال اور اولاد حیرت میں نہ ڈال دیں بس اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ اسی (سنبھلی ہوئی حالت) کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت کفر ہی میں ان کی جان نکل جائے۔ (سورہ توبہ /55)

باطل کی روش آج بھی اسی فرعون، نمرود، یزید کی روش ہے، جس نے حق کا لبادہ صرف اوڑھا ہے حق کو قلب و روح میں جگہ نہیں دی ہے تاکہ وہی اپنی معاشی و اقتصادی ہوس یا اپنی دیگر دنیاوی و نفسیاتی تسکین ہر ناجائز طریقے سے کرے، مذہب کا لبادہ اوڑھ کر شیطان کی پرستش کرتے ہیں اور ایمان والوں کو اپنی ظاہری مذہبیت سے دھوکہ دے کر دنیاوی لذّات طلب کرتے ہیں۔ وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ۔ اور جن لوگوں نے مسجد ضرار بنائی کہ اس کے ذریعہ اسلام کو نقصان

پہنچائیں اور کفر کو تقویت بخشیں اور مومنین کے درمیان اختلاف پیدا کرائیں اور پہلے سے خدا اور سول سے جنگ کرنے والوں کے لئے پناہ گاہ تیار کریں وہ بھی منافقین ہی ہیں اور یہ قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے صرف نیکی کے لئے مسجد بنائی ہے حالانکہ یہ خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ سب جھوٹے ہی۔(سورہ توبہ /107)

مسلم معاشرے میں منافق نما افراد جو مسلمانوں کا روپ دھار کر نمازیں پڑھتے یا دیگر عبادات کی شکل اپنائے ہیں مگر اپنی جہالت کے باعث اسلام کی تعلیمات و نظام کو سمجھے بغیر یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُن کی نمازیں یا عبادات اُن کو ترقی کی منزل پر لیجائیں گی، قرآن مجید اُن کی اس سوچ و فکر کی تصحیح کیلئے انہیں سمجھاتا ہے کہ: أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ۔ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ۔ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ۔ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ۔ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ۔ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ" کیا تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو قیامت کے روز کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور کسی مسکین کو کھانے کھلانے کیلئے تیار نہیں کرتا۔ تو تباہی ہے ایسے نمازیوں کیلئے۔ جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔ دکھانے (نفاق) کیلئے عمل کرتے ہیں۔ اور معمولی ظروف بھی عاریتاً دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔"(سورہ ماعون)

کم قناعت کرنے والوں کیلئے اور ہر آسائش پر دم نکلتے اور غیروں کی طرف جھکنے والے مسلمان نما کافر یعنی منافقین کے بارے میں قرآن کریم صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَىٰ أَن تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّـهُ أَن يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِندِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسَرُّوا فِي أَنفُسِهِمْ نَادِمِينَ

"پیغمبر آپ دیکھیں گے کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ دوڑ دوڑ کر ان (مشرک و کافر ٹولوں) کی طرف جارہے ہیں اور یہ عذر بیان کرتے ہیں کہ ہمیں گردش زمانہ کا خوف ہے، پس عنقریب خدا اپنی طرف سے فتح یا کوئی دوسرا امر لے آئے گا تو یہ اپنے دل کے چھپائے ہوئے پر پشیمان ہونگے۔" (سورۂ مائدہ /52)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا

کیا آپ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب کا حصہ دیا گیا ہے (پھر بھی وہ اپنی کم عقلی کی بنا پر) بتوں اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں (کی دنیاوی ترقی دیکھ کر اُن کے) بارے میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی نسبت یہ (کافر) زیادہ سیدھی راہ پر ہیں۔ (سورہ نساء /51)

یہ دونوں آیات ہیں جن میں پہلی میں تو مستقبل میں اُخروی ذلت سے ڈرایا جارہا ہے او ردوسری طرف اس دنیا میں بھی یہ افراد جو معاش کی خاطر کمزوری دکھاتے ہیں، ان کی نفسیاتی کیفیت سے آگاہ کیا جارہاہے۔ یہ دونوں آیات سیاسی بھی ہیں اور معاشی بھی اور عبادی بھی ہیں۔ ایک طرف نمازیوں اور مومنین کی آپس میں اخوت و بھائی چارگی کے

فروغ کا باعث ہیں اور اس کے مقابل فطرت کے باغی و غیر منطقی دشمن کی طرف ضرورت کی خاطر جھکنے سے خود کو محفوظ کرنا یہ خود ایک سیاسی عمل ہے اور معاشی بھی۔ یعنی فردی سیاسی ذہن مستقبل میں اپنے اور اپنے ایمانی بھائیوں کیلئے اچھے معاشی نظام کی تکمیل کرتا ہے اور اس پورے عمل کے دوران یہ اطمینان کہ یہ عبادت ہے خود فرد کو نفس مطمئنہ عطا کرتا ہے۔

مضبوط انفرادی معیشت کیلئے ضروری ہے کہ ملک میں عادلانہ نظام حکومت قائم ہو تاکہ اس کے پر برکت اثرات کی وجہ سے ایک جامع اور مضبوط قومی معیشت و اقتصادی نظام بھی دیگر نظاموں کے ساتھ افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضرورتوں سے لیکر ان کی معنوی و روحانی ضروتوں کیلئے بھی زمینہ فراہم کرے۔ کفار سے معاشی وابستگی، دراصل چند بنیادی شعبوں (تعلیم، سیاست و اقتصاد) کے ذمہ داران کی احمقانہ وابستگی ہوتی ہے جو مستقبل قریب میں تو شاید ان کیلئے فائدہ مند ہو مگر مستقبل بعید میں نہ صرف ان کیلئے بلکہ قوم کی بھی بے بصیرتی اور عملی اقدامات سے دوری اور حکام کو نصیحت و تادیب نہ کرنے کے جرم میں خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔

آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے ان کی زندگیوں کو ایک مثبت اور جامع ہدف دینا اور معاشی وسائل کے ذریعے جو آج کے صنعتی دور کی ضرورت ہے، ہمارا بنیادی مقصد ہونا چاہیے اور خود ہماری بھی روح جو اس جسم میں قید ہے ہم کو اپنے آپ کو بھی حدود و قیود اخلاقی میں قید رکھنا چاہیے کیوں کہ یہی اس دنیا کی زندگی کی فطرت ہے۔ فقیری اور امیری دو متضاد

کیفیات ہیں اور ان دونوں کیفیتوں کو خدا تعالٰی نے انسان کیلئے آزمائش قرار دیا ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ

اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔(سورہ بقرہ /155)

آزمائش خدا کی طرف سے نعمت ہے اُن افراد کیلئے جو عقل و فہم کھو بیٹھتے ہیں خواہ امیری میں یا غریبی میں، یہ آزمائشیں انسان کو جگانے کیلئے ہوتی ہیں، غفلت سے بیدار کرنے کے واسطے ہوتی ہیں۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

جو کچھ سر و سامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔(سورہ کہف /7)

اور عقل و فہم یعنی صحیح غلط، فائدہ اور بے فائدہ کاموں کی شناخت اُسی قوم یا شخص کی کم ہو جاتی ہے جس کا تقویٰ کم ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا

اے ایمان والو اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کرو۔ تو خدا تمہیں حق و باطل میں تفرقہ کرنے کی قوت وصلاحیت عطافرمائے گا۔(سورہ انفال /29)

نیز ایک ایمان والا پورے اقتصادی نظام کی اکائی ہے، اور سب کو چاہیے کہ مسلمان سماج کی ترقی کیلئے جانفشانی سے محنت کریں اور فردی معیشت کی بہتری کے ساتھ اسلامی معاشرے کے محروم افراد کا معاشی تعاون جاری رکھیں، بعض دفعہ انسان کے پاس منصوبے ہوتے ہیں مگر سرمایہ نہ ہونے کے باعث فقیر ہوتا ہے یا پھر پسند کے شعبے کا فنّی علم نہیں ہوتا، ایمان والوں کو کاہلی، سستی، عیش کوشی اور آرام طلبی سے دور رہنا چاہیے اور حلال رزق کیلئے ہمیشہ کڑی جدوجہد پر یقین رکھنا چاہیے کیونکہ جو دولت بغیر محنت اور کوشش کے حاصل ہوتی ہے اوّل تو اُس کا استعمال ہی حرام ہے اور دوسرے ایسی دولت جلد ہی ختم بھی ہو جاتی ہے اسلیئے شارٹ کٹ سے ہمیشہ بچنا چاہیے اور ترقی کی سیڑھی کو قدم بقدم چڑھنا ہی استقلال اور دوام کا باعث ہوتا ہے۔ جدید فنون و ہنر اور تعلیم نیز تحقیقی عمل کے ساتھ اخلاق و پرہیز گاری انسان پر رزق کے دروازے کھول دیتا ہے اور روزگار معیشت کے ساتھ تمام سماج سنبھل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی حلال ہی سہی مگر انسان کو میانہ روی اختیار کرنا چاہیے اور دولت کی ہوس نہیں کرنی چاہیے نیز فضول خرچی سے بچنا بھی فردی اور سماجی معیشت کے استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

لَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۔ فضول خرچی نہ کیا کرو، بیشک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(سورہ انعام /141) معاشرہ میں کرپشن، چوری، رہزنی وغیرہ

جیسے جرائم اُسی وقت وجود میں آتے ہیں جب کوئی ایک معاشرتی طبقہ اپنی ضرورت سے زیادہ دولت اپنے پاس جمع کرلیتا ہے اور پورے نظام میں دولت کا ارتکاز نہ ہونا معاشرے کے دوسرے افراد پر رزق کے دروازے بند کردیتا ہے اور نتیجتاً محروم افراد اپنی ضروریات کیلئے جرائم کا /گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے مالداروں پر ٹیکس لگا کر ایسے محروموں اور کمزوروں کیلئے صدقہ، خیرات جیسے قوانین سے معاشرے کی ضروریات کا سدباب کرنا چاہا ہے۔

امام علی: علیہ السلام اعمل لدنياك كأنّك تعيش أبدا و اعمل لآخرتك كأنّك تموت غدا

اپنی دنیا کے لئے ایسے کام کرو جیسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور اپنی اخرت کیلئے ایسے کوشش و محنت کرو جیسے کل ہی اس دنیا کو چھوڑ جانا ہے۔ (بحار الانوار (ط-بیروت) ج44، ص139)

تاریخ میں ایسے افراد کو قرآنِ کریم نے اشارہ کیا ہے جو اپنی اقتصادی حالت میں آزمائش کے دور سے گزرے لیکن اس امتحان میں فیل ہو گئے۔

لَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ

جب انہوں نے اس (حق کی) نصیحت کو فراموش کر دیا جو ان سے (معاشی عدل کے متعلق) کی گئی تھی تو ہم نے (انہیں اپنے انجام تک پہنچانے کے لیے) ان پر ہر چیز (کی فراوانی) کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں (کی لذتوں اور راحتوں) سے خوب

خوش ہو (کر مدہوش ہو) گئے جو انہیں دی گئی تھیں تو ہم نے اچانک انہیں (عذاب میں) پکڑ لیا تو اس وقت وہ مایوس ہو کر رہ گئے۔ (سورہ انعام /44)

آخر میں امام سجاد علیہ السلام کی صحیفۂ سجادیہ کی مکارم اخلاق کے حوالے سے کی گئی دعا سے اقتباسات پیش کرتے ہیں: "خدایا! محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما اور میری آبرو کو مالداری کے ذریعے محفوظ کر دے اور میری منزلت کو غربت کی بنا پر گرا نہ دینا کہ تیرے طلبگاروں سے رزق طلب کرنے لگوں اور تیری بدترین مخلوقات کے سامنے ہاتھ پھیلا دوں اور پھر اس فتنہ میں مبتلا ہو جاؤں کہ جو دیدے اس کی تعریف کرنے لگوں اور جو نہ دے اس کی مذمت میں لگ جاؤں۔ جب کہ تو تنہا ہر عطا کا مالک ہے اور کوئی دوسرا ایسا نہیں۔" "خدایا! محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرما اور میرے وسیع ترین رزق کو میرے بڑھاپے میں عطا فرما اور قوی ترین قوت کو عاجزی کے دور میں مرحمت فرما۔ مجھے عبادت کی کسلمندی میں مبتلا نہ کرنا اور اپنے راہ حق سے اندھا نہ بننے دینا اور اپنی محبت کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنے دینا۔ جو تیرے ساتھ ہیں ان سے الگ نہ ہونے پاؤں اور جو تجھ سے الگ ہو جائیں ان کے ساتھ نہ رہنے پاؤں۔"

عقل و قلب

تفکر، تدبر و تعقل عقلی کیفیات ہیں جبکہ وجدان، عرفان، جذباتیت قلبی حسی کیفیات ہیں یہ دونوں کیفیات حق و باطل کے ادراک میں معاون ہوتی ہیں۔ عقل کا تعلق عالم مادّی کے مظاہر سے ہے جبکہ قلب کا تعلق عالم مثال کے مظاہر سے ہے۔ عقلی تفکر کی بھی قسمیں ہیں، جیسے قیاس، برہان، استدلال نیز قلبی وجدان کی قسمیں ہیں جیسے واردات، خواب، مکاشفہ عقل جذبات کو مہمیز دینے، روکنے یا کنٹرول کرنے کیلئے ہے، عقل صحیح و غلط، حق و باطل، کھرے اور کھوٹے کا فرق معلوم کرتی ہے یہ عمل تفکر کہلاتا ہے۔ جذبات کو حق پر عمل کرنے کیلئے اعضاءوجوارح کولاشعوری طور پر آمادہ کر دیتی ہے اور اسی طرح باطل کی شناخت کرواکر اس پر عمل نہ کروانے کیلئے رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے۔ یہ عمل تعقل کہلاتا ہے۔ کس سے رابطہ رکھنا ہے، کس سے تعلق بنانا ہے، کس چیز شخص، جگہ، یا نام و تصور سے جذبات کو محکم کرنا ہے کس سے نہیں یہ سب تعقل کے ذریعے معلوم کیا جاتا ہے۔ عقل کا استعمال شعوری اور خود عقلی عمل ہے، عقل خود کے استعمال کو جتنا زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ عمل پر آمادہ کرتی ہے اتنا ہی انسان کا عملی دائرہ کار بڑھتا جاتا ہے، تفکر و تعقل کے ذریعے ہی انسان اپنے لئے اہداف و مقاصد کا تعین کرتا ہے اور پھر ان اہداف کو پانے کیلئے ذرائع، وسائل کی دستیابی، وقت و زمانے کے تعین کیلئے کوششیں اور مہمیز، جذبات کے

ذریعے عقل کے توسط سے ہی وجود پیدا کرتیں ہیں۔ فطری قوانین کا ادراک یعنی سماجی و انسانی و طبیعی ترقی و تنزلی کے قوانین تاریخ اور تجربے کے ذریعے عقل ہی کے توسط سے درک کیے جاتے ہیں۔ طبیعیات کے قوانین بھی عقل کے ذریعے ہی درک ہوتے ہیں، ان قوانین کی روشنی میں انسان اپنے اہداف و مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ انسانی فطرت میں "ضمیر" نام کا احساس ہوتا ہے جس کا تعلق عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔ یہ عقل ہی کی ایک صفت ہے۔ اس کا کام کوالٹی کنٹرول کا ہوتا ہے کہ تفکر کی فیکٹری سے جو مال آرہا ہے جس میں ہر طرح کی معلومات ہوتی ہیں، عمل یعنی اشیاء سے تعلق پیدا کرنے اور ہدف قرار دیئے جانے کیلیئے ان میں سے کس معلومات سے رابطہ رکھنا ہے اور کس سے نہیں یہ اسی "ضمیر" کا کام ہے۔ پھر عقل کی ایک صفت ہے ارادہ جو انسان کو روکنے یا مہمیز دینے کا جذبہ ہے۔ "ضمیر" اور "ارادہ" دونوں نیم عقلی اور نیم قلبی ہیں جن کے ذریعے مختلف اخلاقی صفات کا اکتساب ورد کیا جاتا ہے۔ ضمیر اور ارادہ کو منظم کرنے کا عمل تدبر کہلاتا ہے۔ عموماً مردوں کی غالب کیفیت عقلی ہوتی ہے اور خواتین کی قلبی۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں سے کچھ میں عقلی غالبیت کا عنصر فطری ہے جبکہ بعض شعبوں میں قلبی، جیسے ریاضیات، فلسفہ، سائنس وغیرہ میں عقل کو غالب کیفیت سے استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ فنون لطیفہ وغیرہ میں قلب و جذبات کو غالب کیفیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ عقلیت پسند اور رومانیت پسند کی اصطلاح اسی باعث رائج ہوئی کہ غالب عنصر کے طور پر جو جس کیفیت میں ملوث ہوتا ہے اُس کو اسی کیفیت سے نسبت دے دی جاتی ہے،

حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان ان دونوں کیفیت کی معتدل حالت رکھے بغیر نفس مطمئنہ نہیں پاسکتا۔ مگر انسان کی کیفیت کبھی عقلی کیفیات کی طرف جذب و رجحان رکھتی ہے کبھی قلبی، لہذا جب عقل کا استعمال اپنی آخری حدود کو چھونے لگے تو عقل کے استعمال کو افراط سے بچاتے ہوئے قلبی ضروریات کو پورا کرکے جذبات کو اور عقل کو معتدل کیا جاتا ہے اور اسی طرح جن کی غالب کیفیت قلبی ہو وہ جب حد اکثر اور افراط کی حد تک پہنچ جائے تو عقلی امور میں ملوث کرکے دونوں بُعد کو معتدل کیا جاتا ہے۔ دونوں ابعاد کو تفریط سے بچانے کیلئے بھی یہی نسخہ ہے کہ اُسی بعد میں ڈوب جایا جائے جس میں کمی ہو رہی ہے۔ اس حد اکثر کو پہچاننے کا ابھی تک کوئی آلہ ایجاد نہیں ہوا ہے جو عقل کے بے حد استعمال کو حد آخر تک پہنچنے سے پہلے آگاہ کردے یا قلب کی کیفیت کو حد مرض تک جانے سے پہلے مطلع کردے۔

ان کیفیات کو درست اور صحیح سمجھنے کیلئے ہمارے پاس قرآن کریم جیسا معیار موجود ہے، جو ہمارے تفکرات و تخیلات و جذبات و احساسات کو یقین کی کیفیت عطا کرتا ہے اور ہم پر واضح کرتا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ جو قرآن کریم کا مطالعہ نہیں کرتا یا اس کی حقانیت پر عقیدہ نہیں رکھتا وہ ہمیشہ خود ساختہ فلسفوں اور مبتذل آرٹ کا دلدادہ ہوکر نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یا پھر جس کو قرآن کریم سمجھ میں نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی عقل و قلب مردہ ہو چکے ہیں اور یہ صرف ہوا کے جھونکے کی سمت چلتا ہے، ایسے افراد کا بھی کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔

سیدھا راستہ

(حق کی دریافت کے ذرائع)

مذہبی زندگی گذارنا ایسے افراد کیلئے جن کو وراثت میں مذہب ملا ہو عموماً مشکل نہیں ہوتا، مذہب کے دعوے دار ایک طرف جہاں خالق کائنات کے عقیدے کی تبلیغ کرتے ہیں تو اُسی کے ساتھ روزمرہ زندگی کے ڈھنگ کو بھی ایک خاص انداز سے اپنانے پر زور دیتے ہیں۔ مذہب یوں تو اخلاقی حکمتوں اور کردار کی بلندیوں پر لیجانے کی تلقین کرتا ہے مگر آج کے دور میں اکثر دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ مذہب کے دعوے دار افراد بظاہر زیادہ بے ایمان، اخلاقی گراوٹ، اور نفسیاتی تنزل کا شکار ہوتے ہیں۔

زندگی جہاں گھریلو ہوتی ہے وہیں سماجی اور معاشرتی بھی ہوتی ہے نیز اس نجی اور سماجی زندگی کی بنیاد تین چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے ایک تعلیم دوسرا ثقافت وتہذیب تیسرا معیشت۔ ان تینوں امور کو انتظامی شخصیت (سماج میں حکومت) بالادست شعبے کے عنوان کے تحت منظم کرتی ہے۔ تعلیم تمام شعبہ جات کی بنیاد کے طور پر انسانی سماج کو اخلاق اپنانے اور روزگار دلانے کیلئے معاون ہوتی ہے دوسری طرف قائدانہ صلاحیت کے حامل افراد کو مختلف

اداروں کو چلانے اور امور کو منظم کرنے کیلئے علم و ہنر و ہمت عطا کرتی ہے، نیز مثبت قلبی احساسات کی حامل رسوم کو فروغ دینے میں معاون ہوتی ہے۔

مذہبِ حق یعنی مذہبِ اسلام کے دعوے دار بھی ایسے ہی اعمال کو اپنانے پر زور دیتے ہے جس میں مذہب صرف دوسرے مذاہب سے جدائی اور انفرادیت کے عنوان کے طور پر یعنی سلبی انداز کا حامل نہ ہو بلکہ ایجابی پہلوؤں پر توجہ رکھتے ہوئے در حقیقت ربانی اخلاق کو نجی اور سماجی زندگی میں رائج کرنا مقصود ہو۔

مذہبِ حق یعنی خالق کائنات کے بنائے ہوئے وہ اصول و قاعدے جو اُس نے انسان کو کامیاب کرنے کیلئے بنیاد قرار دیئے ہیں، پر عمل کرنا۔

مذہبِ حق فقط ثواب کی خاطر چند اذکار کا زبانی ورد یا اعضائے انسانی سے ادا ہونے والے تھوڑے بہت افعال کا نام نہیں ہے بلکہ، نجی زندگی جس میں خاندان بنانے اور چلانے، معاشی اعمال، سماجی اعمال، سیاسی اعمال کو ادا کرتے ہوئے اخلاق و کردار کو بنیاد قرار دے کر اپنانے کا نام ہے۔

مذہبِ حق انسان کو کامیابی کی لذت کی طرف لیجاتا ہے اگر مذہب کے نام لیوا سعادت سے اور کامیابی کی لذت سے محروم ہیں یا سماج کو مذہبی گردانے والے سعادت اور خوش بختیوں سے دور ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو اس سماج کا مذہب حق نہیں ہے یا پھر مذہبِ حق پر عمل درست انداز میں نہیں ہو رہا ہے۔

خالق کائنات کے بنائے ہوئے اصول و قاعدوں کے حامل ہونے کے دعوے دار بہت سے مذاہب ہیں مگر حق کی شناخت کیلئے تمام مذاہب کا تنقیدی مطالعہ ضروری ہے نیز اس سے پہلے ذاتی شناخت اور ذاتی صلاحیتوں کو درک کرنا نیز مذہب کو جامع کہنے والوں کیلئے سماجی اور انسانی علوم کا ادراک سب سے زیادہ ضروری ہے کیونکہ اسی کے بعد درست مذہب یعنی زندگی گذارنے کی فطری بنیادیں دریافت ہو سکتی ہیں، مذہبِ حق کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔جب سونا اصلی ہونے کی حکمت پتا ہو تو کبھی کوئی لوہے کو سونا نہیں کہتا۔ انسان اپنی اور سماجی فطرت جس قدر پہچانتا ہو گا جتنا وہ کائنات میں حاکم فطرت کو درک کر سکتا ہے اتنا ہی مذہب حق کو درک کرنے کی صلاحیت ہو گی۔مذہبِ حق بھی حق کی نشانیوں سے پہچانا جاتا ہے حق کے دعوے داروں سے نہیں۔

عاقل انسان جو بغیر کسی تعصب اور دباؤ کے مذاہب کا مطالعہ اور تحقیق اس ہدف کے تحت انجام دے کہ جس سے وہ اپنی ذاتی نجی زندگی اور سماجی زندگی میں کامیاب و سرخرو ہو سکے نہ صرف ذاتی زندگی میں بلکہ خود سے مربوط اُن افراد کیلئے بھی جو اُس کے زیر کفالت یا توجہ طلب ہیں اُن کیلئے بھی اس مقدس تحقیق کو انجام دے۔ یہ تحقیقی جذبہ ممکن ہے اوائل زندگی میں پیدا ہو جائے یا پھر جوانی اور بڑی عمر میں، مگر اس تحقیق کے فوائد ہر دور میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ اوائل عمر میں اس کے فوائد زیادہ ہیں جس کے باعث نہ صرف محقق کی ذات بلکہ ایک وسیع حلقہ اس سے فیضیاب ہوتا ہے۔

اس تحقیق کی صرف چند کڑی شرائط ہیں، وہ یہ کہ یہ تحقیق بھرپور انداز میں بغیر کسی تعصب، رشتہ داری، دباؤ، کسی معاشی وابستگی، سیاسی وابستگی کے ہو۔ نیز مطالعہ، مشاہدہ کے ساتھ تدبر و عمیق فکر و باریک بینی کے ساتھ تجزیہ پر مشتمل ہو۔ نیز اس تحقیق سے ذاتی نجی زندگی سے لیکر سماج کی نجی زندگی، سماجی معاشی و سیاسی زندگی مثبت، تعمیری انداز میں گذارنے کیلئے اصول وضوابط اور قانون و قاعدے کا استخراج ہو۔ ایک ایسا قانون جو ہمہ گیر ہو اور تربیتی انداز اپنائے ہوئے ہو، جس میں بچے، خواتین، نوجوان، جوان، بوڑھے، ادھیڑ عمر نیز نباتات و حیوانات کے حقوق ادا کرنے کے بھی رمز و رموز، فرائض اور ذمہ داریاں بیان کئے گئے ہوں۔ ایک طرف یہ غیر جانبدارانہ تحقیق جہاں انسان کو علم و حکمت سے منور کرتی ہے دوسری طرف خدا پر ایمان اور یقین پیدا کرنے کا بھی ذریعہ بنتی ہے۔ اگر خدا کی غیبی امداد اور فرشتوں کی مدد پر یقین نہیں پیدا کر رہی تو ایسی تعلیم انسان کو حیوان بھی بنا سکتی ہے اور دُنیاوی سرکشوں اور طاغوتوں سے خوفزدہ بھی کر سکتی ہے اگر یہ علم انسان کے قلب کو قوی نہ بنائے اور کامیاب ہونے کے واسطے تدریجاً چھوٹی چھوٹی مشقتوں کو انجام دے کر بڑی بڑی مشقتوں کیلئے خود کو اور دوسرے انسانوں کو تیار نہ کرے تو یہ ایسا ہی جاہل ہے جیسے کہ اَن پڑھ۔ یہ مشقتیں بھی جہاں کم علم آدمی کو مشقت لگتی ہے وہیں ایک با معرفت اور اہل ہمت و کوشش شخص کو یہ مشقتیں فرائض، ذمہ داری، دلچسپی اور لذت بخش محسوس ہوتی ہیں، یہ کشف انسان کو لذیذ ترین لگتے ہیں۔

مگر یہ تدریجی لذت بخش و پر کیف سفر اور جد وجہد اُسی کیلئے ہے جو علم و حکمت کا متلاشی اور تعلیم و تربیت کرنے کا شوقین ہو، جو اپنی نجی زندگی میں بھی اور سماجی زندگی میں بھی اس تحقیق کے نچوڑ پر عمل پیرا ہو اور دوسروں کیلئے بھی مواقع فراہم کرے وہ بھی تدریجاً ان عقلی و منطقی قوانین پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کیلئے بھی زندگی کو لذت بخش بنائیں /تربیت کریں۔

خالق کائنات سے دعا ہے کہ ہم سب کے ایمان کو کامل فرمائے نیز انسانی سماج کی خدمت کی ایسی توفیق عطا فرمائے جس سے خدا اور اُس سے منتخب بندے راضی و خوشنود ہوں، ہم کو عشق و تحقیق و جہاد کا نمائندہ قرار دے کر اپنے ولی کی نصرت کے قابل بنائے۔ آمین یارب العالمین

محنت اور معاش

اس عالم مادّی کامرحلہ معاشی محنت اور کوشش کے بغیر موت ہے۔

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

اور یہ کہ انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔(سورہ نجم /39)
انسان خواہ کتنا ہی چڑچڑائے کہ اُس کو کھانا کھانے کی حاجت کیوں ہے، پانی کی احتیاج کیوں ہے تو جواباً عرض ہے کہ ایک طرف جہاں یہ انسان کو خالق کی نعمت سے روشناس کراتی ہے تو دوسری طرف اس عالم مادّی کی فطرت بھی واضح کرتی ہے نیز عظیم ترین آزمائش پیٹ اور شرمگاہ سے مربوط ہے۔

بعض انسان ایسے بھی ہیں جن کی زندگی بھر جدوجہد کھانے، پینے تک ہی محدود ہوتی ہے اور صرف پیٹ بھرنے تک ہی نہیں بلکہ انواع و اقسام کی غذا سے لطف لینا اُن کی سرشت بن چکی ہوتی ہے۔

انگلستان کے صنعتی انقلاب سے پہلے اگر انسان صرف کھانے کیلئے محنت و کام کرتا تھا تو اِس کے بعد اور آج کے اس عالمی گاؤں بن جانے پر ارتباطات کے انقلاب میں انسان کی بنیادی ضروریات روٹی، کپڑا، مکان کی محدودیت سے باہر نکل کر بے انتہا ہوگئی ہیں۔ اس حرکت

نے جہاں عالمی سماج کو بے شمار ایجادات کے ذریعے اُن کی زندگی کو آسانی دی ہے وہیں بعض انسان سفاک سرمایہ دار کی پھیلائی گئی معاشی استحصالی پالیسیوں کے نتیجے میں قدیم بنیادی ضرورت یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کو بھی پورا نہیں کر پا رہے۔

امام علی:عَلَیْہِ السَّلَام إِذَا هِبْتَ أَمْراً فَقَعْ فِيهِ فَإِنَّ شِدَّةَ تَوَقِّيهِ أَعْظَمُ مِمَّا تَخَافُ مِنْهُ
جب بھی تمھارا مقابلہ خوف و وحشت سے ہو تو اُس کام میں کود پڑو کیوں کہ شدید خوف اُس کام سے زیادہ دشوار اور نقصان دہ ہے۔(نہج البلاغہ (صبحی صالح) ص 501، ح175)
اس مسئلہ کو جہاں بعض انسانوں کی ہوس نے فروغ دیا وہیں خود اُن محروم افراد کی کمزوری اور بے چارگی نے بھی دوچند کیا۔

فردی معاشی حالت میں جہاں حکومتیں اور اقتصادی ادارے اثر انداز ہوتے ہیں وہیں خود فرد کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنائے اور جدوجہد اور روزگار کو اپنے اور اپنے خاندان والوں کی کفالت کا ذریعہ بنائے۔

بے شک اس مورد میں انسان اور خصوصاً مسلمان کی ذمہ داری حلال کسب و کوشش میں ہونی چاہیے۔ نیز اس کو عبادت کا درجہ دے کر خداوند تعالیٰ اس بات کا متقاضی ہے کہ اُس سے ہر مسئلہ میں دعا و توسل روا رکھا جائے۔

رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم: امْنُنْ عَلَيْنَا بِالنَّشَاطِ وَ أَعِذْنَا مِنَ الْفَشَلِ وَ الْكَسَلِ وَ الْعَجْزِ وَ الْعِلَلِ وَ الضَّرَرِ وَ الضَّجَرِ وَ الْمَلَلِ

خدایا! ہم کو زندگی کا نشاط وخوشی اور ہمت سستے داموں دے دے اور ہم کو سستی، بوریت، کمزوری، بہانہ آوری، ضیاع، مردہ دلی اور غم سے محفوظ فرمادے۔

(بحار الانوار (ط-بیروت) ج 91، ص 125)

اقتصادی اور معاشی حرکت جہاں ضروریات زندگی فراہم کرنے کا موجب ہے وہیں بڑے بڑے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: إِنَّ مِنَ الذُّنُوبِ ذُنُوباً لَا يُكَفِّرُهَا صَلَاةٌ وَلَا صَدَقَةٌ قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ فَمَا يُكَفِّرُهَا قَالَ الْهُمُومُ فِي طَلَبِ الْمَعِيشَةِ

بعض گناہ ہیں جو نماز اور صدقہ کے ذریعے معاف نہیں کئے جاتے۔ سوال ہوا یا رسول اللہ! پھر کیا چیز معافی کی وجہ ہے؟ فرمایا: طلب معاش میں خلوص اور کوشش و جدوجہد۔ (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل ج 13، ص 13)

عبادت کو اگر کوئی مسلمان صرف نماز، روزہ اور حج وجہاد وغیرہ کی صورت میں تصور کرتا ہے تو وہ غلطی پر ہے بلکہ خود سے معاشی کوشش واقتصادی حرکت کرنی چاہیے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: الْعِبَادَةُ عَشَرَةُ أَجْزَاءٍ تِسْعَةُ أَجْزَاءٍ فِي طَلَبِ الْحَلَالِ

عبادت کے دس اجزاء ہیں جس میں سے نو جز کام کرنے اور جدوجہد و کوشش سے حلال روزی کمانے میں ہیں۔ (مستدرک الوسائل ومستنبط المسائل ج 13، ص 12)

البتہ آج کے صنعتی اور ارتباطات کے دور میں انسان اگر حلال طریقے سے بہترین معاشی حالت نہیں بنا سکتا تو اُس کی بنیادی علت نظام و سسٹم کی خرابی ہے اور اس کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ جدید تعلیمی نظام سے روگردانی ہے وہ نظام تعلیم جس میں موجودہ زمانے میں اقتصادی حالت کی بہتری کے لئے ہنر ہیں فنون ہیں۔ جہاں تک اقتصادی ہنر اور فنون کی بات ہے اِس کے حصول کو اسلامی تعلیمات رد نہیں کرتیں، ہاں اس کے ساتھ اخلاق و کردار کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

امام علی: عَلَیْہِ السَّلَامُ کُلُّ ذِی صِنَاعَةٍ مُضْطَرٌّ إِلَى ثَلَاثِ خِصَالٍ يَجْتَلِبُ بِهَا الْمَكْسَبَ وَهُوَ أَنْ يَكُونَ حَاذِقاً بِعَمَلِهِ مُؤَدِّياً لِلْأَمَانَةِ فِيهِ مُسْتَمِيلًا لِمَنِ اسْتَعْمَلَهُ

ہر اہل فن اپنے کام میں کامیابی کیلئے تین چیزوں کا ضرورت مند ہے: مورد نظر فن و ہنر میں ہشیاری اور مہارت رکھتا ہو، کام میں درستگی ہو اور لوگوں کے مال میں امانت دار ہو۔ کام دینے والے سے نیک کردار اور نیک دل ہو۔ (تحف العقول ص322)

مگر ہنر و فنون کی مثال آلہ کی سی ہے جس کو حلال و حرام دونوں راستوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے اور مسلمان پر ان جدید ہنر و فنون کو سیکھ کر حلال طریقے سے اپنی معاش کا بندوبست کرنا عین عبادت ہے۔

کسب معاش کیلئے آج کے دور میں جدید تعلیم کا حصول ایک مقدمہ کی حیثیت رکھتا ہے، پہلے مرحلے میں ہی اگر سستی اور کاہلی دکھائی تو اگلا مرحلہ دسترس سے باہر ہوتا ہے۔

امام علی: عَلَيْهِ السَّلَام ضَادُّوا التَّوَانِيَ بِالْعَزْمِ

عزم و ارادہ کے ذریعے سستی سے جنگ کو نکل پڑو۔(غرر الحکم و درر الکلم ص476، ح 10908)

پہلا مرحلہ کامیابی سے پایہ تکمیل ہو گیا اور پھر سست پڑ گئے تو نتیجہ اچھا نہیں ملے گا، بلکہ انسان کے آخری سانس تک کوشش وجدوجہد جاری رہنی چاہیے۔

امام علی: عَلَيْهِ السَّلَام مِنْ سَبَبِ الْحِرْمَانِ التَّوَانِي

اچھے نتیجہ سے محرومی کا ایک سبب سستی اور کاہلی ہے۔(تحف العقول ص80)

طلب معاش میں میانہ روی بھی بہت ضروری ہے۔ اور انسان کی اپنی ضروریات کے ساتھ مظلوموں اور محروموں اور کمزوروں کی بھی یاد رکھنا چاہے اور صدقہ، تحفہ، انفاق کو اپنی عادت بنانا چاہیے، یہ عادت جہاں قلبی سکون کا باعث بنتی ہے وہیں دولت اور مال میں اضافہ کا سبب بھی بنتی ہے، وہ اس طرح کے سماج کے تمام لوگ آپس میں جب ایک دوسرے کی ضرورت پوری کریں گے تو معاشرہ امن وسکون اور جرائم سے دور رہ کر مزید اقتصادی ترقی کا باعث بنے گا جس کے نتائج سے صدقہ دینے والا، انفاق کرنے بھی بہرہ مند ہو گا۔ اور

اسطرح نہ صرف دنیامیں ترقی وکامرانی نصیب ہو گی بلکہ اس دنیا کو سلامتی اور بہشت بنائے جانے پر خدا اُخروی جنت میں بھی داخل فرمائے گا۔ انشاء اللہ

امام علی: عَلَيْهِ السَّلَامُ اعمل لدنياك كأنّك تعيش أبدا و اعمل لآخرتك كأنّك تموت غدا

اپنی دنیا کے لئے ایسے کام کرو جیسے یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور اپنی اخرت کیلئے ایسے کوشش و محنت کرو جیسے کل ہی اس دنیا کو چھوڑ جانا ہے۔

(بحار الانوار (ط-بیروت) ج44، ص139)

معاشی حرکت جہاں انسان کے پیٹ کو پرودگار کی انواع و اقسام کی غذاؤں سے مستفید کرتی ہے وہیں اُس کی عقل کو بھی تقویت دیتی ہے، فہم ادراک اور سمجھ بوجھ میں اضافہ کرتی ہے، انسانی زندگی کو فطرت سے روشناس کراتی ہے اور اس زندگی میں جیسالیناویسادینا کے اصول کو سکھاتی ہے۔

امام علی: عَلَيْهِ السَّلَامُ ترك التجارة ينقص العقل

کام کاج ترک کر دینا عقل کے نقص کا باعث ہے۔ (اصول کافی (ط - الاسلامیہ) ج 5، ص 148، ح1)

مسلسل کوشش اور جدوجہد پر مبنی انسانی زندگی کی معاشی حرکت اُس کو اِس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے بعد خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور معاشرے کی بھی

ضروریات کو حتیٰ الوسع پورا کرتا رہے یہ ایک ایسا فریضہ ہے جو خداوند تعالیٰ نے ہر صاحب نعمت یعنی صاحب ہمت و ارادہ پر واجب کر دیا ہے۔

وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا

ور جو کوئی آخرت (اچھے نتیجے) کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کے لئے ایسی کوشش بھی کرے جیسی کہ کرنی چاہیئے درآنحالیکہ وہ مؤمن (ہنرمند) بھی ہو تو یہ وہ ہیں جن کی کوشش فائدہ مند ہو گی۔ (سورہ اسراء /19)

انفرادی طور پر خلوص، دیانت داری، صداقت، امانت داری کے ساتھ معاشی افعال میں مشغول ہو تو یہ منطقی طور پر انسان کو کامیاب کرتا ہے اور یہی اصول مجموعی طور پر بھی کامیاب کرتے ہیں۔ البتہ جب بات ہوتی ہے قومی اور ملکی سطح پر اقتصادی حالت کی تو اِس میں حکومت اور سماجی انتظامیہ کا بہت بڑا دخل ہے، حکومتیں ہی ہوتی ہیں جو ایسی پالیسیاں اور قوانین کو مرتب کریں نیز اس اقتصادی حرکت کو مثبت بنانے کیلئے عمومی ذہن کی تیاری یعنی میڈیا کے ذریعے ایسی تربیت انجام دی جائے کہ جس سے ہر شخص حلال روزی کیلئے کی جانے والی حرکات میں دیانت داری اختیار کرے۔

قومی اور ملکی سطح پر مرکزی بینکوں کا کردار بھی اہم ہے کہ وہ کاغذی کرنسی کی رسد طلب کے مطابق قرار دیں، طلب کی بنیاد محنت اور مہارت کو قرار دیا جائے، ملک سے کرپشن، رشوت، ربا کے خاتمے کیلئے ذہن سازی کی جائے نیز حلال روزی کے حصول کیلئے ہر سطح پر

ذہن سازی کی جائے۔ تعلیم اور ثقافتی میلوں اور محفلوں کے میدانوں کے ذریعے اس ذہن سازی کو انجام دیا جاسکتا ہے۔ حکومتی سطح پر مثبت اقدامات اسلئے ضروری ہیں کہ افراط زر غیر منطقی نہ قرار پائے، بلکہ زر کی چھپائی یا معاشرے میں اس کی ترسیل محنت کے ساتھ انجام پائے گئے اقتصادی اعمال کے نتیجے میں ہو۔ گھر بیٹھے کمانے اور بغیر محنت کیے روزی میں اضافہ کے خواہشمندوں کی حوصلہ شکنی کی جائے، انسان کی ضروریات کے مطابق اشیاء کی تیاری، صنعتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ ٹیکس وصولی کو موثر بنایا جائے، وغیرہ؛ البتہ اس مورد میں انتظامیہ کو سماج کو جدید شہری سہولیات اور اجرتوں کو بھی اس انداز اور مقدار میں ادا کرنا چاہیے تاکہ تاکہ لوگ کرپشن، فراڈ اور دھوکہ بازیوں کے ذریعے اپنی آمدنیوں میں اضافہ کرنے کے خواہاں نہ ہوں نیز اپنے محکمے اور کام سے مخلص ہو کر لگن اور توجہ سے سرگرمیاں جاری رکھیں۔ عادلانہ حکومت کے زیر سایہ معاشی سرگرمیوں میں بدگمانیاں، فراڈ اور بددیانتی کرنے والوں سے سختی سے نمٹنا چاہیے۔

امن وامان کی اچھی صورتحال سرمایہ جذب کرتی ہے، اس پر توجہ دی جائے اور بے جا افراط زر اور مہنگائی سے بچنا، پیداوار اور خلاقیت کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

آج جدید دور کے تمام قسم کے اقتصادی مسائل کی بنیاد "ربا" ہے۔ ربا بغیر محنت کیے حاصل کی گئی رقم، شہ یا جائز معاوضہ دیئے بغیر حاصل کی گئی خدمت کو کہتے ہیں۔ اسکے خطرناک نتائج ہم کساد بازاری اور معاشرے میں معاشی طور پر غیر متوازن طرز زندگی میں مشاہدہ

کرتے ہیں، یعنی کچھ طبقے یا گروہ حد سے زیادہ سرمایہ دار ہو جاتے ہیں اور کچھ طبقات غربت کی لکیر سے بھی نیچے پہنچ جاتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔

"اے ایمان والو! یہ دوگنا چوگنا بڑھتا چڑھتا سود نہ کھاؤ (اللہ کی نافرمانی) سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔" (سورہ آل عمران /130)

ہم کو اپنے ملک میں اسلامی ہونے کے تقدس میں ہی "ربا" کو ختم کرنا چاہیے، ربا کی تمام اقسام سے دوری اختیار کر کے ہی ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر 95٪ اقتصادی مسائل پر قابو پاسکتے ہیں۔ انشاء اللہ--- معاشرے کے باقی اقتصادی مسائل پر انفاق، زکواۃ، فطرہ، صدقہ ، خمس وغیرہ کا منظم نیٹورک بنا کر قابو پایا جاسکتا ہے،

مَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ۔

"جو چیز (روپیہ) تم اس لئے سود پر دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا اور جو زکوٰۃ تم خوشنودئ خدا کیلئے دیتے ہو ایسے ہی لوگ اپنا مال (کئی گنا) بڑھانے والے ہیں۔" (سورہ روم /39)

ربا جہاں مذہبی طور پر حرام ہے اور اُخروی نقصانات کا حامل ہے وہیں ربا اس دنیا میں بھی scientifically سرمایہ کی نابودی ہے۔ (کتاب ااسلامی اقتصادیات اور جدید اقتصادی مکاتب - از شہید باقر الصدر سے رجوع فرمائیں)۔

بین الاقوامی سطح پر بھی اوّل تو اقتصادی معاملات سے اسلامی 'حرام ربا' کو یکسر ختم کردینا چاہیے نیز کسی بھی ایک کرنسی کو بین الاقوامی تجارتی معاملات کی بنیاد نہیں ہونا چاہیے بلکہ جس ملک سے بھی تجارت ہورہی ہو وہیں کی کرنسی کو زر مبارلہ کے طور پر لینا چاہیے اس طرح کسی ایک کرنسی کی بالادستی ختم ہوجائے گی اور اس سے جہاں جو پیداوار ہورہی ہے اُس ملک کی اپنی معاشی حالت اور کرنسی طاقت پکڑے گی اور کسی ایک کرنسی کے اسٹینڈرد بنے رہنے سے اُس ایک کرنسی کے مالکان کی حرام خوری رک جائے گی نیز بر آمد کنندہ ملک اتنا ہی زر مبادلہ حاصل کر سکے گا جتنا اُس کا حق بن رہا ہو گا۔

یا پھر ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی ایک ملک کی کرنسی کو بن الاقوامی تجارتی معاملات میں اسٹینڈرد بنایا جائے تو اُس ملک پر لازم کیا جائے کہ بین الاقوامی شرح افراط زر کے باعث غریب ممالک کو جو اپنی کرنسی کی قیمت کم ہونے کے باعث زر مبادلہ نہیں کما پا رہے ہیں، اُس عالمی اسٹینڈرڈ کرنسی میں صدقات اور انفاق کے ذریعے مدد کی جائے۔ البتہ ان تمام اقتصادی معاملات کو منظم کرنے کیلئے عادل، صالح اور بندگان خدا کی خدمت کیلئے خلوص رکھنے والی حکومت اور انتظامیہ بھی درکار ہے جو دیانت دار اور امانت دار ہو، جیسے کہ اوپر بھی ترقی یافتہ اقتصادی معاشرے کے قیام کیلئے عادلانہ حکومت کی اہمیت پر زور

دیا گیا ہے۔ یہ حکومت خواہ ایک ملک کی ہو یا کسی خاص خطے پر ہو یا پھر پوری دنیا پر ایک حکومت ہو۔

خداوندا! ہم کو فقر سے محفوظ فرما، ہم کو اخلاقِ اقتصادی اپنانے کی توفیق دے اور ہم کو معاشی انحرافات سے محفوظ فرما ہم کو غنی کر دے اور ہمارے معاملات کو درست کر دے، کمزوروں پر رحم فرما، ظالموں سے مظلوموں کا حق واپس دلوا دے اور ہمیں اس دنیا سے اپنی یاد کے ساتھ اور اپنی معرفت کے ساتھ اٹھانا۔ آمین یارب العالمین

اِخلاق و اسلام!

داڑھی ہونی چاہیے یا نہیں؟!

نماز ضروری ہے یا نہیں؟!

یا دیگر واجبات و فرائض جو دین میں شرعی قانون کی اصطلاح کے عنوان سے موجود ہیں۔۔۔ جن کو ابتداً انسان ظاہری طور پر ہی انجام دیتا ہے۔ بعض نفسیاتی وجوہات کی بنا پر ان کے ظاہر کو نظر انداز بھی کر دیتا ہے۔۔۔!

"اور انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔" (القرآن الکریم)

ہمارا مقصد یہاں جُزجُز ان اعمال کی تفسیر و تشریح نہیں بلکہ کلیتاً ہم اس بات کی طرف اشارہ ضرور کر دیں کہ دین مبین اسلام نے نہ تو دین کو صرف ظاہری پہلو میں مقید کیا ہے نہ فقط باطن کے تزکیہ و تحلیل پر زور دیا ہے۔ بلکہ اپنے ان احکامات کو ان دونوں وجود کے معتدل رابطے کے ساتھ ترقی و شادابی کے لئے وضع کیا ہے۔

اگر انسان نماز پڑھتا ہے اور پھر بھی چوری کرتا ہے یا شہوت رانی میں مبتلا ہے تو ایسی نماز کا کیا فائدہ؟!

یا مثلاً انسان زکوٰۃ و فطرہ و خمس ادا کرتا ہے مگر حصول رزق کیلئے حرام و حلال کی پابندی نہیں کرتا اور استکباری و استعماری اداروں میں کام کرتا ہے تو ایسی عبادت کا کیا فائدہ؟

یا مثلاً داڑھی رکھے مگر جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی کی بنیاد پر امور زندگی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تو داڑھی جو نفاق کے طرز پر مسلمان معاشرہ کو دھوکہ دینے کیلئے ظاہر میں لباسِ تقدس اور باطن میں شیطان کا روپ دھارے اپنا مادّی مفادات کا الو سیدھا کرنے کی کوشش بھی ہو سکتی ہے، جلد یا بدیر نقصان کی ہی حامل حرکت ہے۔

مذہبی و ثقافی محافل ور سوم کا ذکر ہو یا معاشی سرگرمیاں، معاشرتی روابط ہوں یا پھر سیاسی اعمال!

اگر انسان کا کردار و اخلاق برا ہو اور چاہے وہ داڑھی رکھے یا نہیں نماز پڑھے یا نہیں یا دیگر فروع وواجبات و فرائض پر ظاہراً عمل کرے یا نہیں تو وہ اُس کمال کی منزل پر ہو گا؟ جس کے بارے میں قرآن کریم اپنے نبی حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرتا ہے کہ:

ہم نے آپ کو اخلاق کو کمال پر پہنچانے کیلئے مبعوث کیا۔

یہاں خدا نے یہ نہیں کہا کہ ہم نے آپ کو شادی کرنے کیلئے، روزگار بڑھانے کیلئے، حکومت بنانے کیلئے، نماز پڑھنے کیلئے، جہاد کرنے وغیرہ کیلئے مبعوث کیا بلکہ اِن سب فروع و مستحبات پر عمل کے دوران آپ کو اخلاق و کردارِ حسنہ کو فروغ دینے کیلئے بھیجا ہے۔ انسان کو مختلف شعبہ حیات کے آداب و اخلاق سکھانے کیلئے بھیجا ہے۔ ورنہ بھوک لگنے پر انسان کھاتا ہی ہے مگر اخلاق یہ بتاتا ہے کیا کھانا ہے؟ کیسے کھانا ہے؟ کب کھانا ہے؟ کتنا کھانا ہے؟ وغیرہ

فروع دین کی اگر ظاہری شکل خدا نے مقرر کی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان ان واجبات و فرائض کے ذریعے اپنے اخلاق و کردار کو اعلیٰ منزل پر لیجائے۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص جس گروہ سے مماثلت پیدا کرے گا وہ اُن ہی میں کا ہو جائے گا۔"

چاہے یہ اخلاق و کردار انفرادی حوالے سے ہو، معاشی حوالے ہو، سیاسی حوالے سے ہو یا ثقافتی سرگرمیوں کے حوالے سے ہو یا پھر معاشرتی روابط بنانے یا توڑنے کے مورد میں ہو۔ انسان ان تمام سرگرمیوں میں مثبت اندیشی سے تعمیری و تخلیقی رویوں کا حامل رہے اور خود کو اپنے ہر عمل کا خدا کے سامنے جواب دہ تصور کرے۔ اچھا اخلاق کیا ہے اور بُرا اخلاق کیا ہے؟ یہ ہر انسان اپنے وجود میں سے آتی آواز کو سن کر درک کر سکتا ہے۔ علم و جہل، دوستی و عداوت، حق و باطل اور سینکڑوں بہت سے اخلاقی اعمال جن کو انسان بہت آسانی سے تشخیص دے سکتا ہے کہ وہ بُرے ہیں یا اچھے!۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جس نے اپنے نفس کو پہچانا اُس نے حق و باطل کو پہچانا۔"

اور پھر یہ اخلاق و کردار کی عملی اشکال، انبیاء و معصومین علیہم السلام اپنی سیرت طیبہ کے ذریعے ہمارے سامنے ہر مسئلے کو کلی یا جزی طور پر پیش کر کے بتا چکے ہیں۔

انسان کو صرف تعصب کی دیوار گرا کر اور بزرگوں کی غیر منطقی رسوم و رواج کو منطقی احساسات حسنہ کی بنیاد پر پرکھنا چاہیے اور اپنے اخلاق و کردار کو تعمیر کرتے وقت تعصب کی

عینک لگائے بغیر، ظاہر داری سے اجتناب کرتے ہوئے علم کے دریچوں کو واکرتے ہوئے عمل کرنا چاہیے۔

"جو بھی خدا کی بارگاہ میں عاجزی دکھائے گا خدا اُس کو اونچا کرے گا اور جو بھی تکبر کرے گا خدا اُسے پست کر دے گا۔"(پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

بے شک اسلام کے مقدس قوانین صرف و صرف انسان سے بہترین اخلاق کے طلبگار ہیں اور ان سے خداوند قدوس کی صمدیت پر کوئی اثر نہیں ہے۔۔۔ اثر ہے تو صرف انسان کی ذات پر، اُس کے نظام ہائے حیات پر، اُس کے مستقبل کے ماحول اور آئندہ آنے ولی نسلوں کی جینز پر!

انسان کسی بھی روز گار حیات سے وابستہ ہو مگر اُس کے روزمرہ کے سیاسی اخلاق، معاشی اخلاق، معاشرتی اخلاق، خاندانی اخلاق، انفرادی نظم و ضبط ایسا ہونا چاہیے کہ خدا اُسے اپنی قدرت میں حصہ دار بناتا چلا جائے۔ جب خدا کو اُستاد جان کر شاگردی کا حق ادا کریں گے تو استاد بھی ذمہ داریاں دیتا چلا جائے گا۔

"حسن اخلاق، خاندانی شرافت کی دلیل ہے۔"(امام علی علیہ السلام)

جہاں تک اخلاق و کردار کی تعریف کی بات ہے تو یہ بھی انسان کو تمام تعصبات کو اور تمام انسیتوں کو کنارے رکھ کر اپنے ضمیر سے پوچھنا چاہیے کہ آیا جو عمل اس وقت میں انجام دے رہا ہوں وہ اخلاق حسنہ میں شمار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو روزرات کو بستر پر اپنا محاسبہ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

جہاں ناپاک و گمراہ کن خیالات دماغ میں آئیں تو خدا کی پناہ حاصل کرے، استغفار کرے اور اپنے عمل کو اور خیالات کو اخلاق حسنہ کی طرف واپس لے کر آئے۔ جس دن انسان اس ظرف کا حامل ہو جائے کہ اگر راہ راست ہٹنے لگے تو اِس کو محسوس کرے اور بار گاہ الٰہی میں رجوع کرے وہی دن اس کی عید کا دن ہے اور جو اِس کو عادات بنالے تو پھر بہشت تو بہشت یہ دنیا بھی اسکی خوشبو سے معطر ہو جائے گی۔ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"سب سے زیادہ چالاک وہ ہے جس نے گناہ کے بعد توبہ و استغفار کی۔"

اور یہ اخلاق و کردار کی رفعت ہو گی جو اس معاشرۂ انسانی کو جنت بنادے گی، ظلم و جور و نا انصافی کا شکوہ کرنے والا پھر کوئی نہ ہو گا۔ فریب و منافقت و ظاہر داری سے دھوکہ دینے والا کوئی نہ ہو گا۔ ہر انسان خدا کو جوابدہ ہونے کی صورت میں اپنے محاسبہ میں ایسا غرق ہو گا کہ اِس کرہ ارض کو جنت میں تبدیل کرنے کے صلہ میں خدا انسان کو اس جنت میں داخل کرے گا جو روز آخرت کے بعد خدا نے ایسے مومنین کیلئے تیار کر رکھی ہے۔ انشاء اللہ المستعان

فقیری اور ایمانی صبر

فقیر قوم اقتصادی طور پر دوسروں کی دست نگر قوم ہو جاتی ہے اور پھر سیاسی اور پھر ثقافتی طور پر غلام ہو جاتی ہے، یعنی جہاں اقتصاد اور معیشت ہاتھ سے گنوا دیتی ہے وہیں اپنی عزت اور آبرو بھی برباد کر لیتی ہے، اسی وجہ سے مسلمانوں کو چاہیے کہ فقیری کو اپنے درمیان سے اکھاڑ پھینکیں اور کسی صورت اس بات پر راضی نہ ہوں کہ غیروں سے وابستگی اختیار کریں اور اُن کے غلام بنیں۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: میں نے ان تمام چیزوں کا جائزہ لیا جو باعزت اور باوقار شخص کو ذلیل کر دیتی ہیں اور ان کی شوکت ختم کر دیتی ہیں۔ لہذا میں نے ذلیل کرنے والی اور شوکت کو ختم کر دینے والی چیزوں میں فقر و فاقہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں دیکھی۔ فقر و تنگ دستی کا مسئلہ بشری زندگی میں نیز آیات و روایات معصومین علیہم السلام میں بہت وسعت اور اہم نکات کے ساتھ اسلامی دستورات کا حصہ ہے، پہلا مسئلہ جو کہ فقر و غنا کے معنیٰ کا مسئلہ ہے؛ لوگ عموماً ایسے شخص کو جس کی آمدنی کم ہو فقیر اور جس کی زیادہ ہو غنی تصور کرتے ہیں، لیکن اسلام کی نظر میں ایسا نہیں ہے۔

اسلام کی نظر میں جس کی روح سیر اب و شاداب ہو ہر چند کہ اُس کی درآمد کم ہو غنی تصور کیا جاتا ہے جب کہ ایک شخص جس کی آمدنی بہت زیادہ ہو مگر سیر نہیں ہوتا ہو اور ہمیشہ خود کو محتاج دیکھتا ہے فقیر تصور کرتا ہے۔ امام حُسین علیہ السلام فرماتے ہیں: جو ہر چیز کی حرص کرتا ہے وہ فقیر ہے لہذا اگر ساری دنیا بھی اُسے دے دی جائے تو وہ سیر اب نہیں ہوتا۔ وہ افراد جو غیر شرعی حرام روزی کے پیچھے بھاگتے ہیں دراصل وہ فقیر ہیں لیکن وہ افراد جو آبرومندی کے ساتھ اپنی کم روزی اور درآمد پر شاکر رہتے ہیں وہ غنی ہیں۔

اسی کے ساتھ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اپنی خوراک سے راضی رہنے سے زیادہ فقر و فاقہ کو دور کرنے والی کوئی دولت نہیں ہے۔

غناء کی صورت میں شکر پروردگار واجب ہے،

پھر ہم نے ان کی بدحالی کو خوش حالی سے بدل دیا یہاں تک کہ وہ خوب بڑھے (اور پھلے پھولے) اور کہنے لگے کہ ہمارے باپ دادا کو بھی کبھی تکلیف اور کبھی راحت یونہی پہنچتی رہی ہے۔ تو ایک دم ہم نے ان کو اس طرح پکڑ لیا کہ انہیں اس کا شعور بھی نہ ہو سکا۔ (سورہ اعراف /95)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: فقر دنیا اور آخرت میں چہرے کے سیاہی کا باعث ہے؛

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امام علی علیہ السلام نے محمد بن حنفیہ سے فرمایا کہ میں خوف زدہ ہوں اُس دن سے کہ جس دن تم فقیر ہو، کیونکہ فقر انسان کے دین کو تباہ کر دیتا ہے یا ناقص کر دیتا ہے اور یہ چیز انسان میں کم عقلی کا باعث ہوتی ہے اور انسان درست اور صحیح فکر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں: فقیری زیرک آدمی کی زبان کو دلائل کی قوت دکھانے سے عاجز کر دیتی ہے اور مفلس اپنے وطن میں بھی غریب الوطن اور اکیلا ہوتا ہے۔

فقر بہت سے گناہوں کا سرچشمہ ہے اور انسان کو غیر شرعی حرام روزی کی طرف راغب کرتا ہے جیسے کہ رشوت، فراڈ، کرپشن؛ اگر کوئی ایمان میں طاقتور ہو اور فقر میں مبتلا ہو جائے تو ممکن ہے کہ گناہ میں نہ پڑے مگر بہت ممکن ہے جیسے کہ کہا گیا کہ فقر بہت سے گناہوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: سنگین فقر و فاقہ بدنام کرنے والی دولت سے بہتر ہے۔ یہ مسئلہ اقوام پر بھی صادق آتا ہے؛ فقیر قوم اقتصادی طور پر غیروں کی دست نگر بن جاتی ہے اور پھر سیاسی اور پھر ثقافتی طور پر غلام بن جاتی ہے یہ مسئلہ جہاد اکبر ہے اور درحقیقت امر بالمعروف اور نہی از منکر کرتے وقت کوشش کرنی چاہیے کہ اس موضوع کو اسلامی معاشروں میں رائج کریں اور کوشش کریں کہ فقیری اور دست نگری کو خود سے دور کریں۔

فقیری جہاں روپے پیسے میں ہوتی ہے وہاں فقیری روحانی طاقت اور ایمان کی بھی ہوتی ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: آگاہ رہو کہ فقر و فاقہ ایک مصیبت ہے اور فقر سے زیادہ سخت جسمانی امراض ہیں اور جسمانی امراض سے زیادہ سخت دل کی بیماری اور روحانی فقر ہے۔

جہالت کی مفلسی اور فقیری خود فرد کیلئے بھی اور معاشرے کیلئے بھی بہت زیادہ دردناک ہوتی ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: عقل و علم سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں اور جہل و نادانی سے بڑھ کر کوئی فقر و ناداری نہیں۔

نیز ایک اور جگہ فرماتے ہیں: ہر بے نیازی سے بالاتر عقل و خردمندی کا سرمایہ ہے اور سب سے بڑی ناداری حماقت ہے۔

اسلامی دستورات میں جہاں فقیر کیلئے اپنی خوراک سے راضی رہنے کی تلقین کی گئی ہے وہیں غنی افراد اور امیر لوگوں پر فرائض رکھے گئے ہیں کہ وہ اسلامی سماج میں فقراء کا خیال کریں۔

جیسے کہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اللہ سبحانہ تعالیٰ نے دولت مندوں کے مال میں فقیروں کی خوراکیں مقرر کی ہیں لہذا اگر کوئی فقیر بھوکا رہتا ہے تو اس لئے کہ دولت مند نے اُس کے حصہ کو سمیٹ لیا ہے اور خداوند متعال ان سے اس بارے میں سوال کرنے والا ہے۔

یہ روایت ثابت کرتی ہے کہ خالق نے سب کی روزی مقرر کرر کھی ہے اور جیسا کہ بعض ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ دنیا میں وسائل کم ہیں اور استعمال کرنے والے زیادہ۔۔۔ تو یہ منطق اسلامی نہیں ہے، بلکہ غربت کا اصل سبب وہ دولت مند اور ثروت مند ہیں جو لالچ میں اندھے ہو کر ہر نعمت اپنے پاس جمع کر لینا چاہتے ہیں۔

ایک اور جگہ آپ حضرتؑ فرماتے ہیں: جب دولت مند نیکی اور احسان میں بخل کرنے لگتا ہے تو فقیر اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے بدلے بیچ ڈالتا ہے۔

قرآن مجید میں فقر و ناداری کے حوالے سے دسیوں آیات موجود ہیں،

ایک جگہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: شیطان تمہیں مفلسی اور تنگدستی سے ڈراتا ہے۔ اور بے حیائی و غلط کاری کا تم کو حکم (ترغیب) دیتا ہے۔ اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور اپنے فضل و کرم کا وعدہ کرتا ہے۔ خدا بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔ (سورہ بقرہ /268)

ایسے افراد جو اپنی تخلیق کردہ مصنوعات اور اپنی تجارت پر گھمنڈ کرتے ہیں اور انفاق سے گریز کرتے ہیں کہ محتاجوں اور مساکین کو کچھ دیں ایسے افراد کیلئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس (پیداوار) کو (خشک کر کے) چُورا چُورا کر دیں تو تم باتیں بناتے رہ جاؤ۔ (سورہ واقعہ /65)

خداوند تعالیٰ سے دُعا ہے کہ ہمیں ہر طرح کے فقر و تنگدستی سے محفوظ رکھے نیز ہم کو مالی حقوق ادا کرنے والوں میں شمار فرمائے۔ ہم کو پروردگار عالم کا ہر حال میں شاکر بنائے اور صبر و استقامت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

ایک سوال: قیمتوں اور اجرتوں کا معیار کیا ہونا چاہیے؟

عقلی طور پر اشیائے صرف کی قیمتوں اور نوکری پیشہ افراد کی اجرتوں کے تعین کا معیار کیا ہونا چاہیے؟ چونکہ اسلام خود عین عقل اور عین فطرت ہے تو اسلامی نقطہ نگاہ یعنی آیات و روایات سے استنباط کرتے ہوئے اس کا جواب تلاش کرنا چاہیے!

ذیل میں چند معیارات دیئے جارہے ہیں، کیا یہ اس قابل ہیں کہ ان کو معیار مانا جائے یا مزید اور بھی ابعاد ہو سکتے ہیں؟

1۔ محنت کی بنیاد پر

مثلا: کسی چیز کی تیاری یا کام پر پر کتنی محنت صرف ہوئی۔۔۔

2۔ پیداوار کی بنیاد پر

مثلا: کسی چیز کی کتنی پیداوار ہوئی ہے۔۔۔۔

3۔ سماجی ضرورت کی بنیاد پر

مثلا: سماج میں /مارکیٹ میں اس کی کتنی ضرورت ہے۔۔۔۔۔

4۔ وقت / کام کی زیادتی یا کمی کی بنیاد پر

مثلاً: کسی چیز کی تیاری پر کتنا وقت صرف ہوا ہے۔۔۔۔ یا کوئی شخص کتنا زیادہ کام کرتا ہے۔۔۔۔

5۔ سرمایہ یا ملکیت کی نوعیت کی بنیاد پر

مثلاً: سرمایہ کتنا لگایا گیا ہے یا مطلوبہ کام کس کی ملکیت ہے۔۔۔۔ یا زیادہ سرمایہ لگانے والے اشیاء اور بڑی شخصیت کی ملکیت صنعت کی قیمت زیادہ ہونی چاہیے وغیرہ؟

6۔ مطلوبہ شعبے میں تعلیم کی نوعیت کی بنیاد پر

مثلاً: کتنا سائنسی اور علمی اصولوں کے مطابق تیار کی گئی ہے۔۔۔۔ نوکری میں یہ کہ کون کتنی ڈگریوں کا مالک ہے یا کس جگہ کی ڈگری ہے یا صرف کام میں مہارت اور ڈگری کے بغیر علم کی اہمیت ہے؟

7۔ متنوع ذمہ داریوں کی بنیاد پر

مثلاً: کون سی چیز سے کتنے کام لیے جاسکتے ہیں یا کون کتنے زیادہ یا کم کام کرتا ہے وغیرہ

8۔ کام اور چیز کی طلب و رسد کی بنیاد پر

مثلاً: مارکیٹ اور عوام میں چیز کی طلب کم ہے یا زیادہ یا پھر رسد زیادہ ہے یا کم؟

9۔۔ ٹیکس کی مقدار

مثلاً: چیز پر یا کام پر ٹیکس میں زیادتی یا کمی۔

متجددیت اور قدامت پسندی

(مختلف اقتباسات میں اضافہ وترامیم کے ساتھ)

کسی بھی تبدیلی اور انقلاب آنے کے لئے مخصوص افراد کا کردار بہت زیادہ موثر اور حیاتی ہوتا ہے. اگر ان افراد کے کردار نہ ہوتے تو یا کوئی بڑی تبدیلی نہیں آسکتی اور اگر تبدیلی آبھی جائے تو دیر پا نہیں ہو سکتی. لہذا لیڈر کسی بھی معاشرے کے لئے قطب نما ہوا کرتے ہیں. اسی وجہ سے اللہ تعالی نے بھی سب سے پہلے اس کائنات میں ہادی کو بھیجا تاکہ لوگ یہ بہانہ پیش نہ کرسکیں کہ ہمارا کوئی رہبر اور ہادی نہیں تھے جو ہماری راہنمائی کریں. اللہ تعالی کی یہ سنت آخری امت تک جاری رہی. اور اس پورے عرصے میں ان رہبروں کی شخصیت سب سے زیادہ موثر رہی یہاں تک کہ ان ہادیوں کے سرسخت دشمن بھی ان کے کردار سے متاثر ہو کر ان پر ایمان لاتے جس طرح آخری نبی ص کے بارے میں معروف ہے کہ دوست و دشمن سب ان کو صادق و امین جانتے تھے۔لہذا کسی بھی انقلاب کی جانکاری کے لئے اس مغز متفکر جو لوگوں کے اندر شعور پیدا کرتا ہے اس شخصیت کے کردار کا جاننا بہت ضروری ہے۔

اسلامی مجدد دین ، تعریف اور معیارات:

مجدد ایک اسلامی اصطلاح ہے، **مجدد** سے مراد وہ خاص شخص جو اپنے علمی و فکری کارناموں سے دین اسلام کو تازگی عطا کرتا ہے۔

یہ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سرے پر ایسے بندے (مجدد) بھیجتا رہے گا جو اس کے لیے دین کی تجدید کریں گے۔ جسے ابو داؤد کے علاوہ دوسرے ائمہ حدیث نے بھی بیان ہے۔ حاکم نے اپنی مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے۔ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ابو داؤد اور مستدرک حاکم کے علاوہ طبرانی کی معجم اوسط نے بھی ذکر کیا۔ امام بیہقی کی کتاب معرفۃ السنن و الآثار میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کے علاوہ مولانا عبد الحئ فرنگی محلیؒ نے مجموعۃ الفتاوی میں اس حدیث کی تخریج میں حلیہ ابو نعیم، مسند بزار مسند حسن بن سفیان اور کامل بن عدی کا بھی ذکر کیا۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ الصعود میں لکھا کہ اِتَّفَقَ الحُفَّاظُ عَلٰی تَصحِیحِہٖ یعنی حفاظ حدیث کا اس کی صحت پر اتفاق ہے۔ اس حدیث مبارک میں مَن یُجَدِّدُ لَھَا دِینَھَا کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ یہ الفاظ معیار مجددیت کو قائم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان الفاظ میں دین کی تجدید کا ذکر ہے۔ حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ حدیث تجدید کی شرح کرتے ہوئے مجدد کی صفت بیان کرتے ہیں کہ اَی یُبَیِّنُ السُّنَّۃِ مِنَ البِدعَۃِ وَیُکَثِّرُ العِلمَ وَیُعِزُّ اَھلِہٖ و یقمع البدعۃ ویکسر اھلھا۔ یعنی مجدد سنت کو

بدعت سے ممتاز کرے گا۔ علم کو کثرت سے شائع کرے گا اور اہل علم کی عزت بڑھائے گا، بدعت کا قلع قمع کرے گا اور اہل بدعت کا زور توڑ دے گا۔ مولانا عبد الحئیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے مجموعۃ الفتاوی میں فرمایا کہ مجدد کی علامات و شروط یہ ہیں کہ وہ علوم ظاہری و باطنی کا عالم ہو گا۔ اس کی تدریس و تالیف اور وعظ و نصیحت سے عام نفع ہو گا۔ وہ سنتوں کو زندہ کرنے اور بدعتوں کے مٹانے میں سرگرم ہو گا۔

اگر تجدید کا فریضہ کوئی ایسی ہستی سر انجام دے جس کو وحی کی رہنمائی اور معجزہ کی تائید حاصل ہو تو اس کو نبی یا رسول کہتے ہیں، جبکہ یہی فریضہ اگر کسی امتی کے ہاتھوں انجام پائے تو علم و فضل میں اعلیٰ مقام اور علوم ظاہر یہ و باطنیہ میں یکتائے روزگار ہوتا ہے۔ حامئ سنت اور قاطع بدعت ہوتا ہے گویا وہ ایک نابغہ عصر ہوتا ہے جس کو فراست میں حصہ وافر ملا ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کو کرامت کی تائید بھی حاصل ہوتی ہے۔ نبی اور مجدد کے کام کی یکسانی کے باوجود ان کے مقام و مراتب میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، نبی کی نبوت منصوص من اللہ ہوتی ہے، نبی وحی کی ہمہ وقت رہنمائی میں کام کرتا ہے، نبی اپنی نبوت کا اعلان کرنے کا پابند ہوتا ہے اس سلسلے میں وہ کسی شخص کی تائید و حمایت کا محتاج نہیں ہوتا۔ جبکہ مجدد کو اپنی صداقت کا ثبوت اپنے عزم و استقلال اور کام کی انجام دہی سے دینا ہوتا ہے۔ مجدد کے لیے اپنی مجددیت کا اعلان کرنا لازم نہیں ہوتا بلکہ اس کے ہم عصر علما و دانشمند اس کے علم و فضل اور تجدیدی کام کو دیکھ کر اس کے مجدد ہونے کا حکم لگا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مجددین رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی تجدیدی کوششوں کو ان کی زندگی میں معلوم نہ کیا جا سکا بلکہ بعد میں آنے والے علما نے ان کے مجدد ہونے کی تصدیق کی۔

دین میں بدعات کو ختم کر کے روشن سنت کو تازہ کر دینے کا نام تجدید ہے اور اس کام کو سر انجام دینے والی ہستی کو مجدد کہتے ہیں جو بالفاظ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا جاتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص اپنی ذاتی کوششوں یا اپنی جماعت کے پروپیگنڈے کے زور پر مجدد کے مرتبہ پر فائز نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ وہ علم و فضل، فقاہت، علم اور کشف و کرامت میں اعلیٰ مقام کیوں نہ رکھتا ہو، مجدد کے فرائض میں سے ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ان اعمال کو زندہ کرے جو متروک ہو چکے ہوں، افراط و تفریط، تحریفات و تاویلات اور بدعات سے دین کو پاک کرے، حق و باطل میں تمیز کرا کے دین کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور کے مطابق بنائے، اس کے ساتھ ساتھ اپنے روحانی فیضان سے لوگوں کو مستفیض کرے۔

مجدد چونکہ نبی کا ظل ہوتا ہے اور اس کو حسب فرق مراتب اولی الامر کا مرتبہ و مقام حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ نظام اسلامی کو قائم کرنے کی کوششیں کرتا ہے اور اس بگاڑ کو ختم کرنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کرتا ہے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ پیدا ہو جاتا ہے وہ باطنی فیض کو بھی تقسیم کرتا ہے اور اپنے وقت کے غوث و اقطاب و اوتاد، ابدال و نجبا اور اولیائے کاملین اس سے روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ ان اولیاء کو جو مقام و مرتبہ ملتا ہے اس کے وسیلے سے ملتا ہے۔ مجدد چونکہ نظام اسلامی کو قائم کرنے میں کوشاں ہوتا ہے لہذا وہ اس سلسلے میں حائل ہونے والی طاغوتی اور باطل قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے۔ وہ ان رکاوٹوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنے مقصد کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہوتا ہے۔ بالآخر وہ نظام اسلامی کو تمام بدعات و خرافات سے پاک کر کے اصل حالت میں لانے

میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ نبی کا منکر خارج از اسلام ہوتا ہے اور آخرت کے انعامات سے محروم کر دیا جاتا ہے جبکہ مجدد کا منکر اسلام سے خارج نہیں ہوتا لیکن وہ کتاب و سنت کی ترجمانی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

مجددین اور ان کی مخالفت

- ابتدائے خلقت بشریت سے آج تک، ہمیشہ ایسے افراد اور گروہ پائے جاتے رہے ہیں جو ہادیان الٰہی اور واقعی مصلحان کی مخالفت کے لئے سامنے آتے رہے۔ ان کے خلاف طرح طرح کے پروپگنڈے کرتے رہے اور انبیائے کرام، بشریت کی ہدایت اور اصلاح کے ذمہ دار اور پیشوا ہونے کے اعتبار سے دشمنوں اور مخالفوں کی جانب سے سب سے زیادہ مخالفت اور مزاحمت سے روبرو ہوتے رہے۔
- خداوند عالم کی طرف سے کوئی بھی نبی نہیں آیا مگر یہ کہ اسے مختلف قسم کے آزار و اذیت، آلام و مصائب، غیر انسانی برتاؤ، دشوار گزار رکاوٹوں اور منفی پروپگنڈوں کا سامنا کرنا پڑا۔
- **مجددین کے مخالفین:**

➢ مستکبرین / طالبان قدرت / اشرافیہ،

➢ راحت طلب افراد،

- بے دین دنیاپرست علماء،
- سادہ لوح فریب خوردہ عوام

خلاّق ذہن اور جدیدیت

. تخلیقی سوچ کا مطلب انسان کی وہ صلاحیتیں جن کی بدولت وہ نئے نئے آئیڈیاز تخلیق کرتا ہے. تخلیقی فکر میں تین اہم عناصر ہوتے ہیں.(۱) کسی مسئلے کو حل کرنے کی صلاحیت (۲) قابل قدر مقصد کی تلاش اور اسے پانے کی صلاحیت (۳) جدت. یعنی موجودہ اور روایتی انداز میں پائی جانے والی چیزوں. تصورات کو انفرادی انداز میں آپس میں ملانا یا نئے سرے سے ترتیب دینا ہے. تخلیقی سوچ والے افراد روایتی سوچ اور کردار کے مقابلے میں اپنی ذات اور سوچ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں دوسروں پر کم انحصار کرتے ہیں اکثر معاملات میں خود مختار ہوتے ہیں. ان میں عموما لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا احساس کم ہوتا ہے. مستقل مزاج ناکامیوں اور مشکلات سے گھبراتے نھیں بلکہ ہمیشہ ثابت قدم ہوتے ہیں. تخلیق شدہ چیزوں میں دلچسپی لینے کی بجائے تخلیقی عمل میں دلچسپی لیتے ہیں. ان کا گھریلوماحول مثبت اور خوشگوار ہوتا ہے. ہر معاملے میں دوسروں سے مختلف رویئے اور کردار کا مظاھرہ کرتا ہے. ایسا شخص کسی کی بات کو من وعن قبول نھیں کرتا.فیصلہ کرنے میں خود مختار اور اپنے عقائد پر ڈٹے رہتے ہیں۔

بے دین افراد نے بھی اس مورد میں عمومی طور پر انسانی ذہن کی کچھ کیفیات پر تحقیق کی ہے جس کی دو قسمیں ہیں۔

ترقی پسند ذہنیت Progressive mindset

ایک ترقی پسند ذہنیت سوچ کا ایک طریقہ ہے جو ترقی، تبدیلی اور بہتری کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ ترقی پسند ذہنیت کے حامل لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ نئی مہارتیں سیکھ سکتے ہیں اور ان کو ترقی دے سکتے ہیں، اور وہ چیلنجوں پر قابو پاسکتے ہیں۔ وہ نئے خیالات اور تجربات کے لیے بھی کھلے ہیں، اور وہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں۔

ترقی پسند ذہنیت کی کچھ خصوصیات یہ ہیں:

- ترقی اور تبدیلی کی طاقت پر یقین رکھتا ہے۔ ترقی پسند ذہنیت کے حامل لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ نئی مہارتیں سیکھ سکتے ہیں اور ان کو ترقی دے سکتے ہیں، اور وہ چیلنجوں پر قابو پاسکتے ہیں۔ وہ نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے سے نہیں ڈرتے، اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کے طریقے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

- نئے خیالات اور تجربات کے لیے کھلا سینہ رکھتا ہے۔ ترقی پسند ذہنیت والے لوگ نئے خیالات اور تجربات کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کمفرٹ زون سے باہر قدم رکھنے سے نہیں ڈرتے، اور وہ ہمیشہ سیکھنے اور بڑھنے کے نئے طریقے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

- خطرہ مول لینے کو تیار ہے۔ ترقی پسند ذہنیت کے حامل لوگ خطرات مول لینے کو تیار ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اپنے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے، انہیں بعض اوقات اپنے کمفرٹ زون سے باہر نکل کر نئی چیزوں کو آزمانا پڑتا ہے۔

- پر امید ہوتا ہے ہے۔ ترقی پسند ذہنیت کے حامل لوگ پُر امید ہوتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں، اور وہ چیلنجوں کا سامنا کرنے سے نہیں ڈرتے۔

یہاں کچھ مثالیں ہیں کہ ترقی پسند ذہنیت کس طرح فائدہ مند ہو سکتی ہے:

- اسکول میں، ترقی پسند ذہنیت طلباء کو نیا مواد زیادہ آسانی سے سیکھنے میں مدد کر سکتی ہے۔ جو طلباء نئے خیالات اور تجربات کے لیے کھلے ہوتے ہیں ان کے سیکھنے میں مشغول ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اور جب انہیں ضرورت ہوتی ہے تو وہ سوالات پوچھنے اور مدد حاصل کرنے کا زیادہ امکان رکھتے ہیں۔

- کام کی جگہ پر، ایک ترقی پسند ذہنیت ملازمین کو زیادہ کامیاب ہونے میں مدد کر سکتی ہے۔ وہ ملازمین جو خطرہ مول لینے اور نئی چیزوں کو آزمانے کے لیے تیار ہوتے ہیں ان کے اختراعی خیالات سے مسائل کا حل سامنے آنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ ان میں تبدیلی کے موافق ہونے کا بھی زیادہ امکان ہوتا ہے، جو آج کے تیز رفتار کام کی جگہ میں ایک اہم مہارت ہے۔

- زندگی میں، ترقی پسند ذہنیت لوگوں کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں مدد کر سکتی ہے۔ جو لوگ ترقی اور تبدیلی کی طاقت پر یقین رکھتے ہیں وہ اپنے لیے چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے ارادے قائم رہنے کا زیادہ امکان رکھتے ہیں۔

اگر آپ ترقی پسند ذہنیت کو فروغ دینا چاہتے ہیں، تو آپ کچھ چیزیں کر سکتے ہیں:

- نئ چیزیں سیکھنے کے لیے خود کو چیلنج کریں۔ کلاس لیں، کوئی کتاب پڑھیں، یا کوئی نیا شوق آزمائیں۔ جتنا آپ سیکھیں گے، اتنا ہی آپ بڑھیں گے اور بدلیں گے۔

- نئے خیالات اور تجربات کے لیے کھلے رہیں۔ اپنے کمفرٹ زون سے باہر قدم رکھنے سے نہ گھبرائیں۔ نئ چیزیں آزمائیں اور نئے لوگوں سے ملیں۔ آپ جتنا زیادہ تجربہ کریں گے، اتنا ہی آپ بڑھیں گے۔

- خطرہ مول لینے کے لیے تیار رہیں۔ ناکام ہونے سے مت ڈریں۔ ناکامی سیکھنے اور بڑھنے کا ایک حصہ ہے۔ آپ جتنے زیادہ خطرات اٹھائیں گے، اتنا ہی آپ سیکھیں گے اور بڑھیں گے۔

- پر امید رہیں۔ اپنے اہداف کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ پر اور اپنی صلاحیت پر یقین رکھیں۔ آپ جتنے زیادہ پر امید ہوں گے، آپ کے کامیاب ہونے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔

- ترقی پسند ذہنیت کو تیار کرنے میں وقت اور محنت درکار ہوتی ہے، مسلسل ذہنی مشق ضروری ہوتی ہے۔ ترقی پسند ذہنیت آپ کو اپنے اہداف کو حاصل کرنے، اپنے کیریئر میں زیادہ کامیاب ہونے، اور زیادہ بھرپور زندگی گزارنے میں مدد دے سکتی ہے۔

جامد یا محدود ذہنیت Fixed mindset

فکسڈ ذہنیت سوچ کا ایک طریقہ ہے جو فطری صلاحیتوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ ایک محدود ذہنیت کے حامل افراد کا ماننا ہے کہ ان کی ذہانت، قابلیت اور دیگر صلاحیتیں پتھر کی طرح قائم ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ مہارتوں کے ایک خاص مائنڈ سیٹ کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور وہ انہیں تبدیل نہیں کر سکتے۔

جامد ذہنیت کی کچھ خصوصیات:

- یقین ہوتا ہے کہ ذہانت اور ہنر طے شدہ ہیں۔ ایک جامد ذہنیت کے حامل افراد کا ماننا ہے کہ ان کی ذہانت اور ہنر پتھر پر لکیر کی طرح قائم ہے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ ایک خاص ذہانت اور قابلیت کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں، اور وہ اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔

- چیلنجوں سے بچتا ہے۔ فکسڈ ذہنیت والے لوگ چیلنجوں سے بچتے ہیں کیونکہ وہ ناکامی سے ڈرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر وہ ناکام ہو جاتے ہیں، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ کافی ہوشیار یا باصلاحیت نہیں ہیں۔

- آسانی سے ہار مان لیتا ہے۔ ایک مقررہ ذہنیت کے حامل لوگ چیلنجوں کا سامنا کرنے پر آسانی سے ہار مان لیتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ کافی اچھے نہیں ہیں، اس لیے وہ کوشش بھی نہیں کرتے۔

- اپنا موازنہ دوسروں سے کرتا ہے۔ فکسڈ ذہنیت کے حامل لوگ مسلسل اپنا موازنہ دوسروں سے کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان سے زیادہ ہوشیار یا زیادہ باصلاحیت ہو، تاکہ وہ اپنے بارے میں بہتر محسوس کر سکیں۔

- کامیابی کا کریڈٹ لیتا ہے اور ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتا ہے۔ فکسڈ ذہنیت والے لوگ اپنی کامیابیوں کا سہرا لیتے ہیں اور اپنی ناکامیوں کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ان کی کامیابیاں ان کی فطری صلاحیتوں کی وجہ سے ہیں، اور یہ کہ ان کی ناکامیاں دیگر عوامل کی وجہ سے ہیں، جیسے بد قسمتی یا غیر منصفانہ سلوک۔

یہاں کچھ مثالیں ہیں کہ کس طرح ایک جامد ذہنیت نقصان دہ ہو سکتی ہے:

- اسکول میں، ایک مقررہ ذہنیت طالب علموں کو آسانی سے ہار ماننے اور اپنی مکمل صلاحیتوں تک نہ پہنچنے کا باعث بن سکتی ہے۔ ایک مقررہ ذہنیت کے حامل طلباء چیلنجوں سے بچ سکتے ہیں اور اگر وہ فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں پاتے

ہیں تو وہ آسانی سے ہار مان سکتے ہیں۔ وہ اپنا موازنہ دوسرے طلباء سے بھی کر سکتے ہیں اور محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ کافی اچھے نہیں ہیں۔

- کام کی جگہ پر، ایک مقررہ ذہنیت ملازمین کو کم پیداواری اور خطرات مول لینے کا امکان کم کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ ایک مقررہ ذہنیت کے حامل ملازمین ناکام ہونے سے ڈر سکتے ہیں، اس لیے وہ نئے چیلنجز کا سامنا کرنے یا نئی چیزوں کو آزمانے سے گریز کر سکتے ہیں۔ جب انہیں ضرورت ہو تو مدد مانگنے کا امکان بھی کم ہو سکتا ہے۔

- زندگی میں، جامد ذہنیت لوگوں کو کم خوش اور مطمئن ہونے کا باعث بن سکتی ہے۔ جامد ذہنیت والے لوگ ہمیشہ محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ کافی اچھے نہیں ہیں، اس لیے وہ کبھی بھی اپنی پوری صلاحیت تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان میں اضطراب اور افسردگی کا بھی زیادہ امکان ہو سکتا ہے۔

اگر آپ جامد ذہنیت پر قابو پانا چاہتے ہیں، تو آپ کچھ چیزیں کر سکتے ہیں:

- ذہانت اور ہنر کے بارے میں اپنے عقائد کو چیلنج کریں۔ اپنے آپ کو یاد دلائیں کہ ذہانت اور ہنر طے شدہ نہیں ہیں، لیکن محنت اور مشق سے ترقی کی جا سکتی ہے۔

- اپنی طاقتوں پر توجہ دیں۔ ہر ایک کی طاقت اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اپنی طاقتوں پر توجہ دیں اور انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں۔

- اپنے لیے چیلنجنگ اہداف طے کریں۔ اپنے لیے مشکل اہداف طے کرنے سے نہ گھبرائیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ انہیں حاصل نہیں کرتے ہیں، تب بھی آپ اس عمل میں سیکھیں گے اور بڑھیں گے۔

- اپنے ساتھ صبر کرو۔ تبدیلی میں وقت لگتا ہے۔ راتوں رات اپنی سوچ بدلنے کی توقع نہ کریں۔ بس اس پر کام کرتے رہیں، اور آپ کو آخر کار نتائج نظر آئیں گے۔

- جامد ذہنیت پر قابو پانے میں وقت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترقی کی ذہنیت آپ کو اپنے اہداف کو حاصل کرنے، اپنے کیریئر میں زیادہ کامیاب ہونے، اور زیادہ بھرپور زندگی گزارنے میں مدد دے سکتی ہے۔

ترقی پسند ذہنیت اور جامد ذہنیت کے درمیان تاریخی تنازعات

ترقی پسند ذہنیت اور طے شدہ ذہنیت کے درمیان بہت سے تاریخی تنازعات رہے ہیں۔ سب سے زیادہ معروف مثالوں میں سے کچھ میں شامل ہیں: فطرت اور پرورش کے درمیان بحث۔ یہ بحث صدیوں سے جاری ہے، اور یہ اس سوال پر مرکوز ہے کہ آیا ہماری صلاحیتوں کا تعین ہمارے جینز (فطرت) سے ہوتا ہے یا ہمارے ماحول (پرورش) سے۔ ترقی پسند اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہماری صلاحیتیں قابل عمل ہیں اور محنت اور تجربے کے ذریعے ان کی نشوونما کی جا سکتی ہے، جبکہ فکسڈ ذہنیت رکھنے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ہماری صلاحیتیں مستحکم ہیں اور انہیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ IQ اور EQ کے درمیان

بحث۔ IQ ذہانت کا ایک پیمانہ ہے، جبکہ EQ جذباتی ذہانت کا پیمانہ ہے۔ ترقی پسند اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ IQ اور EQ دونوں اہم ہیں، جب کہ جو لوگ فکسڈ ذہنیت رکھتے ہیں وہ یہ مانتے ہیں کہ IQ واحد چیز ہے جو اہم ہے۔

یہ خیال ہے کہ لوگ مختلف طریقوں سے سیکھتے ہیں، جبکہ متعدد ذہانت یہ خیال ہے کہ ذہانت کی مختلف اقسام ہیں۔ ترقی پسند اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لوگوں کو اس طریقے سے سکھایا جانا چاہیے جو ان کے سیکھنے کے انداز سے مماثل ہو، جب کہ فکسڈ ذہنیت رکھنے والے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سیکھنے کا صرف ایک "صحیح" طریقہ ہے۔ ان تنازعات کے نتائج مختلف ہیں۔ کچھ معاملات میں، ترقی پسند ذہنیت غالب رہی ہے، جب کہ دیگر معاملات میں، جامد ذہنیت غالب رہی ہے۔ تاہم، ایک بڑھتی ہوئی اتفق رائے ہے کہ ترقی پسند ذہنیت طویل مدت میں زیادہ فائدہ مند ہے. اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ترقی پسند ذہنیت لوگوں کو خطرہ مول لینے، ان کی غلطیوں سے سیکھنے اور وقت کے ساتھ بڑھنے اور بدلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ترقی پسند اور متعین ذہنیت کے درمیان تصادم کے سب سے اہم نتائج میں سے ایک "ترقی کی ذہنیت" کے تصور کا عروج ہے۔ گروتھ مائنڈ سیٹ کا یہ عقیدہ ہے کہ محنت اور مشق کے ذریعے ذہانت اور ہنر کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ یہ عقیدہ طے شدہ ذہنیت کے براہ راست برعکس ہے، جس کا خیال ہے کہ ذہانت اور ہنر مقررہ خصلتیں ہیں۔ ترقی کی ذہنیت حالیہ برسوں میں مقبولیت حاصل کر رہی ہے، اور تحقیق کا ایک بڑھتا ہوا ادارہ ہے جو اس کے فوائد کی حمایت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ترقی کی ذہنیت کے حامل طلباء کے چیلنجوں کا سامنا کرنے، نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے، اور اپنے اہداف حاصل کرنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں خوش اور مکمل ہونے کا بھی

زیادہ امکان رکھتے ہیں۔ گروتھ مائنڈ سیٹ ایک طاقتور ٹول ہے جو لوگوں کو اپنے اہداف حاصل کرنے اور پوری زندگی گزارنے میں مدد کرسکتا ہے۔ اگر آپ ترقی کی ذہنیت کو اپنانا چاہتے ہیں، تو آپ کچھ چیزیں کر سکتے ہیں: ذہانت اور ہنر کے بارے میں اپنے عقائد کو چیلنج کریں۔ اپنے آپ کو یاد دلائیں کہ ذہانت اور ہنر طے شدہ نہیں ہیں، لیکن محنت اور مشق سے ترقی کی جاسکتی ہے۔ اپنی طاقتوں پر توجہ دیں۔ ہر ایک کی طاقت اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اپنی طاقتوں پر توجہ دیں اور انہیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کریں۔ اپنے لیے چیلنجنگ اہداف طے کریں۔ اپنے لیے مشکل اہداف طے کرنے سے نہ گھبرائیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ انہیں حاصل نہیں کرتے ہیں، تب بھی آپ اس عمل میں سیکھیں گے اور بڑھیں گے۔ صبر کریں۔ تبدیلی میں وقت لگتا ہے۔ راتوں رات اپنی سوچ بدلنے کی توقع نہ کریں۔ بس اس پر کام کرتے رہیں، اور آپ کو آخرکار نتائج نظر آئیں گے۔ ترقی کی ذہنیت کو اپنانا ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔ ترقی کی ذہنیت کے فوائد حقیقی ہیں، اور وہ آپ کو اپنے اہداف حاصل کرنے اور مکمل زندگی گزارنے میں مدد کرسکتے ہیں۔

تجدد، پروگریسو ازم یا انقلابیت کیا ہے؟

پروگریسو ازم (ترقی پسندی) ایک سیاسی فلسفہ ہے جو سماجی انصاف، معاشی اصلاحات اور ماحولیاتی تحفظ کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ ترقی پسندوں کا خیال ہے کہ حکومتی مداخلت اور سماجی سرگرمی کے ذریعے معاشرے کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

ترقی پسندی اور مذہبی انقلابی کچھ مشترک خصلتوں کا اشتراک کرتے ہیں:

- تبدیلی کی ضرورت پر یقین۔ ترقی پسند اور مذہبی انقلابی دونوں کا خیال ہے کہ موجودہ نظام میں خامی ہے اور اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ تبدیلی کی مخصوص نوعیت پر اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ تبدیلی ضروری ہے۔

- افراد کی طاقت پر یقین۔ ترقی پسند اور مذہبی انقلابی دونوں کا خیال ہے کہ افراد دنیا میں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ وہ مختلف قسم کے افراد پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں، لیکن وہ دونوں یقین رکھتے ہیں کہ لوگوں میں تبدیلی لانے کی طاقت ہوتی ہے۔

- سماجی انصاف کی اہمیت پر یقین۔ ترقی پسند اور مذہبی انقلابی دونوں اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ معاشرہ تمام لوگوں کے لیے منصفانہ اور مساوی ہونا چاہیے۔ وہ انصاف کی مخصوص تعریف پر اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن وہ دونوں سمجھتے ہیں کہ یہ ایک اہم مقصد ہے۔

- اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بنیاد پرست ذرائع استعمال کرنے کی آمادگی۔ ترقی پسند اور مذہبی انقلابی دونوں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بنیاد پرست ذرائع استعمال کرنے کے لیے تیار ہو سکتے ہیں۔ اس میں احتجاج، مظاہرے، یا تشدد بھی شامل ہو سکتا ہے۔

- تاہم، ترقی پسندی اور مذہبی انقلابات کے درمیان کچھ اہم فرق بھی ہیں۔ مثال کے طور پر، ترقی پسند عام طور پر موجودہ نظام میں اصلاحات پر توجہ دیتے ہیں، جبکہ مذہبی انقلابی نظام کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے زیادہ تیار ہو سکتے ہیں۔ مزید بر آں، ترقی پسند عام طور پر دلیل اور ثبوت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، جبکہ مذہبی انقلابی ایمان اور وحی پر زیادہ زور دے سکتے ہیں۔

- بالآخر، ترقی پسندی اور مذہبی انقلابات کے درمیان مشترک خصائص ان کے مشترکہ عقیدے کی عکاسی کرتے ہیں کہ دنیا ایک بہتر جگہ ہو سکتی ہے اور یہ کہ افراد کے پاس اسے انجام دینے کی طاقت ہے۔ تاہم، ان دونوں تحریکوں کے درمیان فرق اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کے مختلف طریقوں کی عکاسی کرتا ہے۔

ترقی پسندوں اور مذہبی انقلابیوں کی مشترک مثالیں:

ترقی پسند: تھیوڈور روزویلٹ، جین ایڈمز، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر وغیرہ

مذہبی انقلابی: محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حسین ابن علیؑ، مارٹن لوتھر، مہاتما گاندھی، آیت اللہ خمینی وغیرہ

یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ تمام ترقی پسند یا مذہبی انقلابی ان تمام خصلتوں میں شریک نہیں ہیں۔ تاہم، یہ کچھ سب سے عام خصلتیں ہیں جو ان دو گروہوں میں پائی جا سکتی ہیں۔

اہلبیتؑ کا فکری منہج اور سائنس

جدید سائنس کی بنیاد inductive reasoning پر قائم ہے اس سے قبل deductive reasoning کی بنیاد پر مفکرین اور فلاسفہ دماغوں کو سلا کر محو خواب تھے۔

Inductive reasoning کی بنیاد یونانی مفکرین اور ہندوستانی مفکرین تھے جن کا ادراک کرنے والے وحی کے پیروکار محمد خاتم النبیین ص کے مطیع مفکرین تھے۔

چھٹی صدی عیسوی قبل یونان ہندوستان اور چینی فلسفوں کی بنیاد استقرائی منطق inductive reasoning تھی جو کبھی تکے میں صحیح ہو گئیں تو ہو گئیں کچھ پتا نہیں تھا۔ تجربے کی بنیاد (empirical evidence) پر قانون فطرت کی دریافت مسلمان مفکرین سائنسدانوں کی دین ہے جسے inductive reasoning استقرائی منطق کے خیالِ کام کو تجربے سے مشاہدہ کر کے یا محسوس کر کے یقین کیا جاتا ہے اور یہی طرز فکر بیسویں اور اکیسویں صدی کی سائنسی تحقیقات اور ٹیکنالوجی کا راز ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر مسلمان اس ٹیکنالوجی کی تیاری میں کیوں پیچھے ہیں۔۔۔۔؟

جب تک مسلمان معاشرے اہلبیت وحی ع کے زیر اثر رہے ذہنی فکری و عقلی ترقی کرتے رہے، مگر جب جب انہی مسلمانوں نے یہودیوں کی لاشعوری کاسہ لیسی شروع کی اور اہلبیت وحی ع پر روزگار زندگی تنگ کرنا شروع کیا تو پھر قدرت نے بھی انتقام لیا۔۔۔۔

اس کے کیا عوامل رہے؟ وہ یہ کہ بنو امیہ اور بنو عباس نے فکروں کو منجمد کرنے والے درباری مفتیوں سے فتوے لئے اور جبر و دھونس کے ذریعے افکار پر پابندی لگائی گئی۔ نیز اہلبیت وحیؑ کے یعنی inductive reasoning کے ساتھ empirical evidence کے مقابلے پر بغداد میں یونانی فلسفوں یعنی inductive reasoning کے فقط خیالوں کو فروغ دیا گیا اور یوں انسانوں کی توجہ خیالات و افسانوں کی طرف مبذول کروادی۔ اس کا ایک واضح سبب تو اہلبیت وحی ع کے وجود سے بیگانہ کرنا تھا کیونکہ انسان جب ان کے نزدیک ہوتا تھا تو وہ کسی بھی درجہ کا ہو ان سے متاثر ہوتا تھا، خواہ فلسفی مفکر ہو یا کسان، جولاہا ہو یا کاروباری وغیرہ اور یوں اہلبیت وحیؑ اپنے سیاسی حق یعنی حکومت کی زمام لینے کے حق کو عوامی امنگوں کے ذریعے آشکار کرتے تھے۔ وہ امنگیں جس میں توحید اور توحیدی اذہان و قلوب دانش وجدوجہد کے ذریعے اپنی سرنوشت تحریر کرتے ہیں۔

اموی و عباسی دور کی عیاشیاں، رنگ رلیاں، شہوت رانیاں، دنیاوی لذتوں کی اسیری کے باعث پورے سماج کا یہی رویہ ہو چکا تھا اس کے باوجود اہلبیت وحیؑ کو مقتول کردیا گیا تاکہ انسانی سوچ فکر ائمہ اہلِ بیتؑ کے منطقی حق کو دریافت نہ کر سکے۔۔۔۔

دوسری طرف روم، فارس، ہندوستان، چین شرک و بت پرستی یعنی محدود سوچ کے علاقے تھے۔ جبکہ محمد خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کے ذریعے انسانی ذہن کو انفسی توجہ کے ساتھ آفاقی اور لامحدود سوچ کا حامل بنادیا تھا مگر اموی و عباسی ادوار میں صرف دنیا پرستی کے نشے پورے کرنے کیلئے اس آفاقی سوچ و فکر کو جامد بنادیا گیا۔ مغرب جو کہ محمد خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقریبا 1000 سال بعد روشن فکری کے نام پر جاگا تو مسخ

شدہ عیسائیت کو اسی سبب خیر باد کہا کہ وہ بھی فکر و شعور پر پابندی رکھتے تھے۔۔۔ مغرب کے ریناسنس میں مذہب سے دوری اختیار کرنا اچھا تھا مگر نصرانیت جو کہ مسخ شدہ تھی اور گمراہ کنندہ تھی کے ساتھ یہی ہونا تھا مگر غلطی یہ ہوئی کہ ہر مذہب کو نصرانیت کے ترازو میں تول دیا گیا۔۔ جس کا نتیجہ روشن خیالی ڈسکورس یعنی انسانی سعادت و خوش بختی کو لونیل ادوار کی دہشت گردیوں میں شرمندہ ہو گیا نیز پہلی اور دوسری عالمی جنگوں نے رہی سہی کسر ذلت بھی پوری کر دی۔

جبکہ اسلام اس کے برخلاف سوچ پر کسی طرح کی پابندی نہیں رکھتا تھا جس کا ثبوت اہلبیت وحیؑ کے سائنسی افکار اور لیکچرز ہیں جو آج بھی کتابوں میں موجود ہیں اور انہی کے شاگردوں میں سے عظیم سائنسدان فلسفی اور مفکرین نکلے۔۔۔

مگر جس نے اہلبیت وحیؑ کو چھوڑا وہ راندہ عقل ہو گیا۔۔۔۔ مغربیوں نے اسلام کے نام پر پھیلے گئے مسلمانوں کی بڑی تعداد کے بیانئے کو حقیقت سمجھا جو کہ اموی اور عباسی ادوار میں پروان چڑھا تھا تو اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح باور کیا، جبکہ حقیقی اسلام جس میں سوچ و فکر پر کوئی پابندی نہیں تھی یعنی مکتبِ اہلبیت وحیؑ کی تعلیمات کو درخور اعتناء نہیں سمجھا اور اسلام کا ایک چھوٹا سا فرقہ اور گروہ جان کر دانستہ توجہ سے دور رکھا۔

اہلبیت وحیؑ کے پروان چڑھائے شاگردوں نے ہی یونانی فلسفیوں ارسطو، افلاطون، بقراط کے خیالی inductive approach کو empirical evidence سے منتھی کر کے نئے طرز استدلال و اثبات کو مغرب میں تفسیر کیا اور خود نیچرل اور سوشل سائنسز

نیز inductive منطق کے ساتھ تجربہ سے اثبات (empirical approach) کی طرح ڈالی۔

آج بھی نہ تو مغرب اپنے محسنوں کا شکریہ ادا کرنے پر تیار ہے اور نہ ہی مسلمانوں کا جمع غفیر، یعنی اہلبیت وحیؑ کا شکریہ۔۔۔۔

آج اکیسویں صدی میں مغرب بھی اپنے علمی غرور کی حیات پوری کر چکا ہے جبکہ مسلمانوں کا جمع غفیر آباو اجداد کی روایات کو چھوڑ کر اہلبیت وحیؑ کے در پر جھکنے کو تیار نہیں ہے۔

مغرب اور مشرق کی اس جدید انجماد فکری سے نکل کر اگر دیکھا جائے تو مکتب اہلبیت وحیؑ کا طرز فکر، استدلال، منطق ہی ہے جو عالم بشری کو مذہب کی چھتری تلے ہی سائنسی افکار کی ترویج کیلئے تیار کرتی ہے۔

تاریخ سے انجماد فکری کا جو درس ملتا ہے وہ یہ ہے کہ جب جب کوئی قوم دنیا پرست، شہوت پرست، عیش کوش، آرام طلب، فخر طلب، مغرور، طرز فکر کے ساتھ نعمتوں میں مست ہو جاتی ہے اور اقوام عالم کو غلامی اور تصرف میں لینے کیلئے خدائی احکامات کی نافرمانی کرتی ہے تو اس کے سبب قانون قدرت اسے تاریخ کے کچرے دان میں ڈال دیتا ہے۔ ایسے مذاہب جو انسان سے ایسے طرز فکر کا مطالبہ کریں جس میں اپنا اپنا دیکھا جائے یا دنیا پرستی، شہوت پرستی، آرام طلبی، اور تکبر کو فروغ دیا جائے تو ایسے مذہب کو ترک کرنا بہتر ہوتا ہے۔۔۔۔ ایسا مذہب اور مے نوشی کرنا ایک جیسا ہے۔ کیونکہ جو مذہب خدا کی طرف سے ہے وہ نشئی نہیں بناتا، سلاتا نہیں، فکر کو جام نہیں کرتا، نہ ہی سختی، جبر و اکراہ کو اپناتا ہے

بلکہ ہر لمحہ ہوشیار بیدار اور تعمیری اور تخلیقی ذہن کو بناتا ہے، گلستانوں کی آبیاری کرتا ہے، فکری
پھولوں اور ذہنی ہریالی کا سبب بنتا ہے۔۔۔۔۔ لہذا جس کا مذہب ایسا نہیں ہے وہ سمجھ لے کہ
یہ خالق کی طرف سے نہیں بلکہ خود ساختہ مذہب ہے اور تحریف شدہ ہے۔

قرآن کو ترتیبِ نزولی سے پڑھنے کا فائدہ

انسانی تہذیب طول تاریخ میں مختلف اقسام کے انقلابات اور تہذیبی تبدیلیوں سے گذری ہے جن میں سب سے زیادہ باقی رہ جانے والی تہذیبوں کے اثرات میں الہٰی ادیان کی تہذیبیں ہیں۔ مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں سب سے اہم اقدار ابراہیمی مثلاً اسلام، مسیحیت، یہودیت اور ان سے وابستہ گروہوں کی تہذیبیں ہیں۔

قرآن مجید ان الہٰی تہذیبوں میں سے آخری مینی فیسٹو ہے جس میں انسانی کمال اور سعادت کے کامل رموز شامل ہیں۔

قرآن جس تدریجی ترتیب کے ساتھ نازل ہوا اس کو دریافت کرنے کیلئے ہوشیاری کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے اور یہ عمل اس نکتہ کو واضح کرتا ہے کہ خداوند عالم نے تبلیغ حق و حقیقت کیلئے کس روش کو مناسب اور درست سمجھا اور خلقت کے اہداف کو پانے کیلئے کن طریقوں کو انسان کیلئے بہتر اور درست جانا۔

اگر نزول قرآن ایک دفعہ میں ہی ہو جاتا تو یہ عمل انسانی معاشرے کی تربیت کیلئے غیر معقول طریقہ ہوتا۔ قرآن کا تدریجی نزول یعنی مرحلہ بہ مرحلہ اس کا اترنا اس لئے ضروری تھا کہ انسان جیسے ایک نوالہ حلق سے اتارنے کے بعد ہی دوسرا ڈالتا ہے۔ اگر یکمشت پوری پلیٹ منہ میں بھرلے تو غذا ضائع بھی ہو گی اور حلق میں پھنسنے کے باعث موت بھی واقع

ہو سکتی ہے۔ چونکہ پروردگار عالم خالق ہے اس لئے وہ بہتر جانتا ہے کہ کیا چیز کب، کیوں، کیسے، کتنی ضروری و غیر ضروری ہے۔

قرآن ٹکڑوں کی صورت میں جو تدریجی اور مرحلہ بہ مرحلہ نازل ہوا اس کی وجہ یہ ہے تاکہ لوگوں کیلئے پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی رہے اور حالات و واقعات کے تجربات کے دوران جب احساسات زندہ ہوتے ہیں حکم کی نوعیت اور اس کے قرینے سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ اسی وجہ سے 23 سال کے عرصے میں رسول پر سوروں اور آیات کی صورت میں مختلف اوقات میں ضروری ہدایات، شرائط، لوگوں کے سوالات کی مناسبت سے نازل کیا گیا۔ انسان کو کمال اور کامیابی کی طرف لیجانے کیلئے تیار کیا جارہا تھا اور مرحلہ بہ مرحلہ ایک اسٹیج کے بعد دوسرے کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ جیسے تعلیمی پروسس میں بچہ پہلی جماعت سے ڈاکٹریٹ تک کا سفر تدریجاً طے کرتا ہے اور ایک مرحلہ کو خوش اسلوبی سے طے کرکے خود کو اگلے کیلئے تیار کرتا ہے۔

آیات و سوروں کو معاشرے کی ظرفیت، ضرورت کے تحت خداوند حکیم نے جس خاص ترکیب و ترتیب سے نازل کیا ہے یہی روش قرآنی آیات و سوروں کی ہے جو ترتیب نزولی میں موجود ہیں۔ چونکہ انسان کی نفسیات، ذہن اور قلبی احساسات اور کل کائنات میں جاری وساری نظام اور اس میں موجود علل و اسباب اسی طرح سے جاری و ساری ہیں جس طرح لاکھوں سال پہلے یعنی انسان کی موجودہ نسل سے بھی پہلے سے جاری و ساری تھے۔ لہذا آج جدید دور میں بھی جب ہمیں اپنے اور اپنے معاشرے کیلئے ترقی و کامیابی کیلئے طور طریقوں کی دریافت، قواعد کلیہ کا استخراج مطلوب ہو تو ہم اس ترتیب و ترکیب سے قرآن خوانی کریں جو فطری اور خود خالق کائنات کی خلق کردہ ہے۔

ہر کام کے انجام دہی اور نتیجہ خیز ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اسے اُس عمل کی خاص روش اور طور طریقے پر انجام دیا جائے۔ جیسے ہم بچوں کی پیدائش پر کرتے ہیں، پودا لگاتے وقت کرتے ہیں، کھانا پکاتے وقت کرتے ہیں وغیرہ۔ اگر بچے کو ہمیں ڈاکٹر بنانا ہے اور ہم اُس کو پیدا ہوتے ہیں میڈیکل کالج بھیج دیں تو نہ بچہ رہے گا اور نہ ہمارا مقصد پورا ہو گا۔ اگر ہم پودے کا بیج ڈالتے ہیں چاہیں کہ اس میں کیڑے مار دوائیاں ڈال دیں جو پتوں پر ڈلی جاتی ہیں اور پودا بڑے ہو کر اس کے سائڈ افیکٹ سے بچ جاتا ہے اور اپنی طاقت و قوت سے بچتا ہے اور صرف کیڑے ہی مرتے ہیں۔ یہ زہر پودے کا نقصان نہیں پہنچاتا ورنہ یہ بیج نابود ہو جائے گا۔ کھانے پکانے کیلئے اگر ہم مرحلہ وار عمل نہ کریں تو کھانا بھی نہیں پکا سکتے۔ وغیرہ

اس کائنات میں ہر عمل کیلئے خاص روش ہے، خاص طریقہ ہے، خاص ترتیب اور ترکیب ہے جو بھی اس پر عمل نہیں کرے گا وہ کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید دنیا و آخرت میں کامیابی کی نوید دیتا ہے ان لوگوں کو جو ان طریقوں، روشوں پر اس عمل کی نتیجہ خیزی کیلئے ان کی مطلوبہ ترتیب اور ترکیب سے عمل کرتے ہیں۔ قرآن مجید وہ فارمولا ہے جس میں دنیا و آخرت کی کامیابی اور کمال کیلئے تمام مطلوبہ طریقہ کار موجود ہیں۔ ترتیب نزولی وہ اسٹریٹیجی ہے جو خدا نے معاشرہ کو منقلب اور تربیت کرنے کیلئے استعمال کی ہے اور یہی ترتیب وہ زنجیری سلسلہ ہے جس میں تمام سوروں کے اسباب نزول یعنی واقعات تاریخی تسلسل کے ساتھ موجود ہیں اور آپس میں باہم ربط رکھتے ہیں۔ اس اسٹریٹیجی سے قرآن مجید کا مطالعہ ہمیں اس اصل ہدف و مقصد پر لا کھڑا کرے گا جہاں ہم اسی روش سے آشنا ہوں گے جو پروردگار عالم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے معاشرے کی اصلاح و

تربیت کیلئے استعمال کی۔ اس تناظر میں دیکھیں تو قرآن مجید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت وکردار کا آئینہ دار ہے۔

آخر الزمان اور امام زمان (عج)

کوئی ظلم اُس وقت تک نہیں پنپ سکتا جب تک مظلوم خود کوئی کوتاہی نہ کرے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۗ

اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔ (سورہ رعد / 11)

مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مفسد۔ غرض جو بھی ہو وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت، جب کہ اُس کے اندر ارادے کی طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ، صبر ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی اور جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کیلئے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبّر ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو اور دوسرے انسانوں کو موہنے اور ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور ان سے کام لینے کی صلاحیت ہو۔ پھر ناگزیر ہے کہ اس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں، جو جوہر آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔ مثلا: خودداری،

فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعت قلب و نظر، سچائی، امانت داری، راستبازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔

اس میں شک نہیں کہ مادّی وسائل کا حصول، طبعی ذرائع کا استعمال اور اسبابِ خارجی کی موافقت بھی کامیابی کیلئے شرط لازم ہے مگر اصل چیز جو انسان کو انفرادی یا اجتماعی طور پر گراتی اور اٹھاتی ہے اس میں سب سے بڑھ کر دخل اخلاقی طاقت کو ہی ہے۔ اخلاقی طاقت ہی ہے جو اس نوع بشر کو خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے۔

یہ سرمایہ اخلاق مجتمع ہو کر مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں۔ مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض، بلکہ اپنی جان، مال اور اولاد سے زیادہ عزیز تر رکھیں۔ ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انہیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کیلئے ناگزیر ہے۔ وہ صحیح و غلط رہنما میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں۔ ان رہنماؤں میں اخلاص اور حُسن تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں، خود قوم بھی اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو۔ ان پر اعتماد رکھتی ہو اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی اور مادی ذرائع ان کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حساس رائے عامہ پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کیلئے نقصان دہ ہو۔

یہ صفات ایسی تلوار کی مانند ہیں جو ڈاکو کے ہاتھ لگ جائیں تو آلہ ظلم بن جائیں اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے ہاتھ جا کر وسیلہ خیر و صلاح بن جائیں۔ مومن کیلئے ان صلاحیتوں کے حصول کا مقصد وہی ہے جو قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور (مقصد و کامیابی تک پہنچنے کیلئے) تیری ہی مدد پر بھروسہ کرتے ہیں۔

یہ وہ اخلاقی نعمتیں ہیں جو خدا کسی محبوب قوم کو عطا کرتا ہے اس شرط پر کہ وہ اُسی وقت تک کامیاب رہیں گی جب تک وہ کامیابی کے قانون کا اتباع کریں گی وگرنہ یہ صفات جس قبیلہ یا قوم میں پیدا ہو نگی خدا اُس کو کامیابی عطا فرمائے اور زمین پر اقتدار دے گا، یہی قوم پھر خدا کی محبوب بن جاتی ہے۔ کوئی مالک ایسے شخص کو باغبان نہیں بناتا جو باغ کو ترقی و تکامل نہ دے سکے، خدا بھی ایسے افراد کا زمین میں اقتدار قائم رکھتا ہے جب تک وہ زمین کیلئے فلاح، ترقی اور تعمیر و تخلیق کرتے رہتے ہیں۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّـهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللَّـهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنے طرزِ عمل کو نہیں بدل دیتی اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔(سورہ انفال /53)

جدید دور کے آنے کے ساتھ اِس کے مثبتتات کو لیتے جائیں، منفیات کو نظر انداز کرتے جائیں نیز قدیم دور کے مثبتتات کو دوام دیتے رہیں اور منفیات کو ترک کرتے جائیں۔

کیا اس کیلئے ہم تیار ہیں؟؟

کیا ہم خدا کے ولی کے مدد گار بننے کیلئے آمادہ ہیں؟

کیا ہم خدا کے بنائے ہوئے کامیابی کے قوانین کو مسلمان قوم کی فلاح کیلئے استعمال کرنے پر تیار ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

اگر تم اللہ کے سسٹم پر چل کر خدائی قوانین کو پنپنے میں اُس کی مدد کرو گے تو خدا تمھارے قدموں کو ثبات دے گا اور بہتر قوانین اور سسٹمز عطا کرے گا۔(سورہ محمد، آیت 6)

ان قوانین کا اتمام روز غدیر ہو چکا ہے، جدید دور میں مقامات مقدسہ اور قلبِ مطہر امام زمانہ (عج) ان قوانین پر چلنے کیلئے طاقت و انرجی کے منبع ہیں۔

خدا بادل بھیجتا ہے جو بجلیوں سے بھرے ہوتے ہیں، بارش کی رحمت برساتا ہے، سبزہ کو جان دیتا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ۔

وہی ہے جو تمہارے سامنے بجلیاں چمکاتا ہے جنہیں دیکھ کر تمہیں اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں اور امیدیں بھی بندھتی ہیں وہی ہے جو پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔(سورہ رعد،12)

کیوں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ولی اللہ ایک ایسی شعاع ایجاد کرے جو الیکٹرک کرنٹ کی پیدائش ہی روک دے۔ ڈیم اور جنریٹر بجلی اور کرنٹ بنانا ہی بند کر دیں۔۔ کرنٹ جس کی خلقت ہے اور جس کی ملکیت ہے وہ طے کرتا ہے کہ کس کو دینا ہے کس کو نہیں۔

وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔

اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تم لوگوں کو بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم خوفزدہ بھی ہوتے ہو اور اُس سے فائدے اٹھانے میں لالچ بھی رکھتے ہو اور اسی کے ساتھ اوپر سے پانی برساتا ہے اور اس کے ذریعے سوکھی ہوئی زمینوں کو سرسبز کرتا ہے، یقیناً ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کیلئے جو عقل استعمال کرتے ہیں۔(سورہ روم / 24)

اگر خالق کے حکم سے جابروں اور سلطانوں کی ٹیکنالوجی کو برقی لہروں کی فراہمی روک دی جائے تو،

پھر نہ شب میں روشنی ہو گی اور نہ دن میں فیکٹریوں کی آوازیں، نہ کارخانہ کی گھن گرج، نہ کوئی موٹر چلے گی نہ پہیہ، نہ کمپیوٹر میں بجلی رہے گی نہ قمقموں میں روشنی،

نہ خلائی سیارے کوئی سگنل لیں گے نہ ہی کسی کو دے سکیں گے۔ نہ کوئی ون لنک چلے گا، نہ ہی وائی فائی۔

اُس دن نیا کرنٹ اور نئی دھات ہو گی، نیا ایندھن اور نیا فیول ہو گا۔

کیا اس کیلئے ہم تیار ہیں؟؟

کیا ہم اس ظالم ٹیکنالوجی کا نعم البدل دینے کیلئے تیاری کر رہے ہیں؟

کیا ہم خدا کے ولی کے مددگار بننے کیلئے آمادہ ہیں؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ

اگر تم اللہ کے سسٹم پر چلوگے کہ اُس کی مدد کر رہے ہو جیسے تو خدا تم کو اس سے بہتر قوانین اور سسٹمز عطا کرے گا۔ (سورہ محمد، آیت 6)

ہم کو اس سسٹم جس میں ہم ابھی موجود ہیں اس پر انہی قوانین کو Follow کرنا ہے، اِن پر خلوصِ عمل اور اپنے آپ اور آپ(عج) پر محکم امید کے ساتھ قدم آگے بڑھانا ہے۔

اُس ڈیم پر جہاں یہ بجلی بن رہی ہے اُس ڈیم کی حفاظت ہم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ وہ نماز، وہ تلاوت، وہ سجدہ، وہ مناجات، وہ دعائیں جو معصومین علیہم السلام نے عطا

فرمائیں ہیں، یہ ہمارے Ions جنریٹر ہیں، ان اعمال سے وہ برقی لہریں ایجاد ہوتی ہیں جو نہ تربیلا، نہ منگلا، نہ وارسک ڈیم دے سکتے ہیں۔

حوزہ علمیہ قُم سے ایسی شعاعیں ملتی ہیں ایسی طاقت اور انرجی فراہم ہوتی ہے جس سے ان ارض و سماء پر نورانیت، حقانیت، پاکیزگی وطہارت، عدالت و فقہ پھیلتے ہیں۔

خمینی نے سسٹم کا اگنیشن اسٹارٹ کر دیا ہے کہ صاحب (صاحب الزمان عج) تیار ہو کر آنے والے ہیں۔

اس سرد وخشک شبِ زمانہ میں خمینی نے فجر کی اذآن دے کر صف اوّل تیار کر دی ہے، بس امام کو پہنچ کر تکبیر کہنا رہ گیا ہے۔

مگر ابھی کوئی وضو / غسل کر رہا ہے (خود کو پاک کرنے میں لگا ہے)، اور بہت سے ابھی غفلت کی نیند میں ہی پڑے سو رہے ہیں۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ سر و سامان بھی زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ اِن لوگوں کو آزمائیں اِن میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ (سورہ کہف /7)

نماز جماعت فضیلت کے وقت سے آگے نہیں نکلے گی اور جو وقت پر پہنچ سکا وہ ساتھ ہو گا باقی قضاء ادا کریں گے۔

تیاری کیسے کرنا ہے؟؟

اس وقت کی تیاری کیلئے میری نظر میں جیسے کہ جدید دور کی ہنر مندیوں کے ساتھ ایمان رکھنے کے باعث اذیتوں اور مشقتوں پر صبر کرنا، سستی اور کاہلی سے بچتے ہوئے استقامت پیدا کرنا، اپنے اہل یقین بھائیوں کی روحانی اور مادّی مدد اور استعانت جیسے اخلاق شامل ہیں۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

خبردار سستی نہ کرنا۔ مصائب پر غمزدہ نہ ہونا اگر تم اللہ کے سسٹم پر یقین رکھتے ہو تو کامیابی تمھارے ہی لئے ہے۔

(سورہ آل عمران /139)

روزمرّہ کے کام (عبادت، تعلیم، روزگار، صلہ رحمی، تفریحات) تو ویسے ہی چلتے رہنے چاہیے ہیں بس ان کاموں میں صبر اور حلم اور برداشت انتہائی اہم ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

یقیناتم اپنے اموال اور چاہنے والوں کے ذریعہ آزمائے جاؤگے اور جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئ ہے اور جو مشرک ہوگئے ہیں سب کی طرف سے بہت اذیت ناک باتیں سنوگے۔ اب اگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے تو یہی امور میں استحکام کا سبب ہے۔(سورہ آل عمران /186)

صبر و حلم خواہ لاشعوری طور پر ایمان والوں کی طرف سے دینے والی اذیتوں پر ہو یا فطرت کے خالق کو نہ ماننے والوں کی طرف سے ہو۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔(سورہ بقرہ /214)

اہل یقین بھائیوں کی مدد بھی ضروری ہے جو مشکلات میں ایک دوسرے کے مدد گار ہوتے ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ

جو لوگ کفر والے ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے مدد گار ہیں اور اگر تم ایمان والوں کی مدد نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور عظیم فساد برپا ہو جائے گا۔(سورہ انفال /73)

غصّہ اور سختی سے بھی بچنا ضروری ہے کیونکہ یہ عقلوں کو فاسد اور امور کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

جو راحت اور سختی ہر حال میں انفاق کرتے ہیں اور غصّہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔(سورہ آل عمران / 134)

موجودہ زمانے کے مصائب اور دشمنوں، منافقوں اور فاسقوں کی طرف سے پیدا کئے گئے فتنوں سے بچنے کیلئے مندرذیل دعا یقینا مفید ہو سکتی ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۚ أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ

پروردگار! ہم جو کچھ بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے اس کا ہم سے مواخذہ نہ کرنا. خدایا ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا پہلے والی امتوں پر ڈالا گیا ہے پروردگار! ہم پر وہ بار نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو. ہمیں معاف کر دینا ہمیں بخش دینا، ہم پر رحم کرنا تو ہمارا مولا اور مالک ہے اب کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔ (سورہ بقرہ /286)

زندان سے رہائی

انسانی وجود دو(2) جواہر سے مرکب ہے۔ روح اور جسم

روح دو زندانوں میں قید ہے ایک دماغی ہے ایک قلبی

دماغی زندان نادانی اور

قلبی زندان شہوت، غضب، پرخُوری اور پرشکمی

پر مشتمل ہے۔

جسم کے بھی زندان ہیں جسے خود زندان یا جیل کہتے ہیں۔

سب سے اہم زندان روحانی زندان ہے، جس سے نکل کر انسان مادّی زندان سے بھی آزاد ہوسکتا ہے۔

روحانی زندان میں دماغی زندان یعنی نادانی سے عقل و علم کے ذریعے نکل سکتا ہے۔ یہ نادانی سائنس و ٹیکنالوجی کے علم سے دور ہوسکتی ہے، معاشرے اور سماجی زندانوں سے رہائی تاریخ، نفسیات اور دیگر سماجی و عمرانی علوم کے حصول سے دور سکتی ہے۔

جسمانی زندان کا سب سے بڑا مصداق انسان کی شرم گاہ اور پیٹ ہے اور اس زندان سے انسان شادی اور محنت و مشقت کے ذریعے نکل سکتا ہے۔ البتہ اس زندان سے آزادی کیلئے روحانی آزادی بھی ضروری ہے ورنہ تدبر و علم کے بغیر شادی اور محنت مشقت وبال جان بن جاتی ہے۔

اور سب بڑا زندان جس میں انسان اپنی انا اور خود پسندی کے باعث ہمیشہ پھنسا رہتا ہے یہ غلامی خود سے برتر ہستی سے عشق کے ذریعے دور ہو سکتی ہے۔ اس کیلئے زمانے کے حوادث و پریشانیاں انسان کے خود پسندی کے زندان کو توڑ دیتی ہیں اور انسان حق و حقیقت سے قریب ہو کر محبوب العشاق کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

علم اور عشق کا مجموعہ انسان کو ہر طرح کی ابلیسیت اور شیطنت سے دور کر کے آفاقی وجود بخشتا ہے۔

قانون پروری یا اقرباء پروری

کوئی بھی موجد کوئی شے ایجاد کرتا ہے یا تخلیق کرتا ہے تو اس کے استعمال کے اصول و قوانین بھی وہی بتاتا ہے، ایسا نہیں ہو سکتا کہ چیز بنائے کوئی اور اس چیز کے استعمال کے طریقے، قانون اور اصول کوئی اور بنائے۔

روزمرہ کی مثالیں موجود ہیں، کمپیوٹر، موبائل وغیرہ اس کے ساتھ کتابچہ بھی اسی کمپنی نے بنایا ہوتا ہے جس میں استعمال کے طریقے ہوں۔ جو بھی ان اصولوں اور قوانین کی پیروی نہیں کرتا اور اپنے من پسند طریقے سے اسے استعمال کرتا ہو تو وہ اگر تکے میں صحیح ہوئے تو شے چلتی رہے گی ورنہ اکثر ایسا ہوتا نہیں اور شے اپنے اصل فائدے دینے سے محروم ہو جاتی ہے اور خراب ہو جاتی ہے،

بنانے والے نے چیز کو استعمال کا جو سسٹم بنایا ہے اگر اس کے خلاف چلیں تو کبھی فائیدہ نہیں ہوتا۔۔۔ اپ ٹریلینر ہوں اور ملین ڈالر کی لیفٹ ہینڈ ڈرائیو گاڑی خریدیں۔۔۔تو وہ چلے گی لیفٹ ہینڈ پر بیٹھ کر ہی۔۔۔ اگر آپ کہیں کہ میں تو اس دنیا کا سب سے پاور فل آدمی ہوں میں تو رائٹ پر بیٹھ کر چلاؤں گا۔۔۔ مگر گاڑی چلے گی تو لیفٹ پر ہی بیٹھ کر۔۔۔یہ اس گاڑی کا سسٹم ہے قانون ہے جو بنانے والے نے بنایا ہے۔۔۔

اب اس خود خواہی کے ساتھ استعمال میں خواہ اس موجد کے والدین یا اولاد یا بیوی ہو۔ چیز خراب ہو جاتی ہے یا کام نہیں کرے گی۔ کیونکہ آپ کتنی بھی بڑی چیز ہوں۔۔۔ اس شے کے چلنے کا جو سسٹم ہے اسی چلانا ہو گا۔

تاریخی واقعات، موجودہ زمانے کے حالات و واقعات میں ایک قانون فطرت یعنی قانون خداوندی ہے اور ایک ریاستوں کے قانون ہیں۔۔۔ لہذا قوانین کی تعمیل نہ کرنے ایک نتیجہ محدود ہے یعنی ریاستی قوانین پر عمل نہ کرنے کا اور ایک لا محدود ہے یعنی قوانین خداوندی کی تعمیل نہ کرنے کا۔

جس طرح ریاست کے قوانین ہر شعبے میں موجود ہوتے ہیں اسی طرح قوانین خداوندی بھی انسان اور اس سے ملحق ہر شعبے میں موجود ہیں۔

ریاست کے محدود اثرات کے حامل قوانین اقرباء پروری کی نظر ہوجائیں تو ایک محدود زمانے تک تو فائدہ دیتے ہیں مگر اگر احکام خداوندی کو نظر انداز کیا جائے اور اقرباء پروری کی جائے اور ان پر عمل نہ کیا جائے تو ہمیشہ کی ناکامی اور ذلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے تاوقتیکہ انسان واقعی اور حقیقی توبہ کرے اور دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے نیز اس غلطی و گناہ کا ازالہ بھی کرے۔

آج مسلمانوں کی دنیا میں جو ذلت و رسوائی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ میرٹ کا خیال نہیں رکھا گیا اور میرٹ صرف و صرف قانون الٰہی کی پیروی ہے۔ نااہلوں کو مناصب و دستار سے نوازنا اس میرٹ کے قتل اور پھر امت کی تباہی کی صورت میں آج سب کے سامنے ہے۔

ذرا زیر نظر آیات کو غور سے پڑھیں اور سمجھیں:

اور نوح نے اپنے پرور دگار کو پکارا کہ پرور دگار میرا فرزند میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ اہل کو بچانے کا برحق ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ارشاد ہوا کہ نوح یہ تمہارے اہل سے نہیں ہے یہ عملِ غیر صالح ہے لہذا مجھ سے اس چیز کے بارے میں سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے - میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تمہارا اشمار جاہلوں میں نہ ہو جائے۔(قرآن کریم-11:45)

خدا نے کفر اختیار کرنے والوں کے لئے زوجہ نوح اور زوجہ لوط کی مثال بیان کی ہے کہ یہ دونوں ہمارے نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں لیکن ان سے خیانت کی تو اس زوجیت نے خدا کی بار گاہ میں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم بھی تمام جہنمّ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔(قرآن کریم-66:10)

خداوند کریم کی بار گاہ میں صرف اس کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت ہی سے کامیابی ملتی ہے، اور اقرباء پروری نہیں چلتی۔۔۔جو بھی قوانین خداوندی کی پیروی کرتا ہے اسی کی نجات ہے اور وہی صاحب عزت ہے۔جب بحوالہٗ آیات قرآن اقربا کا یہ حال ہے تو دوستوں اور یاروں کو کس نجات کی کشتی میں بٹھائیں گے ؟!!

دینی حکومت یا بے دین حکومت

سیاست کا شعبہ ایسے ہی اہم ہے جیسے معیشت کا۔۔۔

جب مذہب معاشی اخلاق سکھا سکتا ہے تو سیاسی کیوں نہیں۔۔۔؟!!!

البتہ سیاست معیشت کو کنٹرول کرتی ہے لہذا معیشت میں مذہب مخل ہو یا نا ہو سیاست میں تو واجب ہے۔ اگر حکمران پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ با اخلاق نہیں ہو گا تو پھر تو ساری گنگا الٹی بہنے کا خدشہ ہے اور ہم دیکھ بھی رہے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے۔

دانشور, فلسفی اور سرمایہ دار اگر دین دار, پرہیز گار, متقی نہیں ہوتا تو صرف علم و صنعت و کاروبار میں ہی دونمبری نہیں کرتا بلکہ اگر سیاست و حکومت میں آجائے تو پورا معاشرہ بد دیانت، جھوٹا، فریبی، سود خور ،زناکار، تعصبی اور فسادی بن جاتا ہے۔

مذہب اگر اخلاقیات (عدل و عدالت, ہم آہنگی رواداری, دیانتداری,صداقت) کو پروان نہ چڑھائے تو وہ مذہب نہیں۔۔۔۔

خدا پر ایمان, آخرت کی طلب, حساب کتاب کا شعور انسان کے نیک اور با اخلاق اور پر عزم و ہمت بننے میں بنیادی کردار رکھتا ہے۔

لہذا حکمران کو متقی پرہیز گار ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے۔۔۔

معاشرے میں جو سب سے زیادہ با صلاحیت ,پڑھا لکھا, دانشمند اور متقی پرہیز گار ہو اسے حاکم ہونا چاہیے۔

ہمارے سسٹم میں مساجد ضرار اور مولانا کے لباسوں میں موجود دھوکے باز نفس پرستوں، شہوت پرستوں، بدکرداروں کے باعث دین اور دینی حکومت سے تنفر پیدا ہوا ہے۔

ہم بے عقلی کے رویے کے تحت حق کو حق کے دعوے داروں سے پہچانتے ہیں جو کہ اس طرح غلط ہے جیسے کوئی نقلی ہیرے کو اصلی ہیرے کا معیار سمجھے۔

امام علی ع نے فرمایا دین حق کو پہچانو تو حقیقی دین دار اور جھوٹے دعوے داروں کو بھی پہچان لو گے۔

دینی حکومت کے تاریخی تجربوں کی روشنی میں ایسے دودھ کے جلوں کو چھاچھ پھونکنے میں کاہلی نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ دودھ طاقت کا بنیادی وسیلہ ہے۔ چھاچھ پھونکنے کی کاہلی میں دودھ نہ چھوڑیں۔

ماضی میں بھی دینی حکومت کی اہلیت رکھنے والوں کی جگہ دنیا پرست، نفس پرست افراد نے لی جس کے باعث آج کے دور میں عالم بشریت دینی حکومت سے بد ظن ہوا۔ آج بھی اہل دانش + پرہیز گار دینی علماء موجود ہیں۔۔۔ مگر آج بھی دین کا لبادہ اوڑھ کر ابلیس مظلوموں کو ان کی فلاح سے دور کر رہا ہے۔ اور پرہیز گاروں کے خلاف پروپیگنڈہ شد و مد سے جاری ہے۔ اور ہم گدھے گھوڑے ایک ساتھ ہانک دیتے ہیں بجائے کھرے کھوٹے کی پہچان کیے۔۔۔ کھانے میں پتھر آجائے تو پورا کھانا نہیں پھینکا جاتا۔۔۔۔

دین اور بے دین کے اور حکومت کے اہل و نااہل افراد میں تمیز کی جانی چاہیے۔۔۔ اگر دیندار معاشرتی مسائل حل نہیں کر سکتے تو پھر سرمایہ دار دانشور بغیر خوف خدا بنا تقوے و پریز گاری فساد در فساد ہی پیدا کرے گا۔

اصل دین داروں اور منافقوں میں فرق کرکے ہم حکمرانی کی اہم ذمہ داری فطرت کے قوانین سے آگاہ پرہیزگاروں کو دے کر ہر طرح کے فساد و کرپشن سے نکلنے کی بھرپور کوشش کرنے لائق ہوسکتے ہیں۔ ان شاء اللہ

عزاداری کیوں عبادت ہے؟!

کربلا میں امام حُسینؑ کا دوٹوک موقف جس ظلم کے خلاف تھا وہ خداوند تعالیٰ، اس کے دین اور اس کے بندوں پر اشرافیہ کے ظلم کے خلا تھا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے بے دین حکمرانوں کی اصلاح مقصد تھا۔

وہ دین جو انسان کو سعادت وخوشبختی یعنی دنیا کو آخرت کی کھیتی کے طور پر دونوں جہانوں کیلئے فائدہ مند ثابت ہو، جو انسانی معاشرے میں عدل و استحکام کیلئے فطرت کے ماتحت قوانینِ خداوندی کے ذریعے حیات جاودانی کی طرف رغبت دلاتا ہے، ان فراموش شدہ تعلیماتِ محمدیہ کا احیاء مقصد تھا۔

لہذا امام حسینؑ کا قتل دراصل دنیاوی لذتوں کے اسیروں کی دینِ خدا اور شریعت محمدی کے قتل و نابودی کی سازش سے مربوط ہے۔ اسی سبب ہر مسلمان یا جو بھی اللہ تعالیٰ، رسول اور اسلام و قرآن اور حق پرستی سے محبت کے دعوے کرتا ہے اس پر واجب ہے کہ عزاداری امام حسینؑ برپا کرے کیونکہ یہ مجالس وہ secret codes ہیں جو انسان کی دنیاو آخرت دونوں کی فلاح کے ضامن ہیں۔

خصوصا دنیا پرست گمراہ یہودیوں کی اسلام کے خلاف سازشوں سے جہاد کیلئے تیار کیے جانے والے مجاہدین کی درس گاہیں ہیں۔

امت محمدیہ کی اصلاح ہر علم رکھنے والے مسلمان پر فرض ہے۔ ان مجالس کو مثبت کاموں کی ترغیب (امر بالمعروف) اور منفیات سے دوری کی ترغیب (نہی عن المنکر) کا مرکز ہونا چاہیے۔ یہاں صرف رسم پرستی اور روایت پسندی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ظہور حضرت مہدیؑعج کیلئے یعنی عالمی اسلامی حکومت و نظام کے قیام کیلئے انسانوں کو تیار کرنا ایسے کہ دین ان انسانوں کی آکسیجن بحال کرے اور وہ مضر فضاء و ماحول سے دور ہو جائیں، افضل ترین عبادت ہے۔

لہذا شہادتِ معصومینؑ پر عزاداری چونکہ ذکر خدا، رسول، اسلام و قرآن کی سربلندی کیلئے ابتدائی مرحلہ ہے اور مقدمہ ہے اسی لئے اس کو عبادت کہا گیا ہے، یہ عزاداری قرآن و تعلیماتِ اسلامی کو ڈی کوڈ کرنے والی درسگاہیں ہیں، جہاں تدبر و تفکر کے ذریعے دینی اصل یعنی امامت کے قیام کے مراحل ڈی کوڈ کیے جاتے ہیں۔ یہاں ہر مظلوم اور کمزور کے حقوق کا نظریاتی دفاع، دشمن شناسی اور دشمن پر غلبہ پانے کی اسٹریٹیجی کو بیان کرنا ضروری ہے۔ یہ وہی اسٹریٹیجی ہے جس کے خود تمام معصومینؑ اپنی زندگیوں میں بھی عمل پیرا رہے اور اس عمل کے باعث ان کی شہادتیں رونما ہوئیں۔ یہ شہادتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ائمہ معصومینؑ اپنی جانوں سے زیادہ اسلام کی اسٹریٹیجی کو اہم سمجھتے تھے۔

چونکہ سیاسی امور سماج کے انتظام اور نظم و ضبط سے وابستہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے امامت کا شعبہ جس کا کام دینی بنیادوں پر انسانی سماج کا انتظام و نظم برقرار کرنا ہوتا ہے۔ اسلام میں اس کے قیام کیلئے کوششیں سب سے اہم عبادت ہے۔ اس شعبے کے قائم کیے بغیر دین سماجی اور عملی زندگیوں میں اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتا۔ امامت کے فوائد اور اس کے مقابلے پر کسی

بھی سسٹم کی تباہ کاریاں آج تقریباً ہر شخص پر واضح ہو رہی ہے اور سب احساس کر رہے ہیں کہ وہ سب پھنس چکے ہیں۔۔۔ کیسے نکلنا ہے اس trap اور غلامی سے۔۔۔ اس کیلئے عزاداری کو decode کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی عادلانہ نظام اور حکومت کے قیام کیلئے امام حسینؑ کی جدوجہد رہی کہ غیر عادلانہ، غیر فطری انسان کے حقوق اور انسانی ضروریات کو پورا نہ کرنے والی حکومت کو اکھاڑ پھینکیں اور نظام امامت کو قائم کریں۔

عظیم شاعر جوش ملیح آبادی نے اسی وجہ سے فرمایا: دنیا کو بیدار تو ہو لینے دو، ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

خداوند تعالیٰ ہم سب انسانوں کو ظلم و ناانصافی کے خلاف حقیقی مجاہد قرار دے، علم و دانش اور بھرپور جدوجہد سے اس علم و دانش پر عمل کرنے والا نہ تھکنے والا مجاہد قرار دے۔ آمین یارب العالمین

مادّی انقلاب کے مضر اثرات

صنعتی انقلاب انسانی تاریخ کے اہم واقعات میں سے ایک ہے اور اس نے پوری دنیا کی کئی قوموں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ جبکہ صنعتی انقلاب پہلی بار 18 ویں صدی میں برطانیہ میں شروع ہوا، اور اس کے بعد آنے والی صدیوں میں ہوا، اس کے اثرات آج بھی ہماری زندگیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک واقعہ کے طور پر، صنعتی انقلاب نے معاشرے پر مثبت اور منفی دونوں اثرات مرتب کیے۔

اگرچہ صنعتی انقلاب کے کئی مثبت پہلو ہیں، بہت سے منفی عناصر بھی تھے، بشمول: کام کرنے کے ناقص حالات، رہنے کے ناقص حالات، کم اجرت، چائلڈ لیبر اور آلودگی۔ صنعتی انقلاب کی بنیادی وجوہات میں سے ایک معاشی نظام کے طور پر لیسز فیئر سرمایہ داری کا ظہور تھا۔ لائیسز فیئر کیپیٹلزم ایک انتہائی انفرادیت پسندانہ نظریہ ہے جس میں حکومت کسی ملک کے معاشی فیصلوں میں ممکنہ حد تک کم کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخ دان اکثر صنعتی انقلاب کے نظریے کو کلاسیکل لبرل ازم کے طور پر حوالہ دیتے ہیں کیونکہ اس میں لیزیز فیئر سرمایہ داری کے اصول شامل تھے جبکہ اب بھی بنیادی انفرادی حقوق کی اجازت ہے۔ اس سیاسی اور معاشی آب و ہوا نے ایک ایسی صورتحال پیدا کی جس میں دولت مند فیکٹری اور کان کے مالکان محنت کش طبقے کے لوگوں کا استحصال کرنے کے قابل تھے۔ اس کے نتیجے میں، یہ صنعتی انقلاب کے لوگوں کے لیے کام کرنے کے خوفناک حالات کا باعث بنا۔ مثال

کے طور پر، چائلڈ لیبر صنعتی انقلاب کی ایک عام خصوصیت تھی جس میں چار سال کے بچے حکومت کے تحفظ کے بغیر گندے اور خطرناک حالات میں کام کر رہے تھے۔

صنعتی شہروں اور قصبوں کی ایک عام خصوصیت سستی اور ناقص تعمیر شدہ قطار ہاؤسنگ کی تعمیر تھی، جس کا مقصد محنت کش طبقے کے لوگوں کے لیے تھا۔ دولت مند فیکٹری مالکان اور کاروباری افراد نے اپنے مزدوروں کے لیے گھروں کی تعمیر کی بلکہ گھروں کو زیادہ منافع کمانے کے لیے استعمال کیا۔ گھروں کو اکثر بیک ٹو بیک ٹیرس کہا جاتا تھا کیونکہ یہ لفظی طور پر ساتھ ساتھ بنائے گئے تھے اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ گھر کا واحد حصہ جو دوسرے سے متصل نہیں تھا سامنے تھا۔ مکانات دستیاب سستے مواد سے بنائے گئے تھے اور بنیادی خصوصیات جیسے کھڑکیوں اور مناسب وینٹیلیشن کا فقدان تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ، زیادہ تر گھر بغیر پانی کے چلنے یا صفائی کے بنائے گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں، بہت سے لوگ مناسب طریقے سے نہانے سے قاصر تھے اور اس طرح وہ انتہائی ناقص حفظان صحت سے دوچار تھے۔

آلودگی صنعتی شہروں اور قصبوں کا سب سے زیادہ پہچانا جانے والا پہلو تھا۔ نہ صرف سڑکیں اور آبی گزر گاہیں انسانی فضلے اور کچرے سے بہت زیادہ آلودہ تھیں بلکہ ہوا بھی بہت زیادہ آلودہ تھی۔ 18 ویں اور 19 ویں صدی کے دوران، امیر تاجروں نے پورے برطانیہ میں بے شمار کارخانے اور کانیں قائم کیں۔ یہ فیکٹریاں کوئلے کے جلنے سے فضائی آلودگی کی بڑی مقدار پیدا کرتی ہیں۔ صنعتی انقلاب کے دوران کوئلہ آسانی سے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ایندھن تھا، کیونکہ اسے نئے تیار شدہ بھاپ انجنوں کو طاقت دینے کی ضرورت تھی۔ تاہم، کوئلے کو بھاری فضائی آلودگی کے طور پر بھی جانا جاتا ہے کیونکہ جب اسے جلایا

جاتا ہے تو یہ چھوٹے ذرات کو ہوا میں بھیجتا ہے۔ اس کے نتیجے میں، شہر کے مراکز میں متعدد کارخانوں نے ہوا کا معیار خوفناک بنا دیا اور صنعتی شہروں اور قصبوں کو ایک خاص 'سموگ' دیا جو ان پر منڈلاتا دکھائی دیا۔

صنعتی کاری نے مزدور اور سرمائے کی علیحدگی کو بھی بڑھا دیا۔ وہ لوگ جو پیداوار کے ذرائع کے مالک تھے غیر متناسب امیر بن گئے، جس کے نتیجے میں وسیع تر آمدنی میں عدم مساوات پیدا ہوئی۔ صنعت کاری نے معاشرے کو دوسرے طریقوں سے متاثر کیا۔ مزدوروں کو اپنے خاندانوں کو چھوڑنے اور ملازمتوں کی تلاش میں شہری علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ انہوں نے طویل عرصے تک کام کیا، ناقص طور پر پرورش پائی اور بھیڑ کی حالت میں رہتے تھے، جس کی وجہ سے بیماری اور تناؤ پیدا ہوا۔

صنعتی کاری کا ایک منفی ضمنی پیداوار ماحولیاتی آلودگی ہے جو انسانی صحت پر منفی اثر ڈال سکتی ہے۔ جب کمپنیاں اپنے ماحولیاتی نقصانات کی ادائیگی نہیں کرتی ہیں، یا جب ان نقصانات کو قیمتوں میں نہیں لیا جاتا ہے تو، یہ ایک منفی خارجی تصور کیا جاتا ہے۔ اخراجات کا بوجھ انسانی معاشرے پر جنگلات کی کٹائی، پرجاتیوں کی ناپیدگی، بڑے پیمانے پر آلودگی، ضرورت سے زیادہ فضلہ اور ماحولیاتی انحطاط کی دیگر اقسام کی صورت میں ڈالا جاتا ہے۔

صنعتی کاری کے نتیجے میں مزدور اور سرمائے کی تقسیم کی وجہ سے امیر اور غریب کے درمیان وسیع فرق پیدا ہوتا ہے۔ جو لوگ سرمائے کے مالک ہوتے ہیں وہ اپنی معاشی سرگرمیوں سے حاصل ہونے والے ضرورت سے زیادہ منافع جمع کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں آمدنی اور دولت میں زیادہ فرق ہوتا ہے۔

صنعتی کاری عام طور پر مزدوروں کی شہروں میں منتقلی، آٹومیشن اور تکراری کاموں کا باعث بنتی ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے ، فیکٹری ورکرز اپنی انفرادیت کھو دیتے ہیں، ملازمت کا محدود اطمینان رکھتے ہیں اور اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ کام کے خطرناک حالات یا کام کرنے کے حالات سے متعلق عوامل جیسے شور اور گندگی سے صحت کے مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔

صنعتی کاری کی وجہ سے تیزی سے شہریت عام طور پر مزدوروں کے معیار زندگی کی خرابی اور معاشرے کے لیے بہت سے دیگر مسائل جیسے جرائم، تناؤ اور نفسیاتی عوارض کا باعث بنتی ہے۔ طویل کام کے اوقات عام طور پر ناقص غذائیت اور تیز اور کم معیار کے کھانے کی کھپت کا باعث بنتے ہیں، جس کے نتیجے میں ذیابیطس، ہارٹ اٹیک اور فالج جیسی بیماریوں کے واقعات میں اضافہ ہوتا ہے۔
بہتر اجرت کے وعدے نے تارکین وطن کو ان شہروں اور صنعتی قصبوں کی طرف راغب کیا جو انہیں سنبھالنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اگرچہ بہت سے علاقوں میں مکانات کی ابتدائی قلت نے بالآخر تعمیراتی عروج اور جدید عمارتوں کی ترقی کی راہ ہموار کر دی، شیک ٹاؤنز سے بنے شیک ٹاؤنز اور ناقص معیار کی رہائش کی دوسری اقسام پہلے ظاہر ہوئی۔ مقامی سیوریج اور صفائی کے نظام لوگوں کی اچانک آمد سے مغلوب ہو گئے تھے اور پینے کا پانی اکثر آلودہ رہتا تھا۔ اس طرح کے قربت میں رہنے والے، کام کرنے کے ناقص حالات سے تنگ آکر، اور غیر محفوظ پانی پینے سے ٹائفس، ہیضہ، چیچک، تپ دق اور دیگر متعدی بیماریوں کے پھیلنے کے لیے مثالی حالات پیش آئے۔ شہری علاقوں میں ان اور دیگر بیماریوں کے علاج کی

ضرورت نے طبی ترقی کو فروغ دیا اور بہت سے صنعتی شہروں میں جدید بلڈنگ کوڈز، صحت کے قوانین اور شہری منصوبہ بندی کی ترقی کو فروغ دیا۔

جیسا کہ زیادہ سستے لیبر بچانے والے آلات دستیاب ہوتے ہیں، لوگوں نے کم سخت جسمانی سرگرمی کی۔ جبکہ زراعت سے متعلقہ محنت کو بہت آسان بنادیا گیا، اور بہت سے معاملات میں جانوروں کی طاقت اور انسانی طاقت کو ٹریکٹروں اور دیگر مخصوص گاڑیوں سے بدل کر مٹی اور پودے لگانے اور فصلوں کی کٹائی تک، دوسری گاڑیاں، جیسے ٹرینیں اور آٹوموبائل ، صحت مند ورزش کی مقدار کو مؤثر طریقے سے کم کیا جو لوگ ہر روز کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ، بہت سے پیشوں کے لیے جنہیں بڑی مقدار میں جسمانی مشقت کی ضرورت ہوتی تھی ان کی جگہ اندرونی دفتری کام نے لے لی، جو اکثر بیہودہ ہوتا ہے۔ اس طرح کے بیہودہ رویے کام سے دور ہوتے ہیں، کیونکہ ٹیلی ویژن پروگرام اور غیر فعال تفریح کی دیگر اقسام تفریحی وقت پر حاوی ہوتی ہیں۔ اس میں شامل یہ حقیقت ہے کہ بہت سے لوگ کھانا کھاتے ہیں جو نمک اور چینی کے ساتھ پروسیس کیا گیا ہے تاکہ اس کے تحفظ میں مدد ملے، کھانا پکانے کا وقت کم ہو اور اس کی مٹھاس میں اضافہ ہو۔ ایک ساتھ، طرز زندگی کے ان رجحانات نے موٹاپے سے وابستہ طرز زندگی سے متعلقہ بیماریوں میں اضافہ کیا ہے، جیسے دل کی بیماری، ذیابیطس اور کینسر کی کچھ شکلیں۔

مجموعی مثبت کردار اور قلیل منفیات

ہم سب غلطیوں کے پتلے تو نہیں البتہ غلطیاں ہم سب سے ہوتی ہیں، معصومین علیہ السلام منتخب ہو چکے ہیں، لہذا کسی کو خطا سے مبرا سمجھنا خود خطا ہے۔۔۔۔ انسان اگر اپنی خواہشات اور آسائشیں چھوڑ کر دنیا کے مسائل کے حل کیلئے بنیادی نوعیت کے کاموں میں لگا ہے تو باقی غلطیاں قابل معافی ہیں۔ اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔۔۔۔ امید خدا سے ہوتی ہے۔۔۔۔ پرفیکٹ تو کوئی بھی نہیں۔۔۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم خود یا سامنے والا اپنی ہمت سے زیادہ کوشش کر رہا ہے اور پھر بھی مسائل حل نہیں ہو رہے ہیں تو خدا پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور خود کو بھی معاف کر دینا چاہیے اور دوسروں کو بھی، کم از کم نظر انداز کرنا ضروری ہے۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں: لوگوں میں بہر حال کمزوریاں پائی جاتی ہیں اور ان کی پردہ پوشی کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ خبردار جو عیب ہمارے سامنے نہیں اس کا انکشاف نہ کریں۔ ہماری ذمہ داری صرف عیبوں کی اصلاح کر دینا ہے اور غائبات کا فیصلہ کرنے والا پروردگار ہے، جہاں تک ممکن ہو لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی کریں۔ لوگوں کی طرف سے کینہ کی ہر گرہ کھول دو اور دشمنی کی ہر رسی کو کاٹ دو اور جو بات تمہارے لئے واضح نہ ہو تو اس سے

انجان بن جاؤ اور ہر چغل خور کی تصدیق میں عجلت سے کام نہ لو کیونکہ چغل خور ہمیشہ خیانت کار ہوتا ہے چاہے وہ مخلصین ہی کے بھیس میں کیوں نہ آئے۔(نہج البلاغہ -خط نمبر 53)

بیشک آپ کا پروردگار ان کے لئے بہت وسیع مغفرت والا ہے وہ اس وقت بھی تم سب کے حالات سے خوب واقف تھا جب اس نے تمہیں خاک (جیسی پست چیز) سے پیدا کیا تھا اور اس وقت بھی جب تم ماں کے شکم میں جنین کی منزل میں تھے لہذا اپنے نفس کو زیادہ پاکیزہ (خود کو صحیح اور حقدار) قرار نہ دووہ متقی (صحیح اور حقدار) افراد کو خوب پہچانتا ہے۔(سورہ نجم-32)

۔۔۔ اس اصلاحی جدوجہد کے دوران دعاوتوسل بھی بہت ضروری ہے۔۔۔۔ تعمیری کاموں کا نتیجہ یک دم نہیں آتا۔۔۔۔ یہ دنیا ٹیسٹ کی جگہ ہے کہ کون کتنی کوشش کرتا ہے اور کوشش کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے۔۔۔ یہ دنیا پرفیکٹ آؤٹ کم لینے کی جگہ نہیں۔۔۔ یہاں پر جو بھی پرفیکٹ زندگی کا خواہاں ہوتا ہے اس کی پریشانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔۔۔۔ اس دنیا میں اطمینان کا خواہاں ہونے کے مطلب یہ ہونا چاہیے کہ یعنی یہ کہ ہم درست راہ پر ہیں نیز ہمارا ہدف بھی درست ہے۔۔۔۔ اور درست و حق کی راہ پر مشکلات ہوتی ہیں، پریشانیاں ہوتی ہیں، مصائب ہوتے ہیں اور یہ خدا کی طرف سے built-in ہیں۔ تاکہ خدا اس کے ذریعے اپنے بندوں کی purity خالصیت کو ابھارنا چاہتا ہے۔ تاکہ یہ بندے ترقی کے لائق بن سکیں۔

اور ہم یقیناتم سب کا امتحان لیں گے تا کہ یہ دیکھیں کہ تم میں سخت ترین جدوجہد کرنے والے اور صبر کرنے والے کون لوگ ہیں اور اس طرح تمہارے حالات کو باقاعدہ جانچ لیں۔(سورہ محمد /31)

۔۔ رونے واویلا کرنے والے لوگوں کیلئے ترقی میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔۔۔۔ یہ دنیا کا قانون ہے۔۔۔ کہ جو مصائب پر صبر کرتا ہے اپنے عالی ہدف کے ذیل میں درست راہ پر ہوتا ہے اور مشکلات و مصائب برداشت کرتا ہے۔۔۔۔ تو قانون یہ ہے کہ اسی کو ترقی نصیب ہوتی ہے، اسی کو پاور ملتی ہے۔

خبر دار سستی نہ کرنا. مصائب پر غم زدہ نہ ہونا اگر تم صاحب یقین ہو (اور حق پر ہو) تو سر بلندی تمہارے ہی لئے ہے۔(سورہ آل عمران -139)

جنت بھی آرام دہ بستروں، اے سی کمروں میں رہنے سے نہیں بلکہ جدوجہد کے ساتھ، عرق ریزی کے ساتھ، زخموں، جھٹکوں اور مصائب اور سختیوں کے بعد ملتی ہے۔۔۔ آپ دیکھ لیں تاریخ میں روشن چہرے انہی کے نظر آتے ہیں جو سخت جدوجہد اور مشکلات و سختیوں کو برادشت کرتے ہیں۔

کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤگے حالانکہ ابھی تک تمہارے سامنے تم سے پہلے گزرے ہوئے (اہل ایمان) کی سی صورتیں (اور شکلیں) آئی ہی نہیں۔ جنہیں فقر وفاقہ اور سختیوں نے گھیر لیا تھا۔ اور انہیں) تکلیف و مصائب کے) اس قدر جھٹکے

دیئے گئے کہ خود رسول اور ان پر ایمان لانے والے کہہ اٹھے کہ آخر اللہ کی مدد کب آئے گی؟ آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی مدد یقینا نزدیک ہی ہے۔(سورہ بقرہ /14)

جب تک کرپٹ سسٹم دنیا پر حاکم ہے عائلی و گھریلو زندگیاں بھی اطمینان بخش نہیں ہو سکتیں۔عالمی کرپٹ سیاسی اور معاشی سسٹم کو دور کرنے کا واحد حل مرحلہ بہ مرحلہ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے، جبکہ خود موجودہ تعلیمی سسٹم بھی کرپشن کا گڑھ ہے لہذا نعم البدل فکری اور علمی مواد حد استطاعت تک متوازی لے لیکر چلنا ہماری مجبوری ہے۔۔۔لہذا ہمیں سسٹم کو replace کرنے کیلئے جدوجہد جاری رکھنی ہو گی۔۔۔۔ اور خصوصا وہ لوگ جو اپنی چھوٹی چھوٹی مشکلات پر پریشان ہو جاتے ہیں انہیں یہ باور کرنا ہو گا اور دوسروں کو بھی باور کرانا ہو گا جب تک موجودہ کرپٹ سسٹم replace نہیں ہو جاتا یہ robotic اور مشینی زندگی ہمارا جینا حرام کیے رکھے گی اور شدید جدوجہد کے باوجود بھی معاشی مسائل ہماری نفسیاتی، سماجی اور گھریلو زندگیوں کو متاثر کرتے رہیں گے اور ہم سب کولہو کے بیل کی طرح عبث اور ناکارہ زندگیاں گذار کر مٹی تلے چلے جائیں گے۔۔۔۔ بھائیوں، بہنوں کے آپسی مسائل، اولاد و والدین کے آپسی مسائل، زوجین کے آپسی مسائل، پڑوسیوں و رشتہ داروں کے ساتھ مسائل، دوستوں کے ساتھ مسائل، دفتری ساتھیوں یا مینیجرز کے ساتھ مسائل وغیرہ ہمیں اس فکر کے ساتھ نظر انداز کرنے چاہییں یا ان پر ردعمل ایسا دینا چاہیے کہ ظاہر ہو، موجودہ عالم میں ہر طرف کرپشن ہے، فساد ہے اور عالمی معاشرہ اپنے قدرتی نظام سے ہٹا ہوا ہے۔ جب ہم یہ فکر رکھیں گے تب ہی ہم اس کے نعم البدل سسٹم و نظام کیلئے جدوجہد

کریں گے اور لوگوں کی نادانستہ خطاؤں کو اس سسٹم کی وجہ قرار دے کر نظر انداز کریں گے۔

یقیناتم اپنے اموال اور نفوس کے ذریعہ آزمائے جاؤگے اور جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور جو مشرک ہوگئے ہیں سب کی طرف سے بہت اذیت ناک باتیں سنوگے - اب اگر تم صبر کروگے اور تقوٰی اختیار کروگے تو یہی امور میں استحکام کا سبب ہے۔(سورہ آل عمران /186)

جب تک الٰہی امامت کا سسٹم نہیں آجاتا دنیا سے مسائل ختم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی جائیں گے اور بڑھتے جارہے ہیں۔ جس کی سب سے بنیادی وجہ اچھے اور درست لوگوں کا ہمت ہار جانا، باطل کے زرق برق کی طرف نقل مکانی کر جانا ہے یاہدف کو ترک کر دینا ہے۔۔۔ یہ حرکات وقتی سکون تو دے دیتی ہیں مگر ظالم کی قوت میں اضافہ کاباعث ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے مسائل بڑھتے ہی چلے جارہے ہیں۔۔۔۔ آسائشیں، آرام طلبی، عافیت طلبی، عیش کوشی اس دنیا میں خدا کی نظر میں طاغوت ہیں۔۔۔۔ ہمیں ان کو ہدف بنانے کے بجائے وسیلے کے طور پر اختیار کرنا چاہیے اور صرف خود کیلئے نہیں بلکہ ہماری جدوجہد تمام عالم انسانیت کے اطمینان اور سکون کی خاطر ہونی چاہیے۔۔۔۔۔ تاکہ سب اطمینان و راحت کے ساتھ خدا کے دین کی خدمت کر سکیں اور اپنی عبادات امامت کے سائے میں احسن طریقے سے پوری کر سکیں۔ آج عالمی معاشرے کے جو جو بھی مسائل ہیں ان سب میں ہم انسانوں کا ہی قصور ہے لہذا اس عالمی نظام کی اصلاح کیلئے بھی ہمیں خود سے ہی شروعات کرنی

ہو نگی۔ جب تک ہم اپنی ذمہ داریاں اور دوسروں کے حقوق کیطرف سے احساس نہیں کریں گے عالمی نظام امامت کے قیام میں رکاوٹ رہے گی۔۔۔ اور جب تک امامت کا ادارہ عالم انسانیت پر قائم نہیں ہو جاتا، ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے قیام کیلئے جدوجہد کرے اور کامیابی کیلئے مصائب، پریشانیوں پر صبر کرے مگر ہدف کو ترک نہ کرے۔اس سیاسی ہدف کے لئے جدوجہد کے علاوہ ہر جدوجہد بے نتیجہ ہے اور اس میں ٹینشن ہے، اسٹریس ہے، ڈپریشن ہے، ایسی ہر جدوجہد نفسیاتی امراض کی اماج گاہ ہے وغیرہ۔۔۔ لیکن جب اس نیت کے ساتھ جدوجہد کریں گے کہ دنیا میں قیام امامت ہونا چاہیے تو اگر مر بھی گئے تو اعلیٰ روایات اور احسن طریقہ کار آئندہ نسلوں کیلئے چھوڑ جائیں گے، شہید ہوں تو بھی ثواب نہ ہوئے تو کامیاب!!۔۔۔ جو روپیہ پیسہ اور بلاد کفر کی رہائشی ہونے سے زیادہ قیمتی ہے۔ آج جدید دور کے انسانوں کا ٹیسٹ یہی ہے کہ نظام امامت کے قیام کیلئے کوششیں کرنے میں کون مشکلات، مصائب، مصیبتوں اور بلاؤں پر صبر کرتا ہے اور اپنے ہدف سے ہٹتا نہیں ہے، بلکہ اپنے ہدف کے حصول کیلئے ہر مشکل اور مصیبت کے ساتھ مزید مستحکم ہو جاتا ہے اور ہمت وطاقت میں اضافہ کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کرتا ہے اور واقعاً اگر وہ اصلاح کے قابل ہیں یا اگر موجودہ کرپٹ سسٹم کی وجہ سے برائی ہے تو اس کو نظر انداز کرتا ہے یا اگر اصلاح کے قابل نہیں ہے تو "مقصر" جان کر بھی نظر انداز کرتا ہے۔

"اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔اِن حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے، تو کہیں کہ: "ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے"۔ انہیں خوش خبری دے دو ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رَو ہیں(سورہ بقرہ 157،156،155)

تمام چھوٹے بڑے مسائل کی جڑ دنیا پر کرپٹ سسٹم کی حکمرانی ہے لہذا اس کو امامت سے replace کرنے کی جدوجہد کے بغیر نماز، روزے، حج، زیارات وغیرہ سب عبث اور بے کار ہیں اور بقول امام معصوم علیہ السلام کے منہ پر دے مارے جائیں گے۔(وسائل الشیعہ، کتاب الطہارۃ، باب 29)

ہماری خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ خدا ہم سب کو نیک نیتی کے ساتھ اس ہدف کے حصول کیلیئے جدوجہد کی مزید توفیقات عطا فرمائے اور ہم سب کو عبد خالص بنا کر اپنی جنت کا حقدار قرار دے۔

اے ہمارے رب! ہم سے بھول چوک میں جو قصور ہو جائیں، ان پر گرفت نہ کر مالک! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال، جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے پروردگار! جس بار کو اٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے، وہ ہم پر نہ رکھ، ہمارے ساتھ نرمی کر، ہم سے درگزر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہمارا مولیٰ ہے، کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔(سورہ بقرہ /286)

آمین یارب العالمین

سازشیں! افسانہ یا حقیقت!

بچوں میں کبھی آپس میں کھلونے چھین لینے پر جھگڑا ہو جاتا ہے،

کبھی بڑے بھی کسی کی کوئی چیز لیتے ہیں اور واپس کرنا بھول جاتے ہیں،

بچوں اور بڑوں میں ایسا کبھی دانستہ ہوتا ہے کبھی نادانستہ، بھول چوک میں۔۔۔

آگ میں گرمی، برف میں ٹھنڈک، وغیرہ

سب کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے، بلا سبب کوئی عمل بھی وقوع پذیر نہیں ہوتا،

کائنات کا ذرہ ذرہ جس نظم وضبط وہم آہنگی اور ایک دوسرے موجودات کی ضروریات پوری کررہاہے، تو معلوم پڑتا ہے کہ یہ سب خود بخود اور بلاوجہ نہیں ہو گیا۔۔۔

آج کے اور قدیم فلسفی اور سائنسدان بھی اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ کائنات میں کچھ امور حادثہ یا ایکسڈنٹ ہوتے ہیں!

اعمال و حرکات کے اسباب کے پیچھے جائیں تو ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ کائنات کے آغاز یعنی بگ بینگ پر رکتا ہے، اس پر بعض متعصب افراد اسے مادّے کا ارتقاء قرار دیتے ہیں اور

کسی صورت خدا کے وجود کا اظہار کرنے کیلئے آمادہ نظر نہیں آتے اور افسانہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں،

بعض مذہبی افراد بھی کچھ ایسا کہتے ہیں کہ برائی انسان خود کرتا ہے اور شیطان وغیرہ قسم کی موجودات کو مورد الزام ٹھہراتا ہے اور یہ انسان کی ذمہ داری سے فرار کا بہانہ ہے، اور شیطان ایک خیالی افسانہ ہے۔

ہر کام اور عمل و حرکت کی کوئی نہ کوئی علت، وجہ یا سبب ہوتا ہے، یہ اسباب بعض شعبوں میں قدیم تاریخی واقعات کے حامل بھی ہیں، جب کسی نے کوئی ایسا نیک یا بد عمل کیا جس کے اثرات اور نتائج آج تک انسان وصول کر رہا ہے۔

خدا پر بھی اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو دنیا میں اس کے بندے کیوں تکالیف میں مبتلا ہیں، مثلاً کیوں قدرتی آفات سے تباہیوں سے انسان متاثر ہوتے ہیں؟ کیوں خدا ایسا کرتا ہے؟ کیا وہ رحمان ورحیم نہیں ہے؟!

عالم میں آج جدید دور میں ملین افراد بھوک و بے لباسی، بیماری اور دیگر بہت سی آفات میں مبتلا ہیں، خدا ان سب کو کیوں دور نہیں کرتا؟

البتہ خدا پر ان اعتراضات کو وہی لوگ پیش کرتے ہیں جو کھاتے پیتے اور اچھے بینک بیلنس والے ہوتے ہیں اور وہ طاقتیں ہوتی ہیں جو ان تمام مصائب کی پیدائش کا اصل سبب ہیں۔ مگر یہ کیسے ثابت کریں؟

اگر ہم کسی ایسے طاقت ور گروہ یا شخص کا نام نہ بھی لیں اور یہ ثابت کرلیں کہ دنیا میں مسائل خدا کے پیدا کردہ نہیں بلکہ انسانوں میں ہی کچھ افراد کے پیدا کردہ ہیں تو ہم تحقیق کے اگلے مرحلے میں ایسے ادارے اور شخص کا نام بھی جان جائیں گے۔

بالفرض دنیا کو چلانے والا کوئی خدا نہیں۔۔۔ اور دنیا کو چلانے والے جو بھی ہیں تو ان کے پاس تو وسائل ہیں، پیسہ ہے، علم ہے دانش ہے۔ ان سے سوال کرنا چاہیے کہ آپ کے ہوتے یہ مسائل کیوں حل نہیں ہوتے؟

دنیا میں کوئی فرد یا معاشرہ یا قوم ایسی نہیں جو یہ کہے کہ ہمیں سہولیات نہیں چاہییں، یا ہم مسائل میں خوش رہتے ہیں۔لہذا یہ اعتراض کرنا کہ قومیں کاہل اور ناکارہ ہیں اور آرام طلب اور راحت طلب ہیں، اسلئے ان کے مسائل حل نہیں ہوتے، تو یہ بات بھی غلط ہے، انسانی ضروریات ایسی ہوتی ہیں کہ اسکو پورا کرنا ہر شخص کیلئے کام و محنت کرنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اور فطری ضروریات اسے کام پر اکساتی ہیں۔

چوری ڈکیتی کرنے والے بھی محنت کرتے ہیں منصوبہ بندی کرتے ہیں۔۔۔ مگر عزت کی زندگی گذارنا وہ بھی اپنے نفس میں اپنے ضمیر میں محسوس کرتے ہیں۔۔۔ لہذا کوئی تو ہے جو اس احساس کا خیال نہیں کررہا اور وسائل اور طاقت ہوتے ہوئے بھی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کررہا ہے اور بنیادی ضرورت پوری کرنے کیلئے ٹیڑھے راستے پیدا کررہا ہے۔

بچوں کے جھگڑوں میں تو بچے ایک دوسرے یا کسی تیسرے بچے پر الزام ڈال کر بچ جاتے ہیں ۔۔۔ مگر اس عالمی فساد میں یہ سرمایہ دار اور بینکار ان مسائل کو خدا پر بھی نہیں ڈال سکتے کیوں کہ اس کو تو یہ مانتے نہیں۔۔۔لہذا دوسری ایک ہی صورت بچتی ہے کہ اس تمام فساد و مسائل کا اصل سبب یہ خود ہیں۔

سازش سازش کے مالا جپنا اور خود کچھ نہ کرنا یقیناً اچھا عمل نہیں۔۔ اور یہ غیر ذمہ داری کا نمونہ ہے۔۔ مگر جب محنت کرنے والے اپنی ہڈیوں کا بھی تیل نکال چکے ہیں اور کولھو کے بیل بنے ہوئے ہیں اور پھر بھی حالات نارمل نہیں ہو رہے ہیں تو اس کے علاوہ کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کہ جس خالق نے یہ کائنات انواع و اقسام کی نعمتوں سے بھری ہے اور ہم انسانوں کو بھی ہر طرح کی استعداد و صلاحیت دی ہے اور ہم اسے استعمال بھی کر رہے ہیں اور پھر بھی مشکل و سختیاں بڑھتے ہی جا رہی ہے کم نہیں ہو رہیں تو یقینا یہ کسی انسان نما شیطان کی کارستانی ہے جس نے وسائل پر قبضہ کیا ہوا ہے اور اسمارٹ طریقے سے لوٹ رہا ہے۔

منصوبہ بند طریقے سے یہ لٹّس جاری و ساری ہے۔۔۔ اگر تو یہ سازشیں قیاسات ہیں، افسانے ہیں تو بڑی معاشی طاقتیں کیوں تیسری دنیا کے عوام کی مدد نہیں کرتیں؟ آخر کو انسانیت کا نعرہ بھی تو وہی لگاتے ہیں نا؟ عالمی امن و عدالت کی بات بھی وہی کرتے ہیں، تعلیم اور مساوات کے نعرے بھی وہی لگاتے ہیں، صحت مند دنیا کیلئے بھی بڑے بڑے بجٹ دیئے

جاتے ہیں۔ مگر کیا یہ خوش کن نعروں کے بعد واقعی وہ اعمال بھی انجام دیتے ہیں جن نعروں کی چاشنی سے یہ مظلوم اور کمزور انسان کے جذبات اپنی طرف جذب کرتے ہیں؟

یا یہ نعرے صرف نعرے ہیں جن کی عملی شکل دنیا نے کبھی نہیں دیکھی سوائے ان تعمیرات میں جہاں ان طاقتوں کے اپنے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ تقریباً ڈھائی سو تین سو سال سے دنیا میں جدیدیت کا دور دورہ ہے، اور سائنس و ایجادات کی بھرمار ہو رہی ہے، مریخ پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں اور ملین آف ڈالرز ان سب پر خرچ ایسے کیے جا رہے ہیں جیسے یہ عالمی مسائل میں سب سے زیادہ ترجیح رکھتے ہیں۔ جی ہاں یہ علمی رعب قائم کرتے ہیں، معاشی دھونس جماتے ہیں، سیاسی خوف دلاتے ہیں، ہر دوسرے مہینے کسی قوم و ملک پر فوجی دہشت گردی پھیلاتے ہیں۔ وائٹ کالر اکنامک کرائمز میں ملوث یہ افراد آج دنیا کی عوام کے بڑے دماغ میں آ چکے ہیں اور سازشوں کو افسانے کہنے والے اب ہر دوسرے کو حقیقت میں نظر آنے لگے ہیں۔ ان کی چالیں جو بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا ماریں۔۔۔۔ اس عالم انسانیت نے برداشت کیں ہیں۔

اس وقت تیسری دنیا کا ہر محنتی اور جفاکش پڑھا لکھا تعلیم یافتہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ کوئی تو ہے جو یہ فساد کا نظام چلا رہا ہے۔ جس نے اصلاحِ احوال کی دکانوں میں استحصال کیلئے کارکن بھرتی کیے ہوئے ہیں۔۔۔ بھلا کیسے ممکن ہے کہ ترقی کے تمام گُر آزما لینے کے باوجود بھی جب حالات بہتر نہ ہو رہے ہوں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ یا تو خدا نہیں ہے یا پھر ہماری کم ہمتی، بے حرّیتی ہے جس کے سبب کوئی شیطان اس دنیا پر چڑھا ہوا ہے۔ یقینا اس

شیطانی عفریت کو ہم نے ہی چڑھایا ہے، ہماری تاریخی غلطیاں، کوتاہیاں، عیش کوشیاں ہیں جن کی نجاست نے آج اس منحوس عفیریت کو ہم پر مسلط کیا ہوا ہے۔۔۔۔ یہ خدا کی طرف سے ہماری آزمائش ہے، دنیاکے مظلوم اور کمزور لوگوں کی۔۔۔ کہ کب یہ اپنے حقوق کیلئے جدوجہد کرتے ہیں۔۔۔۔ اور کب اس عفریت کو عالم انسانیت سے نکال کر وہیں پھینک مارتے ہیں یعنی مریخ پر جس پر یہ تحقیقات کر رہا ہے، اور اس دنیا کو پاک کرنے کا ٹھیکہ کون لیتا ہے یہ وقت بتائے گا۔

بالکل اسی طرح جس طرح خدا کے اثبات کیلئے دلائل دیئے جاتےہیں ویسے ہی شیطانی عفریت کے وجود کے بھی دلائل ہیں، جو اس کے اثرات و نتائج سے واضح ہوتےہیں، اگر واقعی سازشوں کی باتیں افسانہ ہیں تو سب زیادہ تکلیف پھر انہیں کیوں ہوتی ہے کہ ایسے دانشور اور صحافی یا تو مار دیئے جاتےہیں یا خوفزدہ کر کے نام نہاد سوفٹ ویئر تبدیل کیے جاتے ہیں۔ بھئی بالآخر ہر انسان کے پاس عقل ہے اگر غلط ہے تو وہ بھی واضح ہوجائے گا مگر چونکہ مجرم خوفزدہ ہوتا ہے اسلئے ایسے تمام تبلیغات پر قدغن لگا رہا ہے جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ تمام الزامات سچ ہیں۔ یہاں پر آزادیٔ اظہار رائے کے نعرے بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان دوغلے معیارات اور دیگر بہت سے ثبوت ہیں جو ثابت کرتےہیں کہ خدا اور مذاہب کو افسانہ کہنے والے اپنی ابلیسی کرتوتوں کو بھی ایسے ہی افسانہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں، جبکہ سازشیں ایک زندہ حقیقت کی طرح ہیں، البتہ بہت جلد ان کا خاتمہ قریب ہے۔ ان شاء اللہ العزیز

کونسا معلم اور کون سی تعلیم مقدس اور عبادت ہے؟

مغربی نشاۃ ثانیہ کے بعد دنیا میں عقل و دانش کے فروغ کے ذریعے دنیا کی جس سعادت و خوش بختی اور مسرت کیلئے دعوے کیے گئے تھے وہ سب پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈھیر ہوگئے۔ آج کے دور میں ہمیں نیچرل سائنسز کے ساتھ سوشل سائنسز کے فروغ کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ دنیا انسانی مزاج کو جو جسم و روح اور عقل و جذبات پر مشتمل ہوتا ہے اس کی تسکین کیلئے جامع منصوبہ تشکیل دے اور اس کیلئے بغیر کسی مکتب سے تعصب کے غیر جانبدار تحقیقات کریں اور نتائج کو خلوص سے قبول کریں۔

ہمارے سامنے ماضی کے تجربات بھی ہیں جو ہماری ہدایت کیلئے کافی و وافی ہیں۔ آج دنیا نے اپنے تمام فنون اور ہنر جتنے انسانی دماغ میں موجود ہوسکتے تھے آزما لئے آج 21 ویں صدی میں دنیا کی سربراہی تبدیل ہو رہی ہے اور مغرب سے مشرق کی طرف چین کی ترقی کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہی ہے اور یہ بھی تقریباً وہی پالیسیز کو اپنے سربراہی میں جگہ دے رہے ہیں جو مغربی استعمار استعمال کرچکا ہے اور دنیا کے سامنے یہ تمام حقائق موجود ہیں۔ لہذا دانشمند ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔

لیکن کیا ہمیشہ ترقی اور فضیلت کا معیار اقتصادی ترقی کو گرداننا درست ہے؟؟ کیا انسانی اقدار اور انسانی رویئے کسی قوم کے اس قابل نہیں ہوتے کہ اس کو دنیا میں سپر پاور کہا

جائے۔۔۔ مغربی نشاۃ ثانیہ سے قبل اسلامی سنہری ادوار کو جس علم و دانش سے منسوب کیا جاتا ہے وہ بھی ملوکیت کے طریق پر رہا جس کا ثبوت یہی ہے کہ یہ قوت مغرب منتقل ہوگئی ۔ نظام امامت سے روگردانی کرکے جس طرح مسلمان حکومتیں زوال پذیر ہوئیں اور مغرب ابھرا اسی روش پر آج مغرب زوال پذیر ہے۔ آئندہ بھی زوال کیلئے یہی قوانین ہیں جو پچھلی قوموں نے تجربہ کیے۔ جس میں سرفہرست منصب الٰہی امامت وولایت سے روگردانی ہے۔ سختیاں، پریشانیاں بہت بری ہوتی ہیں یقیناہوتی ہیں مگر یہ پریشانیاں بھی نعمت ہیں، جن سے نکلنے کیلئے انسان کوشش، جستجو، محنت، جانفشانی کرتا ہے اور اپنے زنگ آلود وجود کو کھرچ کر چمک دار بنا دیتا ہے۔۔ یہ دانش بہت اہم ہے، البتہ کوشش، جستجو، محنت اور جانفشانی کا ایک معین ہدف جو خلقت کائنات سے مربوط ہے طالب علم کے ذہن میں ہونا چاہیے۔ معلم پر بھی واجب ہے کہ اس علم و دانش کا مقصد عالم انسانیت پر الٰہی حاکم اور اسلامی حکومت کے قیام کی عملی کوششیں کرنے کیلئے طلبہ کے ذہن تیار کرے اور ان کو عملی جہتوں سے آگاہ کرے۔ الٰہی حکومت اور سیاست ہی ہوتی ہے جو معاشرتی عدل و سماجی انصاف کے فراہمی میں سب سے اہم کام کرتی ہے۔

عالمی وسائل کی غیر عادلانہ تقسیم، تفریح کے نام پر اخلاق سوز نشریات، علم کے نام پر کارپوریٹ غلاموں کی تیاری، صحت کے نام پر بیماریوں کا فروغ، سیاست کے نام پر ابلیسی ایجنٹس کی تعیناتی وغیرہ کا نعم البدل خدائی نمائندے کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ الٰہی حکومت ہی وہ منتظم ہوتی ہے جس سے معاشرے کا نظم و نسق درست انداز میں چلتا ہے اور سماجی

ضابطہ قرار دیئے جاتے ہیں، اس شعبے میں عائلی زندگیوں سے جو افراد آتے ہیں وہ تعلیمی درسگاہوں اور معلموں کے مرہون منت ہوتے ہیں کہ جیسا ذہن اور فکری ساخت وہ تیار کرتے ہیں وہی ہمیں سیاست اور دیگر تمام شعبہ جات میں نظر آتا ہے۔ درسگاہیں ہوتی ہے جو سماج بناتی ہیں اور اسی سماج سے افراد سیاست و معیشت و نشریاتی اداروں میں آتے ہیں، ان کے ذہن اگر نظریہ امامت اور سماجی شعور، سماجی عدالت وغیرہ سے پُر ہونگے تو عملی زندگی اور عام عوام کی زندگیوں میں قانون سازیاں اور پارلیمنٹ نیز اسی طرح نظر آئیں گی۔ معاشرے میں سختیاں، پریشانیاں کم ہوتی جائیں گی۔ خدائی نمائندہ اور امام کے ساتھ طاغوتی ائمہ سے بھی آگاہی ہونا ضروری ہے۔

انسان نہ تو عقل و دانش کے بغیر رہ سکتا ہے اور نہ ہی جذبات و احساسات کے بغیر۔ لہذا اس بات کا تقاضا زور پکڑتا ہے کہ معیشت کو بہتر بنانے والے علم و دانش کے ساتھ انسانی اخلاق و رویوں کو بہتر بنانے والے علم و دانش کو بھی فروغ حاصل ہو اور اس کیلئے بھی دنیا پر الٰہی اور خدائی نمائندے کی حکومت ضروری ہے، حکومت ہی وہ شعبہ ہے جہاں سے تمام نیکیاں یا برائیاں پورے معاشرے میں صادر ہوتی ہیں۔ غور کیجیے جب جب دنیا میں زور، زبردستی، دھونس، بدمعاشی کا چلن ہوا کرہ ارض کے مکینوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ یہ زور وزبردستی کے پس پشت ہمیشہ وہ سیاسی گروہ رہے جو معاشی طاقت و مادّی طاقتوں کے حامل تھے اور ان کے پیچھے وہ معلم تھے جنہوں سے سفاکیت اور چوری کے ذہن تیار کیے۔ اگر کہیں مذاہب کے ماننے والوں میں بھی ان صفات نے جنم لیا تو وہ بھی مادّی مفادات کے تحت۔۔۔۔ ہمیں

ایسے مذہبیوں کی بھی تربیت کرنا ہے جو دنیا پر اسلامی حکومت کے حوالے سے حساس نہیں ہیں اور اسلامی حکومت کے فائدے اور سعادتوں کو درک کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

اسلام انسانی معاشرے کو ایسے کمال پر دیکھنے کا خواہشمند ہے جو اس دنیا کے ساتھ ساتھ اخروی سعادت کیلئے بھی جدوجہد کرتا ہو۔ یہی دنیاوی حکومت جو اسلامی ہو اور خدائی نمائندہ حاکم ہو، آخرت کی کھیتی ہے۔۔۔۔ بطور مسلمان ہمارے لئے فرض ہے کہ ہم سماجی شعور میں اضافہ کریں اور انسانی سماج کی فلاح و سعادت کیلئے انتھک جدوجہد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیں اور علم و دانش اور درسگاہوں میں اس امر کو یقینی بنائیں کے طلبہ کے ذہنوں میں ظلم سے نفرت اور الٰہی اور خدائی اخلاق و تقوے کے حصول کی تڑپ پیدا کریں جس کا سب سے بڑا ذریعہ حکومت اسلامی ہے۔۔۔ تاکہ حکومت اسلامی کے نظم تلے ہر معاشرے کے ہر شعبہ میں اخلاق و رواداری اور دیگر دوسرے شعبے جیسے انتظامی، معاشی، سیاسی، علمی وغیرہ درست راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔

معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ رسمی علم و دانش کے ساتھ دینی علم و دانش و بصیرت کا حامل ہو۔ سیاسی امور سے غافل نہ ہو۔ نیز عائلی زندگی جو کہ معاشرے کا ایک بنیادی رکن ہے اس کو بھی فراموش نہ کرے۔ اسلامی معاشرے کے فرد کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شناخت جو خداوند متعال نے اسے عطا کی ہے اس سے انحراف نہ کرے اور اپنے وجود کو جو خدا کی طرف سے امانت ہے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو۔ اپنی خلقت کے

ہدف سے آگاہ ہو، انبیاء رسل اور ائمہ علیہم السلام کی زندگیوں اور ان کے ارسال کا مقصد و ہدف سے بھی آگاہی رکھتا ہو۔ اور خود اپنے لئے بھی ان اہداف و مقاصد سے ہم آہنگی پیدا کرے تا کہ یہ دنیاوی معاشرہ جو آخرت کی کھیتی ہے کہ عنوان کے طور پر یہاں اعمال کی زراعت کر سکے۔

اگر علوم انسانی و سماجی منحرف ہو جائیں اور غلط و نادرست بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرے کے تمام اعمال و تحرکات بھی غلط اور نادرست روشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ آج مغرب میں جو علوم ہیں یہ علم و دانش مسلسل استعمار کی خدمت میں مصروف ہے، دھوکہ دینے، غلام بنانے، ظلم و جبر کیلئے استعمال کیے گئے، اقوام عالم کی دولت لوٹنے کیلئے استعمال کیے گئے۔ ائمہ جور کی اطاعت میں ابھی بھی یہ اسی کام میں مشغول ہیں۔۔۔ یہ نتیجہ ہے اسی غلط فکر، غلط نظر اور غلط بنیادوں کا اور غلط اہداف کا۔ یہ علم و دانش کہ جو اتنی عظمت رکھتا ہے۔۔۔ خود علم جو رحمت ہے، عزیز ہے کریم ہے اسے غلط انداز سے استعمال کیا گیا، اس کا ہدف اور مقصد وہ نہیں ہے جو خالق کائنات نے مشخص کیے ہیں۔ مغربی علم و تہذیب جس مغالطہ اور ڈھٹائی کے ساتھ عالم انسانیت کو جبر اور زبردستی کے ذریعے زیر کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے تو ان کے وسائل میں میڈیا، تعلیم اور معاشیات بہت اہم جزو کے طور پر شامل ہیں۔ مغرب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مادیات کے چکر میں معنوی اقداروں کو عبث اور بے کار باور کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اور معنوی اقداروں سے مملو اسلامی نظام کو اپنے مقاصد میں رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔

آج کے دور میں چونکہ طاغوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ حملہ آور ہے تو اس موقع پر طاغوت کے ساتھ سخت رویہ رکھنے کی ضرورت ہے یہ کام الٰہی حکومت ہی انجام دے سکتی ہے اور ہر وہ دین جس سے انسانی معاشرے کے مسائل حل نہ ہوں، ظالم مقتدر ہو رہے ہوں تو ایسے دین کو ترک کر دینا چاہے کیونکہ یہ دین کے نام پر ابلیسیت ہے۔ ایسا علم و دانش جو معاشرے کے مسائل حل نہ کرے، لوگوں کیلئے فائدہ مند نہ ہو وہ بے کار ہے۔ علم و دانش کا مسائل حل کرنے میں بنیادی امر یہی ہے کہ طلبہ کو سماجی مسائل کے حل کا شعور دیا جائے اور سب سے اہم کہ سماجی مسائل کے حل کیلئے ایسی حکومت کے قیام کی سوچ دی جائے جو حلّالِ مسائل ہو۔ ایسی حکومت صرف اسلامی ہو سکتی ہے اور فقیہ یا مومن کی یا امام معصوم علیہ السلام کی سربراہی میں معاشرے کی ترقی کی ضامن ہو سکتی ہے۔

آج میڈیا، سیاست دان، مرچنٹس سب دنیا کا سب سے اہم مسئلہ معاشی باور کروانے میں جتے ہیں۔ اور معاشی ڈسکورس تخلیق کر کے صہیونی سرمایہ داری نظام کو قبول کرنے کے جواز بنا رہے ہیں۔ مظلوم روبوٹ زدہ کولہو کے بیل عوام بھی معاشی مسائل کو بنیادی مسائلہ سمجھ رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ معاش بنیادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ کرپٹ سیاسی نظام کی پالیسیز کا "نتیجہ" ہے، البتہ معاشیات کے مسائل ہیں۔۔۔۔ مگر پھر وہی بات کہ اس کی جڑ کہیں اور ہے۔ معاشی مسائل ثمر ہے غیر عادل سیاستدانوں کی بد دیانت معاشی پالیسیوں کا۔۔۔۔ اور سیاست میں ایسے لوگ ثمر ہیں۔۔۔۔ بے شعور بے بصیرت استادوں، معلموں اور درسگاہوں کا۔۔۔۔ لہذا مسائل کی جڑ تعلیم و تربیت میں کوتاہی ہے۔۔۔۔ نام نہاد علماء

نام نہاد دانشور, نام نہاد اساتذہ؛ کرپٹ سیاستدان, کرپٹ مرچنٹ اور دیگر تمام کرپشنز کا منبع ہیں ۔۔۔۔ یہ معلم اور درسگاہیں فساد کی جڑ ہیں۔ لہذا ان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ معلم اور درسگاہ اگر طلبہ میں توحید، امامت اور معاد کی اہمیت سائنسی انداز میں یعنی منطقی انداز میں پیش نہیں کر رہاہے اور طلبہ کو دنیاکے پست شعبوں کیلئے لالچی انسان تشکیل دے رہاہے تو وہ علم و حکمت و دانش سے خیانت کر رہا ہے۔ دنیا داری کیلئے علم کا حصول اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب کلّی ہدف معاشرے پر الٰہی حکومت کے قیام کیلئے جدوجہد کرنا بھی تعلیم دیاجارہاہو۔ ایسی تعلیم اور ایسا معلم جو سماجی انصاف کے مرکز، معاشرتی عدالت کے جوہر یعنی امامت کی طرف رغبت دلانے کے بجائے اور طلبہ کو کارپوریشنوں کا غلام بنارہاہے یالالچی اور ہوس پرست تاجر بنارہاہے، یا کرپشن کرنے والے سیاستدان اور جج ووکیل بنارہا ہے تو معاشرہ موجودہ صورتحال سے مزید بدترین کی جاتا رہے گا۔ تعلیم روزی روٹی کے ساتھ دنیاکے تمام مسائل کے حل کرنے والی اسلامی حکومت اور عادل حاکم کے قیام کیلئے بھی ہونی چاہیے اگر ایسانہیں ہے تو پھر خواہ صہیونی یہودی ہوں یا پھر بے بصیرت و بے دانش مسلمان ۔۔۔ پھر معاشرے کے مسائل کا حل نہیں ہے ۔۔۔ اور ایسی تعلیم نہ تو عبادت ہے اور نہ ہی ایسا معلم ہرگز مقدس ۔۔۔!!

علمی درایت کسے کہتے ہیں ؟!

ایک مسئلہ جو عموماتربیت و تبلیغ میں ناپختہ مبلغین اور مربیوں کے ساتھ ہوتاہے وہ یہ ہے کہ مربی اور مبلغ یاتو ایجابی انداز رکھتے ہیں یاپھر سلبی، نیز جس کو تبلیغ کی جارہی ہے اس کی ذہنی سطح کو مد نظر رکھے بغیر یا وقت، جگہ اور موقع کی مناسبت سے بے توجہی رکھتے ہوئے ہی اس کو آیات یا احادیث بتائی جاتی ہیں جس سے وہ شخص پریشان ہوجاتاہے۔

قرآنِ کریم اور احادیث میں عموماً ایک ہی موضوع سے متعلق ایجابی انداز بھی پایاجاتاہے اور سلبی بھی، مثلاً والدین کے احترام اور عزت کی بھی تلقین ہے اور والدین کے خلاف ہوجانے کو بھی ثواب بتایا گیاہے۔ اس طرح مکلف کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے لائحہ عمل تعین کرتے وقت اس آیت یا حدیث کے شانِ نزول یا اس کے بیان کے وقت کی حالت اور جگہ سے بھی واقف ہوں تاکہ یہ یقین کیاجاسکے کہ فلاں ایجابی حکم اس وجہ سے تھا اور فلاں سلبی حکم فلاں وجہ سے تھا۔ اور یوں اپنے لئے راستہ تعین کرنے میں آسانی رہے گی۔ روزہ رکھنے کی قرآن مجید میں فضیلت ہے مگر نہ رکھنا بھی عبادت ہے، اقرباء سے صلہ رحمی واجب ہے مگر اقرباء سے قطع تعلق بھی عبادت ہے، حلال کھانا واجب ہے مگر حرام کھانا بھی واجب ہوجاتاہے۔ دشمن کے جہاں پاؤ قتل کردو کا حکم بھی قرآن کریم میں ہے مگر دشمن سے صلح جوئی کو بھی عبادت کہا گیاہے۔ قصاص کا حکم بھی ہے اور معاف کرنے کی نصیحت بھی ہے۔ ہدایت کیلئے قرآن کریم کو بنیاد بتایا گیاہے مگر اسی قرآن میں دیگر الہامی

کتابوں سے تعلق اور ان پر ایمان بھی ضروری ہے۔ شرک کو سب بڑا گناہ کہا گیا ہے دوسری طرف مگر خدا اپنے ساتھ رسول، اولی الامر اور مومنین کی بھی اطاعت کا حکم دے رہا ہے۔ مگر کب، کیوں، کیسے ؟ اس کیلئے ہمیں آیت یا حدیث بیان ہونے یا نازل ہونے کا وقت اور جگہ کا علم ہونا چاہیے۔ اسی طرح حج، نماز، زکواۃ وغیرہ کے بھی احکام ایجابی بھی ہیں اور سلبی بھی۔

قرآن کریم اور احادیث بھی موقع کی مناسب سے نازل ہوئیں ہیں یا معصومین علیہم السلام کی طرف سے بیان کی گئی ہیں، اس موقع کی مناسب ہی کی وجہ سے ہمیں احکام میں تغیر ملتا ہے اور اسی وجہ سے ہمیں ہر ایک کیلئے، ہر وقت اور ہر جگہ ایک ہی بات تکرار نہیں کرنی چاہیے بلکہ موقع کی مناسب دیکھتے ہوئے عمل کرنا چاہیے۔

اسی وجہ سے اسلام میں بعض احکام ثابت (static) ہیں اور بعض احکام متغیر (on condition)،یا بعض کلّی طور پر " ثابت "ہیں مگر جزئیات میں "متغیر "۔

مثلاً نماز پڑھنا واجب ہے یہ صریح حکم قرآن مجید میں موجود ہے، مگر "نماز کے قریب بھی نہ جاؤ"، یہ بھی قرآن کریم میں موجود ہے، جب ہم ان احکام کے قرینے کو دیکھیں گے تو پتا چلے گا نماز تو واجب ہے مگر جب نشے کی مدہوشی حالت میں ہو تو نماز کے قریب بھی نہ جانے کا حکم ہے۔ یا مثلاً نماز واجب ہے کا کلّی حکم ہے مگر اس کو کس انداز سے پڑھنا ہے یہ حکم متغیر ہے، بیماری میں، سفر میں وغیرہ نماز کا انداز تبدیل ہو جاتا ہے۔

اسی طرح تمام سیاسی، معاشی، تہذیبی، اخلاقی مسائل کا حل بھی قرآن کریم اور احادیث میں اسی طرح سے ہے کہ ہم کسی بھی آیت یا حدیث کو ہر ایک کیلئے، تمام اوقات میں تمام جگہوں کیلئے ایک ہی انداز میں تبلیغ کرنے یا تعلیم دینے کے مجاز نہیں ہیں۔

نابالغ بچوں کیلئے ایجابی اور ثابت احکام بیان کیے جاتے ہیں کیونکہ ان کی تنقیدی فکر اور جستجو کی حس بیدار نہیں ہوئی ہوتی لہذا انہیں ایک لگے بندھے ایجابی انداز میں train کیا جاتا ہے جس سے ان کی عادتیں اور بنیادی نظریات و عقائد راسخ کر دیئے جائیں اس زمانے میں ان میں سوال اٹھانے کی حس نہیں ہوتی بلکہ صرف اطاعت اور follow کرنے کی حس ہوتی ہے۔لہذا static انداز میں انہیں سکھایا جاتا ہے،

جبکہ بالغ بچے جن میں سوال اٹھانے کی حس بیدار ہو چکی ہوتی ہے اور وہ critical سوچ کے حامل بن رہے ہوتے ہیں اس زمانے میں انہیں اطاعت اور static follower بنانے کے بجائے ان کی منطقی فکر کو تربیت دینا اہم ہوتا ہے، تاکہ وہ آزادانہ فکر و تدبر کر کے اپنے لئے static عقائد اپنا سکیں اور زندگی کا لائحہ عمل تجزیہ و تحلیل کی بنیاد پر بنا سکیں۔

نابالغ بچے کو جنسی عمل کی تعلیم دینا درست نہیں مگر یہی بچہ جب بالغ ہو جائے اور زندگی میں کسی جنس مخالف کا ہمسفر بن جائے تو اسے جنسی تعلیم دینا ضروری ہے۔

اسلام دین فطرت ہے،common sense بھی ان احکامات کو سمجھ سکتا ہے، البتہ اس کیلئے تجربات درکار ہوتے ہیں لہذا جب تک تجربات کے نتائج آتے ہیں اس وقت تک کسی غلط یا نادرست سے بچنے کیلئے آنکھ بند کر کے احکام الہٰی کی اطاعت میں ہی بھلائی ہوتی

ہے۔۔۔ غور و فکر اور احکام کے فلسفے تلاش کرتے رہیں، یہ عارفانہ اطاعت کیلئے اہم اور بہت ضروری ہے۔ مگر اگر ابتداء میں کوئی فلسفہ سمجھ نہیں آرہا ہو تو "ترک ذمہ داری" نقصان پہنچا سکتی ہے۔

ماہرینِ نفسیات نے انسانی ذہن کی شعوری کیفیت پر تحقیقات کی ہیں، جس میں اس امر کو کشف کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن ابتدائے خلقت یعنی حالت جنین سے لیکر بڑی عمر تک کس طرح ذہنی اور فکری بالیدگی حاصل کرتا ہے اور کس عمر میں انسان کس طرح سے سوچتا ہے اور ذہن کی صلاحیتیں کس طرح سے عمر بڑھنے کے ساتھ وسعت پاتی ہے۔ لہذا اس نکتے کو مد نظر رکھ کر ہم خود اپنے لئے بھی اور دوسروں کیلئے بھی تعلیمی اور فکری تربیت کی مؤثر روشیں اور طریقے تیار کرسکتے ہیں۔

ہر شخص جداگانہ خصوصیات و ماضی رکھنے کی بنا پر جداگانہ سوچ اور جداگانہ احکام دینی کا متقاضی ہے، کلی طور پر ایک حکم بہت سی جزئیات رکھتا ہے، لہذا ہر شخص کو چاہیے کہ انفرادی دینداری کو بھی سمجھے اور دین کے اجتماعی پہلو کو بھی اہمیت دے۔ قرآن و حدیث و سیرت معصومینؑ سے استخراج حکم خواہ اجتماعی حوالے سے ہو یا انفرادی؛ زمان و مکان اور شخصی کیفیات و صفات کو مد نظر رکھنا اور ان پہلوؤں کے تقاضے ملحوظ خاطر رکھنا اساس حکمت و دانشمندی ہے اور اسی کا نام بصیرت ہے، یہی درایت علمی ہے۔

کولہو کا بیل اور جدید دنیا

یہ محاورہ ایسے شخص کے لیے استعمال کرتے ہیں جس میں سمجھ بوجھ کی کمی ہو یا قوت فیصلہ نہ ہو اور وہ دن رات کام میں بھی لگا رہے۔ آج کا دور، مشینی دور ہے۔ ہر کام مشینوں کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ مشینی دور سے پہلے دیہات میں زیادہ تر کام جانوروں سے لیا جاتا تھا۔ کھیت میں ہل چلانے، کنویں سے پانی نکالنے، تیار فصل کو منڈی تک پہنچانے اور چاول کو دھان سے علیحٰدہ کرنے کے لیے بھی بیل سے کام لیا جاتا تھا۔ غرض بہت سے کاموں میں بیل کی مدد اور طاقت سے انسان فائدہ اٹھاتے تھے۔ اسی طرح بیجوں سے تیل نکالنے کا کام بھی بیل ہی انجام دیتے۔ جس جگہ تیل نکالا جاتا اُسے کولہو کہتے ہیں۔ یہ لکڑی کی چکی کی طرح ہوتا ہے۔

اس میں بیج بھرنے کے بعد ایک موٹی سی گول چکنی لکڑی کے ساتھ بیل باندھ کر چکر لگوائے جاتے ہیں۔ بیل کی مدد سے اس کا درمیانی حصہ گھومنے لگتا ہے جس کی وجہ سے بیج پس جاتے اور ان سے نکلنے والا تیل ایک نالی سے گزرتا ہوا برتن میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ بیل کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے تاکہ گول گھومنے کی وجہ سے اسے چکر نہ آئیں۔ بیل صبح سے شام تک اس کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور یہی اس کا کام ہے۔ بیل اپنی دانست میں

میلوں کا سفر طے کرتا اور اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ ایک ہی محدود جگہ پر چکر لگا رہا ہے۔

صدیاں گزر گئیں، کولہو کا بیل آنکھوں پر کھوپے پہنے، گلے میں گھنٹی ڈالے، دائرے میں چلتا جا رہا ہے، بیل کی آنکھیں کھلی رہیں تو اسے پتہ چل جائے کہ وہ تو ایک لاحاصل سفر پر روانہ کیا گیا ہے، اسی لئے بیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیئے گئے ہیں کہ وہ حقائق نہ جان لے، اوپر سے اس کے گلے میں بندھی گھنٹی اس کو یقین دلاتی رہتی ہے کہ وہ اکیلا ہی اس سفر میں نہیں ہے زندگی کا شور بھی شریک سفر ہے۔ یہ سراب صدیوں پہلے پیدا کیا گیا اور آج تک جاری ہے، بیل کھوپے سمیت دنیا ومافیہا سے بے خبر رواں دواں ہے۔

مصر اور برصغیر تاریخ کی پرانی تہذیبوں کے نمائندہ خطے ہیں، تین ہزار سال قبل مسیح کے مصر میں طوطخ آمون نام کا بوائے کنگ برسر اقتدار تھا، طوط یا یاتوت فراعنہ مصر کی شاخ میں سے تھا یہ 9 سال کی عمر میں بادشاہ بنا اور ساڑھے 19 سال کی جوان عمری میں ہی وفات پا گیا۔ مصر کے عجائب گھر میں طوطخ آمون کا وہ شاہی رتھ آج بھی موجود ہے جس پر چڑھ کر وہ دشمنوں کے خلاف صف آراء ہوتا تھا۔ اس رتھ میں دو گھوڑے اکٹھے جُوتے جاتے تھے۔ دوسری طرف سندھ کے قدیم تہذیبی مرکز سے موہنجوداڑو کی جو کہانی ابھرتی ہے اس میں گھوڑے کا ذکر نہیں ملتا۔ سندھ کا علامتی ہیرو "سائیں یا پروہت" موجود ہے اور تانبے سے بنی رقاصہ بھی۔ مگر نہ گھوڑے کی کوئی مہر ہے اور نہ اس کی کوئی تصویر۔ ہاں البتہ بیل موہنجوداڑو کی تہذیب کا اہم جزو تھا۔ یہی بیل آج بھی ہند اور سندھ کی تہذیب کا نشان ہے۔

ڈھگا، کولہو کا بیل اس خطے کی سستی اور سادگی کے لئے طعنہ بھی رہا ہے اور جانفشانی کی علامت بھی۔ بعض تاریخ نویس اور مفکرین سمجھتے ہیں کہ کولہو کا بیل بغاوت نہیں کرسکتا۔ دائرے میں چلتے چلتے بیل کو ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ وہ سیدھا چلنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ مگر یہ مکمل سچ نہیں ہے کولہو کا بیل اندھا نہیں ہے اسے کھوپے پہنا کر اندھا کیا گیا ہے اور اگر یہ کھوپے اتر جائیں تو بیل بھی بغاوت کر دے گا اپنے حقوق کے لئے اڑ جائے گا۔ پھر وہی گھنٹی جو اس کی غلامی کی علامت ہے آزادی کا ترانہ بن جائے گی۔

کولہو کے بیل کا یہ سفر صدیوں سے جاری ہے۔۔۔ لوگ اپنا پسینہ نکال کر دوسروں کو تیل سے نوازتے ہیں اور کب تک نوازتے رہیں گے کچھ نہیں پتا۔۔۔۔ خود ساری زندگی ایک نقطے پر سفر کرتے کرتے دوسروں کے دائروں کی تکمیل کرتے رہیں گے۔۔۔ تیل نکلتا ہے۔۔۔ نکلے جارہا ہے۔۔۔ دائرے بنتے ہیں۔۔۔ بنتے جارہے ہیں۔۔۔۔ فرق صرف اتنا ہے کبھی بیل تبدیل ہو جائے گا تو کبھی پرکار۔۔۔ اور کہیں کولہو کا مالک بدل جائے گا تو کہیں پرکار والا ہاتھ۔۔۔۔۔ کیونکہ ہم لوگوں کی مثال سلیٹ پر لکھے ان الفاظ کی سی ہے جنھیں اگلے سوالات کی خاطر بہر حال مٹنا ہی پڑتا ہے۔

مشرق ہو یا مغرب، کارپوریٹ کلچر نے آج کے انسان کو اسی کولہو کے بیل میں تبدیل کیا ہوا ہے، نہ شوہر کے پاس بیوی کیلئے وقت ہے، نہ بچوں کے لئے وقت ہے، بس صرف اقتصادی و معاشی ضرورتیں پوری کرنے کو ذمہ داری سمجھ لیا گیا ہے، ایسے گھرانے وجود پا چکے ہیں جن میں مسرت، سعادت اور خوش بختی نہیں ہے، انسانوں کا انسانوں سے مستقیم رابطہ ختم ہو چکا

ہے۔۔۔ ہر شعبہ میں انسان روبوٹ بن چکا ہے، خواہ تعلیمی شعبہ ہو یا کوئی اور ۔۔۔ کارپوریشنز کا کون سب سے اچھا صارف ہے، کتنا مال جمع کر سکتا ہے، کتنا اپنی زندگی کو کارپوریٹ معاشروں کی طرح بنا سکتا ہے وغیرہ

مقابلہ کی دوڑ لگی ہوئی ہے، نہ ہمارے پاس گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا وقت ہے، نہ بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کیلئے وقت ہے، نہ سکون سے عبادت کیلئے وقت ہے اور اگر کبھی ان کے ساتھ بیٹھ بھی جائیں تو گھڑی دیکھتے ہیں کہ اگلے task پر جانا ہے۔ یہ سعادت مند زندگی کی نشانیاں نہیں ہیں۔ کارپوریٹ کلچر کا تعلیمی نظام بھی ایسا ہے کہ اس کلچر میں فٹ ہونے کیلئے ہم نفسیاتی مریض کی حد تک گریڈز اور پوسیشنز کے دیوانے ہو گئے ہیں۔ ہائر ایجوکیشن نے ہمیں اس ابلیسی سسٹم میں تو فٹ کر دیا ہے مگر ہم انسانی اقدار، انسانی تہذیب اور قدرتی ماحول سے اتنا ہٹ چکے ہیں کہ اگر کسی کو پلٹنے کی طرف کہیں تو وہ ہمیں احمق سمجھتا ہے ہم اپنا "کھوپہ" اتارنے پر تیار ہی نہیں۔

خلوص، انسیت، مہربانی، رحمت، شفقت تقریباً ناپید ہو کر صرف معاشی جانور بن چکے ہیں۔ ان بیلوں کو بتانے کی کوشش کرو تو بھی نہیں مانتے، بغاوت پر اکساؤ تو دشمن گردانے لگتے ہیں، جو اپنی کیفیت سمجھ جاتے ہیں ان میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی روش تبدیل کر سکیں اور کم از کم اگر فوری تبدیل نہیں بھی کر سکتے تو تبدیلی کا عزم ہی پیدا کر لیں اور آئندہ نسلوں کو وراثت میں دے جائیں۔ بعض تو یہ بھی نہیں مانتے کہ وہ اپنا مقام بنانے، اپنی شناخت کروانے یا اپنے آپ کو منوانے کی کوششیں کر رہے ہیں بلکہ یہی کہتے ہیں کہ بس

روزی روٹی کمانے اور بچوں کو پالنے پڑھانے کا مسئلہ ہے جس کے لیے کولہو کے بیل کی طرح جتے ہوئے ہیں۔ اس عالمی روبوٹ زدہ مشینی زندگی کو جو صرف چند سرمایہ داروں کے منافع کے گرد گھوم رہی ہے، سے نکلنا ہو گا، بغاوت کرنی ہو گی، سسٹم کی تبدیلی ہی اب تمام مسائل کا حل ہے۔ اسی ابلیسی نظام کو توڑنا ہو گا، انقلاب لانا ہو گا، عالمی انقلاب۔۔۔!!

ماڈرن جاہل

(محترم محمد علی سید صاحب کی فیس بک وال سے۔۔ مختصر اضافہ کے ساتھ)

ایک عجیب رجحان اس وقت پیدا ہو چکا ہے کہ لوگ اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر' پروفیسر' عالم دین' محقق' ریسرچ اسکالر' لکھ رہے ہیں۔۔

اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ان کی عزت میں اضافہ ہو جائے گا

جب کہ ایک دن بھی کسی مدرسے حوزہ علمیہ یا یونیورسٹی جانے کی زحمت تک نہ کی ہو اور اس طرح سے سیدھے سادھے لوگوں کو بے وقوف بنا سکیں گے اور اسے وہ کوئی جرم بھی نہیں سمجھتے۔۔

حالاں کہ۔۔۔۔۔

مجموعہ تعزیرات پاکستان یعنی پاکستان پینل کوڈ PPC کے مطابق۔۔۔

یہ جرم ہے اور اسے تلبیس شخصی کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو وہ ظاہر کرے جو وہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مفادات حاصل کر سکے چاہے وہ قانونی ہوں یا غیر قانونی ۔۔

سمجھ لیں کہ اپنے آپ کو جعلی آفیسر جعلی فوجی افسر جعلی حکومتی اہلکار سمیت کچھ بھی بننا یا ڈاکٹر یا پروفیسر بننا قانونی جرم ہے

اور پاکستان پینل کوڈ کی دفعہ 418 اور 419 اور 420 کے مطابق اس کے ارتکاب کرنے والے کو سات سال قید تک کی سزا ہو سکتی ہے۔۔۔

اضافہ: دنیا کے قوانین میں تو یہ جرم ٹھہرا ہی اور خدا کی عدالت میں سنگین جرم ہے۔۔۔ پڑھے لکھوں میں روایت عام ہے کہ ریفرینس دیتے ہیں۔۔۔ مگر قرآن کا ریفرنس کیا ہے؟!!

پڑھے لکھوں کے پاس اگر عرفانی علم (intuitive intelligence) نہیں ہے تو کتابی اور چھپی چھپائی معلومات (literary intelligence) دماغ کو انسائکلوپیڈیا تو بنا سکتی ہے، عالم نہیں بنا سکتی۔۔۔

کتابی معلومات پر بھروسہ کرنے والے قارئین, سامعین و مخاطبین اصل علم اور بین سطور حکمتوں سے نا آشنا رہتے ہیں۔۔۔ ڈگریاں اور القابات سے ایسے لوگوں کو نوازتے ہیں، جو علمی نسبت پر فخر کرتے ہیں، چونکہ خود بھی صاحب حکمت نہیں ہوتے۔۔۔ لہذا ایسے مخاطبین اور اسکالرز کی خوب بنتی ہے۔

دینی علماء کیلئے تو یہ روش انتہائی مضر خود ان کی آخرت کے حوالے سے ہے ہی ان کے مخاطبین کیلئے گمراہی کا باعث ہوتی ہے۔۔۔۔ البتہ دیگر تجرباتی علوم میں یہ روش کچھ حد تک فایدہ مندرہتی ہے کیوں کہ تعلق مادی مظاہر سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔

مگر دینی علوم میں اس کو برتنا امت کی گمراہی ہے۔۔۔۔ دینی تجربہ خود پر کیے بنا یعنی اپنی نفسانی کیفیات اور اس کے رموز سمجھے بنا نہ ہی کائنات کے باطن میں اترا جاسکتا ہے نہ ہی قادر مطلق کی معرفت وشناخت حاصل ہو سکتی ہے۔۔۔۔

امام علی ع نے تین طرح کے علماء کا تعارف کروایا ہے۔۔۔۔ جس میں ڈگری ہولڈرز اور غیر ڈگری ہولڈرز کی فضیلت اور پستی کا معیار ان کی نیتوں کو قرار دیا ہے۔۔۔۔ علم کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔۔۔۔ شرط یہ ہے کہ علم کو اسی طرح سیکھا اور برتا جائے جو خدا نے معین کیا ہے، یعنی تقوا۔۔۔۔۔ خواہ وہ ڈگری ہولڈر ہو یا غیر ڈگری ہولڈر۔۔۔۔ تقوے سے ہی باطل کا ڈنک توڑا جاتا ہے، تقوا اور تزکیہ نہیں ہے تو علم قرآن بھی فاسد ہے، سائنس وفلسفہ تو دور کی بات۔۔۔!!

کیونکہ بعض ملاّ و ڈاکٹر رسمی ڈگریاں لے کر بھی جاہل ہوتے ہیں اور بعض اہل مطالعہ, اہل مشاہدہ بھی بغیر رسمی ڈگری کے فاضل وعالم ہوتے ہیں۔۔۔۔

بعض حقیقی ڈگری ہولڈرز بھی ایسے مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہم پڑھے لکھے ہیں، حالانکہ صرف رسمی کتابوں اور امتحانات پاس کرنے کیلئے مطالعہ کرنا، تحقیق کرنا اس کی

طرح نہیں ہو سکتا جو مطالعہ سے عشق رکھتا ہے، تحقیق اس کی روح میں رچی ہوئی ہو، تقوا اور تزکیہ، مراقبتِ نفس ہر گھڑی ہو۔

علمی دور علمی دور ہوتا ہے اور عملی دور علم کو برتنے کا ہوتا ہے،

جس طرح مدرسوں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیز کے اندر کسی موضوع کے بارے میں نصابی اور کتابی بحث کی جاتی ہے۔ علمی مراکز میں بحث فقط علمی غرض کیلئے ہوتی ہے، الفاظ کی بحث، مفاہیم اور معنٰی کے اندر دقت، تاریخِ علم، مختلف اقوال، اعتراضات، جوابات اور تنقیدات وغیرہ کسی علمی بحث علمی دور کے اصلی ارکان ہیں۔

اس بحث کے اندر وفائے عہد، تحریک، بیداری، ہوشیاری وغیرہ کا شائبہ نہیں ہوتا، عالمانہ اور محققانہ بحث میں مذکورہ مسائل بیان کرلینے کے بعد عالم یا محقق اپنی کوئی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ محض علمی مراکز میں گفتگو کرنے اور سننے والے سب کچھ جاننے کے باوجود عملی میدان سے دور ہی نظر آتے ہیں۔

ایسی گفتگو سے احساسِ علمیت ضرور پیدا ہوتا ہے، انسان ڈائیلاگز میں تبادلہ افکار کے قابل ہوجاتا ہے، تقریریں کرسکتا ہے، کتابیں لکھ سکتا ہے، سب سے بڑھ کر روشن فکر، عالم فاضل و محقق کہلا سکتا ہے اور ملازمت بھی حاصل کرسکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک پیغمبرانہ و ذمہ دارانہ عملی طریقہ گفتگو ہے کہ علمیت نہیں بکھیری جاتی، فلسفہ بافی نہیں کی جاتی، کثرت سے حوالے نہیں جاتے، ہمہ دانی کا تاثر نہیں بٹھایا جاتا

اور علمی لوریاں نہیں سنائی جاتیں بلکہ اس طرزِ تخاطب میں ایثار، فداکاری، تعہد کا احساس دلایا جاتا ہے، خواب سے بیدار کیا جاتا ہے، غفلت سے نکالنے کیلئے جھنجھوڑا جاتا ہے، احساسِ خطر کرایا جاتا ہے، حرکت میں لایا جاتا ہے، قوموں کو مستقبل کیلئے پُر اُمید بنایا جاتا ہے، مشکلات کی نشاندہی اور مسائل مشکلات کا حل بتایا جاتا ہے۔

مگر لباس اور سند آج کے ماڈرن جاہل کیلئے سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے اور ظاہر پرست اسی کو عالم و دانشمند جان کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

مادّی اشرافیہ اور دینی اشرافیہ

فرد اور معاشرے کیلئے سب سے اہم جو شعبے ہوتے ہیں وہ ہیں علم و دانش اور اقتصاد۔ یہ دونوں شعبے ایک دوسرے کے بغیر بیکار ہیں۔ البتہ اگر ان دونوں میں بھی سب سے اہم کو منتخب کیا جائے تو وہ علم و دانش ہوتا ہے۔ علم و دانش ہی کے ذیل میں رسمی مذہب بھی آتا ہے اور دیگر تمام سماجی شعبہ جات اور ان کی ذیلی شاخیں۔

لہذا سماجی تجربات سے ہم سیکھتے ہیں کہ اگر فرد یا معاشرے میں علم و دانش جس کا سب سے واضح مظہر مذہب ہوتا ہے اور وہ دانا اور حکمت آمیز نہیں ہے تو سماجی ہرج و مرج پیدا کرتا ہے۔ خواہ وہ سیاسی شعبہ ہو، اقتصادی ہو، ثقافتی و تہذیبی ہو، وغیرہ۔ عائلی زندگی میں بھی علم و دانش مذہب سے جڑے بغیر تکبر اور خود خواہی میں مبتلا کرتا ہے اور یہ امر بھی ظلم و سفاکیت کا باعث قرار پاتا ہے۔ جدید دور کے مغربی معاشرے اس کی مثال ہیں۔ بعض جدید مغربی مفکرین پاکستان کے مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے "دھشت گردی، کرپشن، غربت، صنفی عدم مساوات، مذہبی انتہا پسندی" کو پاکستان کے اولین مسائل میں شمار کرتے ہیں۔ مگر بطور دیانت دار عالم کے ہم ان تمام مسائل کو جڑ نہیں بلکہ پھل قرار دیتے ہیں جس کے تناظر میں اصل مسائل وہ ہیں جن کا ہم نے ابتداء میں ذکر کیا باقی تمام جزئی مسائل

اصل مسائل کے پھل ہیں۔ قرآن مجید اور روایت کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر طرح کے سماجی مسائل کی ابتداء اقتصاد و معیشت میں بد دیانتی سے ہوتی ہے، اقتصادی نظام یا اقتصادی اصول جب حکمت و عدل سے دور ہوتے ہیں تو ایک عام انسان اور سادہ سماج کیلئے ہر طرح کی مصیبت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ بے شک اقتصادی اصول طے کرنے والے عام لوگ نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کے اقتصادی اشرافیہ ہوتی ہے جن کے کنٹرول میں کرنسی، مارکیٹ اور دیگر اقتصادی ادارے ہوتے ہیں۔ اور یہیں سے اقتصادی اشرافیہ جب لالچ اور ہوس میں مبتلا ہو جاتی ہے تو معاشرے کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے پر اگر معاشرے میں روحانی اور حکیمانہ اشرافیہ ہے جو عدل و عدالت، انسان دوستی، خدا پرستی، خلق دوستی وغیرہ کے عملی اصولوں پر یقین کرتی ہے تو اقتصادی اشرافیہ اپنے پست مادی مفادات کے حصول میں رکاوٹ محسوس کرتی ہے۔ روحانی اشرافیہ پر عوام کے اعتماد کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ عوام مادی دنیا کو اہمیت نہیں دیتی بلکہ مذہبی اور روحانی تعلیمات کے تحت الٰہی غیبی طاقتوں کو اپنی محنت اور کاوشوں کے ساتھ قرار دیتی ہے۔ ہر شہ کو خود کے کنٹرول میں کرنے کی خواہاں نہیں ہوتی جیسے کہ اقتصادی اشرافیہ کے سیاسی ذہن ہوتے ہیں۔ بلکہ اپنی معاشی جدوجہد کے ساتھ خدا اور الٰہی طاقت کو اپنی کامیابی کا اولین وسیلہ قرار دیتی ہے۔ تاریخی تجربات کی روشنی میں جو خود قرآن کریم اور روایات سے بھی واضح ہے اور جدید دور کی تاریخ بھی اس امر کی گواہ ہے کہ مذہب اور علم و دانش ہی ہے جو معاشروں کو اقتصادی پابندیوں اور معاشی اشرافیہ کی پیدا کردہ مشکلات و مصائب کے

مقابلے پر ہمت و حوصلہ دیتا ہے نیز اقتصادی اشرافیہ سے مقابلے کرنے کی جرأت اور بے باکی بھی عطا کرتا ہے۔ لہذا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر طرح کا ہرج و مرج دنیا پرستی سے شروع ہوتا ہے اور ہر طرح کی فضیلت اور ترقی و سعادت علم و حکمت مذہب کی مرہون منت ہوتی ہے۔ لہذا جب تک کوئی بھی فرد یا معاشرہ مذہبی تعلیمات و اقدار کو اہمیت نہیں دے گا اس کی ہر طرح کی مادی ترقی پائیدار اور طویل المدتی ثبات کی حامل نہیں رہے گی۔ جب کہ مذہب اور علم و دانش کی چھتری تلے جو بھی قدم اٹھایا جاتا ہے اگر اس میں جھول بھی ہوتا ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ ہمت و حوصلے سے کی جانے والی جدوجہد اپنے ثمرات حاصل کرتی ہے اور یہ ترقی ہمیشہ رہنے والے اور پائیدار ہوتی ہے۔ اقتصادی اشرافیہ جب سیاست میں آتی ہے تو صرف ذاتی اقتصادی طاقت میں اضافہ چاہتی ہے اور جب حکیمانہ، دانشورانہ مذہبی اشرافیہ سیاست و قیادت میں قدم رکھتی ہے تو سماجی بہبود اور سماج کی دنیوی اور اخروی فلاح کے ساتھ آتی ہے۔ البتہ بظاہر جہاں جہاں مذہبی افراد کرپشن اور بددیانتی میں ملوث پائے جاتے ہیں اس کے پیچھے اقتصادی اشرافیہ کی مذہبی اشرافیہ کی معاشی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا شامل ہوتا ہے اور اس موردمیں مذہبی افراد کے ایمان کی گراوٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر اور جوہری تناظر میں مذہبی دانش اور حکمت ہر طرح کی سعادت، خوش بختی اور مسرت سے بھرپور ہوتی ہے۔ لہذا اخلاق کے اصولوں سے بغاوت نہ صرف ناپائیدار دنیا کا پیش خیمہ ہوتی ہے بلکہ آخرت بھی افسوس و یاس کا مظہر بنتی ہے۔

تکثیریت اور شمولیت

(Inclusion & Diversity)

انسان بہت سی جہتوں میں اختلاف اور تنوع کے ساتھ بہت سے معاملات میں اشتراک کا حامل ہے، انسان چونکہ ایک معاشرتی وجود ہے اور دیگر انسانوں کے ساتھ میل وربط و ہم آہنگی رکھنا اس کیلئے ضروری ہے لہذا یہ فطری امر ہے کہ انسان میں مشترکات پائے جاتے ہوں جس کی بنیاد پر ایک دوسرے سے رابطے کیلئے بدیہی مفہوم سب سمجھتے ہوں۔ ثقافتی بنیادیں جیسے کہ کھانے اور پہننے میں فرق و ذائقہ میں ایک عنصر جغرافیائی بھی ہے جو ثقافتی عنصر سے علیحدہ ہے۔ انسانی خیالات اور اعمال انسانی رویوں کو خاص شکل و جہت دیتے ہیں۔ مثلاً: کپڑے پہننا ہر انسان کیلئے ضروری ہے مگر ماحول اور ثقافتی بنیادوں پر اس کے رنگ، طرز مختلف ہوتے ہیں، اسی طرح معاش کیلئے سب ہی جدوجہد کرتے ہیں مگر طرز و طریقہ اور کمی و زیادتی کا سامنا کرتے ہیں، مگر کلی اور مشترک یہ ہے کہ ہوا سب کو چاہیے، روشنی سب کو چاہیے، کپڑے سب پہنتے ہیں، کھانا سب کھاتے ہیں، رات کو استراحت سب کرتے ہیں۔ مگر اس کے طور طریقے، انداز، رنگ ڈھنگ وغیرہ مقامی ضرورت اور آب و ہوا وغیرہ کے ذریعے مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا اسلامی طرز زندگی اس مختلف رنگ ڈھنگ پر کوئی اعتراض نہیں کرتا مگر یہ کہ ان کیلئے معیارات اور کیفیات کا تعین کرتا ہے اور ان کی طرف

نوع نگاہ مشخص کرتا ہے تا کہ ان میں انسان اور اسکی معاشرتی، اخروی امور پر پڑنے والے منفی و مضر مادّی و معنوی اثرات کو زائل کر دے۔۔ تمام امور حلال، پاکیزہ اور طاہر بنیاد اور طرز و طریقے کے حامل ہوں۔ خصوصا معاشی مسئلہ بہت ہی بنیادی ہے جس کی بنیاد پر عام آدمی پر تمام مادی اور کافی حد تک معنوی اور وحانی امور پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس میں حلال کسب اور حلال خرچ بہت ہی بنیادی مسئلہ ہے۔ اسی طرح سیاسی امور میں بھی حاکم اور سیاستدانوں کو دین سب سے زیادہ ذمہ دار اور حساس قرار دیتا ہے اور یہ ایسا شعبہ ہے جس سے تمام معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ ابلاغیات کا شعبہ جس میں میڈیا کا کردار بھی اہم ہے تا کہ معاشرے میں مثبت اور تعمیری اور تخلیقی راہیں پیش کی جاتی رہیں اور نوجوانوں اور جوانوں میں مثبت و تعمیری صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے۔ میڈیا تعلیم و تربیت کا ایک بہت عظیم رکن ہے، بعض مواقع پر میڈیا اسکول، مدرسوں اور یونیورسٹیز سے زیادہ اثر انداز ہوتا ہے لہذا اس کو بھی تعمیری انداز کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایسے سماجی اور ثقافتی ادارے ہونے چاہیں جو نئی نسل کو مثبت تعمیری اور تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول رکھیں اور دوسری اقوام اور ملتوں یا ایک ہی گھر میں مختلف نظریات رکھنے والوں کے ساتھ رواداری کے فروغ کا باعث بنیں اور غیر مسلم یا غیر نظریات رکھنے والوں کے ساتھ ایسے انداز میں امر بالمعروف یا نہی عن المنکر انجام دیں کہ فرد یا دیگر انسان اچھے طریقے سے دعوت حق کی طرف راغب ہوسکیں۔ خلاصتاً یہ کہ فردی اور معاشرتی طور پر انسان اس قابل ہو کہ وہ کمالِ مادّی کے ساتھ کمال معنوی کی طرف بھی راغب رہے۔ کمال مادّی میں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں مگر

معنوی کمال جس میں خصوصا اسلامی تعلیمات اور دینی رسوم کو بعض افراد عمداًناکارہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں ایسے مخالفین کی روک اور ان کی تعلیمات کو باطل باور کرانے میں بردبار، دانا اہل علم کی ذمہ داری ہے نیز معاشرے کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ علم و دانش رسمی کے ساتھ دینی علم و دانش وبصیرت کا حامل بنے۔ سیاسی امور سے غافل نہ ہو۔ نیز عائلی زندگی جو کہ معاشرے کا ایک بنیادی رکن ہے اس کو بھی فراموش نہ کرے۔ اسلامی معاشرے کے فرد کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی شناخت جو خداوند متعال نے اسے عطا کی ہے اس سے انحراف نہ کرے اور اپنے وجود کو جو خدا کی طرف سے امانت ہے اس ذمہ داریوں سے آگاہ ہو۔ اپنی خلقت کے ہدف سے آگاہ ہو، انبیاء رسل اور ائمہ علیہم السلام کی زندگیوں اور ان کے ارسال کا مقصد وہدف سے بھی آگاہی رکھتا ہو۔ اور خود اپنے لئے بھی ان اہداف و مقاصد سے ہم آہنگی پیدا کرے تاکہ یہ دنیاوی معاشرہ جو آخرت کی کھیتی ہے کہ عنوان کے طور پر یہاں اعمال کی زراعت کر سکے۔ کیونکہ بہر حال ایک نہ ایک دن انسان کو اس دنیا سے دوسری دنیا کا سفر کرنا ہے جس کا وسیلہ صرف یہ دنیا ہے اور اس میں اپنے شعبہ جات میں رہتے ہوئے، توحید، عدالت، اخلاق، شجاعت، رواداری وغیرہ کے ذریعے اپنی اس آخرت کو آباد کرے۔

کیا مغرب بہت دیانت دار ہے ؟!!

ہر مسئلے کا ذمہ دار حکمران نہیں اور اسی طرح دنیا میں حکومتوں کے کردار ان کی عوام سے الگ ہیں، مگر ہم یہاں تاجروں کے منافع اور اخلاق اور صارفوں کے خرچ اور اہمیت کی بات کررہے ہیں تو اسی مغرب جس کے جرمنی میں صرف تجارت کے ہی نام پر نام نہاد ترقی یافتہ کمپنیاں اور ادارے انسانیت کا کس طرح استحصال کررہے ہیں یہ بھی دیکھتے ہیں۔ میکڈونلڈ کے برگرز میں انسانی گوشت کا استعمال کرنا، کیونکہ انسانی گوشت لذت میں کوئی ثانی نہیں رکھتا، ہم یہاں کتے اور گدھے کے گوشت پر روتے ہیں،

بڑی فارما- ادویات کی فروخت کیلئے نت نئی بیماریاں پھیلانا اپنی اسٹیک ہولڈر کمپنیوں کی غذاؤں کے ذریعے، ویکسینز کے ذریعے۔۔۔

جعلی احتیاجات پیدا کرکے غیر ضروری اشیاء کیلئے صارف بنانا مارکیٹنگ اور اشتہار بازی کے ذریعے۔۔۔

کھانے پینے کی اشیاء میں لذت کیلئے نشہ آور کیمکلز کا استعمال قدرتی اجناس اور غذاؤں پر سیاسی قبضے کرکے انہیں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے اپنی اجارہ داری بنانا فوجی دھونس اور سیاسی جبر کے ذریعے تجارتی معاہدے کرنا مقامی گماشتوں کو رشوتیں دینا

تیسری دنیا کو ترقی کے نام پر ٹیکنالوجی اور دیگر جدید سامان مہیا کرنا اس بات کو یقینی بنائے بغیر کے مقامی روایتی مزدور جدید ہنر یا ٹیکنالوجی کا استعمال سیکھ لیں بلکہ صرف اپنا منافع دیکھنا تیسری دنیا کی تجارت کو تباہ کرنا اور تمام صارفین کو اپنی مصنوعات کا خریدار بنانے کیلئے مجبور کرنا یہ تمام باتیں کوئی نہیں بتائے گا کیوں کہ میڈیا خود ان کا نمک خور گماشتہ ہے۔ مقامی ادارے اکثر ان سامراجی ممالک کے رزق خور گماشتے ہیں۔لہذا اس پر پردہ ہی رہتا ہے۔

ہماری کرپشن اور مغرب زدوں کی کرپشن میں فرق صرف درجے کا ہے۔ ان کا پیسہ زیادہ علم زیادہ ہے تو ان کی کرپشن ایگزیکیٹو ہے، وائٹ کالر کرپشن ہے، بڑی کرپشن ہے، ٹریلین ڈالرز کی کرپشن ہوتی ہے۔ جبکہ ہماری کرپشن چندی چوروں والی کرپشن ہے، آٹے چینی مصالحے، دودھ وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی کرپشن ہیں۔ مائنڈ سیٹ ایک ہی ہے بس ایک بڑے لیول پر ہے، ایک چھوٹے لیول پر ہے۔ ایک کرپشن سے لاکھوں بناتا ہے اور ایک کھربوں بناتا ہے۔ ایک قانون کے ذریعے کرپشن کرتا ہے اور ایک دھونس زبردستی سے لوٹتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے ٹریلین ڈالرز کا کاروبار اور اثاثے رکھنے والا دودھ میں ملاوٹ کرکے تو کمانے سے رہا۔۔وہ نفسیات سے کھیلتا ہے۔۔۔ ضرورت کو پیدا کرتا ہے، باور کراتا ہے کہ اس چیز کے بغیر زندگی ناممکن ہے اور پھر بیچتا ہے۔ اس کرپشن میں آپ کیوں کہ کم علم اور جاہل ہوتے ہیں اس لئے مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس کی رعب دار تہذیب کے بھرم میں آکر ہر الٹی سیدھی تحقیقات کو قبول کر لیتے ہیں۔

سرمایہ دار دین و انسانیت کے دشمن

اسلام مکمل سماجی نظام کے کلی قاعدے پیش کرتا ہے اور حکمرانی اور معیشت کے بھی کلّی اصولوں کے ساتھ ثقافتی و تہذیبی رویوں نیز عائلی زندگی کی بھی تربیت کرتا ہے۔ اسلام کے نام پر کج فہم اور بے ایمان قسم کے لوگ خواہ کسی لباس میں ہوں اپنے مادّی مفادات کی خاطر ہر تقدس کو پائمال کر رہے ہیں لیکن ان کے مادّی مفادات کا تحفظ کرنے والے وہ ہیں جن کے پاس سرمایہ ہے اور کثیر تعداد میں ہے لہذا یہ سرمایہ دار عالمی تسلط قائم کرنے کیلئے نہ صرف مذہب کے کمزور ایمان افراد کو استعمال کر رہے ہیں بلکہ ہر شعبے میں اپنے خزانوں کو رشوت دے کر فسادات کو فروغ دے رہے ہیں۔ عالمی حکم نامہ اگر مثبت روایات اور شستہ تہذیب کو فروغ دے، انسانیت کی کرامت کا قائل ہو اور سرمایہ کو مقصد زندگی نہ سمجھے تو بہت احسن فعل ہے مگر خواہ وہ مغربی جمہوریت ہو جس کو دنیا کی اقوام پر مختلف حیلے بہانوں سے مسلط کیے جانے کی کوششیں جاری ہیں یا پھر اشتراکی اور اشتمالی نظام ہو یہ سب اسلام کی نظر میں صرف جذاب نعرے ہیں مگر حقیقت میں یہ انسانی حقوق کی ادائیگی میں رکاوٹ انسانی سماج کی تباہی کے فارمولے ہیں۔ اسلام اپنے تربیتی اسلوب کے باعث جنگ و جہاد میں بھی تہذیب و ثقافت کا حامل ہے جہاں مثلہ کرنا (دشمن کی لاش کے ناک، کان، ہونٹ کاٹ لینا) حرام ہے اور جنگی قیدیوں کے بھی بہت سے حقوق کا پاسدار ہے۔ ہمیں اسلام کے

دعوے داروں اور خود اسلام کی تعلیمات میں فرق کرنا چاہیے، اگر انسان اپنی تربیت نہ کرے تو وہ ممکن ہے علم توحید، علم قرآن و تفسیر جاننے کے باوجود مشرک و ملحد واقع ہوا ہو۔ لہذا اس انداز سے دیکھیں تو بہت سے مکاتیب اور مذاہب ہیں جن کے پیرکار اپنے مذہب کی بہترین تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتے اس میں ان کی کمزوری ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ تعلیمات بری ہیں۔ آج کے دور میں اسلام بطور مذہب عالمی معاشرے کیلئے بہار کی حیثیت رکھتا ہے اور تیزی کے ساتھ افراد کا قبول اسلام اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ حق چھاجانے والا ہے اور باطل مٹ جانے والا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں سب سے افضل جہاد بے جاخواہشات کے مقابلے پر جدوجہد کو کہتے ہیں۔ سب سے پہلے جو چیز فاسد ہوتی ہے وہ انسانی افکار اور خواہشات ہوتی ہیں اس کے بعد پھر ایسا شخص جس جس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتا ہے وہاں وہاں فساد پیدا ہونے لگتا ہے، ابتدائی مرحلے پر ایسے شخص کی تربیت مقصود ہے اور اگر تربیت کے قابل نہیں تو سزا و عتاب کے ذریعے اس کے فساد کی بیخ کنی کی جاتی ہے۔ آج کے دور میں سیاسی معاشی ثقافتی علمی فساد کے مقابلے پر بھرپور قوت سے جواب دینا ضروری ہے۔ کیونکہ عالمی مسائل میں سب سے زیادہ جو چیز مہلک ہورہی ہے وہ اقتصادی قوت کی خاطر سیاست، میڈیا، تعلیمات، مذہب وغیرہ کو استعمال کیا جارہا ہے اور ایک عرصے سے موجود اس فاسد نظام جس میں سرمایہ داری کو دنیا کے مسائل کا مداوا بتایا جارہا ہے انتہائی مغالطے پیدا کیے جارہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری نے اپنے ابتدائی ادوار میں جن دعوؤں کو پیش کیا تھا یعنی سرمایہ داری کے ذریعے دنیا خوش حال

ہو جائے گی، ہر شخص سکھ و چین کی بنسری بجائے گا وغیرہ، پہلی اور دوسری عالمی جنگ جس میں کروڑوں انسان موت کے منہ میں چلے گئے نیز دنیا میں سیاسی، معاشی، تہذیبی، اخلاقی اور علمی مسائل بڑھتے چلے گئے۔ لہذا سرمایہ داری نظام کے دعووں اور آج کی دنیا کی حالت دونوں سے تقابل کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ روشن خیالی کے پروجیکٹ ناکام ہو چکے ہیں۔ تاریخی طور پر ہر مکتب و مذہب نے عالمی مسائل کو حل کرنے کیلئے اپنی اپنی کوششیں انجام دے دیں مگر مسائل ختم نہیں ہوئے بلکہ بڑھتے ہی چلے گئے اس سیناریو میں ایک مکتب یعنی مکتب اھلبیت علیہم السلام کو بطور نظام و سسٹم ابھی تک رائج نہیں کرنے کی صلاح دی گئی شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ وہ واحد مکتب ہے جو ہر طرح کے ظلم وفساد کی صرف باتیں نہیں کرتا بلکہ عملی طور پر اپنے تاریخی کرداروں سے الہام و جذبہ لیتے ہوئے عملی کردار کا حامل ہے۔ مگر یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مصداق ایسے ایسے ادارے جو بظاہر امن و اتحاد و مسائل کے حل کی بات کرتے ہیں عالمی اسٹیبلشمنٹ کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ چونکہ اسلام اور مکتب اھلبیت علیہم السلام خصوصا اپنے عملی کردار سے ایسے زر پرستوں کا دشمن ہے تو عالمی میڈیا کے خدا اس مکتب کو دہشت گرد کے طور پر تعارف کراتے ہیں اور اس طرح مکرر یہ پروپیگنڈہ جاری ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ اسلام کو دہشت گرد سمجھنے لگے ہیں۔ لہذا اس بیانیے کے مقابلے پر مظلوموں کو بھی اپنے داد سر مکتب یعنی اسلام کی تعلیمات کو اسی طرح جامع انداز سے نظریاتی اور عملی انداز میں پیش کرنا چاہیے تاکہ ظالم سرمایہ دار اپنے مقاصد کو حاصل نہ کر سکے۔ اخلاق ہر شعبہ میں ہونے سے

کارکردگی میں بہتری آتی ہے، نظم و ضبط قائم رہتا ہے حتیٰ جنگ و جدال اور پیسے کے حساب کتاب تک کے شعبوں میں اخلاق و تہذیب خوشحالی پیدا کرتی ہے۔ آج اقتصادی اہداف کے حصول کیلئے مغرب نے تیسری دنیا کو یرغمال بنایا ہوا ہے اور خود مغرب بھی جس خاندان و گروپ کا غلام بنا ہے وہ اپنے اقتصادی مقاصد کے حصول کیلئے ہر طرح کے ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔ آج جدید انفارمیشن کے دور میں حقیقت حال کو دیکھا جائے تو مغرب کی طاقتیں اسلام اور دیگر مذاہب کے مقابلے پر عالمی انسانی معاشرے کے شدید خطرات کا باعث ہیں, انسان کے مسائل حل کرنے کے جذاب نعروں کے پس پردہ چھپے فرعونی عزائم اور پالیسیاں دنیا کو نظر آرہی ہیں۔ یہ باتیں صرف فکری تجزیہ نہیں ہیں بلکہ زمینی حقائق ہیں کہ مغرب اس وقت عالمی انسانی سماج کیلئے ناسور بنا ہوا ہے۔ اور 20 فیصد عالمی اشرافیہ 80 فیصد انسانوں کے استحصال میں ملوث ہے۔

سامراجی ذہن، مشکلات کا سبب:

مغرب کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ مادیات کے چکر میں معنوی اقداروں کو عبث اور بے کار باور کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اور معنوی اقداروں کو اپنے مقاصد میں رکاوٹ تصور کرتے ہیں۔ اس کیلئے میڈیا کے ذریعے عالم انسانیت میں جھوٹ، دھوکے، فریب کے ذریعے کم شعور افراد کو ان کی الٰہی شناخت سے دور کرکے یہ باور کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں کہ انسان کا مقصد صرف دنیا کی دولت اور چمک دمک کا حصول ہونا چاہیے اور

آخرتِ خدا، دین وغیرہ بے کار امور ہیں۔ اچھے اور جذاب قسم کے سلوگنز کے ذریعے انسان کے ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں جبکہ ان سلوگنز کی مثال بالکل سانپ کے ظاہری خوش نمائی اور خوبصورتی کے ذریعے ہوتی ہے جس کا ظاہر بہت خوبصورت ہوتا ہے مگر اس کے اندر جان لیوا زہر بھرا ہوتا ہے۔لہذا دنیاوی امور اس وقت تک انسان کیلئے فائدے مند ہیں جب تک وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی بنیادوں سے اختلاف نہیں کرتے اور مادیات اور روحانیات میں ہم آہنگی اور اعتدال کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ علم و دانش، سیاست و معیشت، ثقافت و مذہب وغیرہ سب مادیات ہیں اور اس وقت تک یہ فائدے مند ہیں جب تک انسان کی پرہیز گاری اور تقوے کو متاثر نہیں کرتے، لہذا انسانوں کو ہر اس چھوٹی سے چھوٹی چیز سے انتہائی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جو انسان کے معتدل مزاج کے خلاف ہو۔ آج کے دور میں چونکہ طاغوت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ حملہ آور ہے تو اس موقع پر طاغوت کے ساتھ سخت رویہ رکھنے کی ضرورت ہے یہ آج کے دور کا اعتدال ہے اور ہر وہ چیز جس سے انسان متاثر ہونے لگے اس کو بہت چھان پھٹک کر اختیار کرنا چاہیے کہ دین کے نام پر کہیں ابلیسیت نہ پیش کی جارہی ہو۔ ہمیں اس امر کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے کہ دعا، درود، وتوسل کے ساتھ دوا، دارو بھی اسی شدومد کریں جس شدومد سے ہم باقی امور انجام دیتے ہیں۔ یہ مادی دنیا عالم اسباب ہے یہاں ہر کام کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے جس کی بنیاد پر کوئی عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔لہذا ظاہری حرکت و انتظام و انصرام اتنا ہی ضروری ہے جتنا دعا، درود و توسل۔۔۔۔ یہی ثواب ہے جو دنیا میں بھی اپنے اثرات رکھتا ہے اور سماجی

مسائل کے حل کرنے پر اخروی سعادت بھی ممکن بناتا ہے۔ فلکیات اور ٹیکنالوجی اور مادے پر تحقیقات اور ٹیکنالوجی کی تیاری اور اس کی فروخت وکاروبار اسی وقت فائدے مند ہو گا جب ہم عالمی سماج کی بنیادیں ضرورتیں بھی فراہم کررہے ہوں۔ ہمارا سرمایہ، تعلیم و دانش جب تک دنیا سے انسانی مسائل کو حل نہیں کرتیں تب تک ہم خود کو سپر پاور نہیں کہہ سکتے۔ انسانی مسائل کے حل میں انسانی جانوں سے خلوص ہونا چاہیے نہ کہ انسانی حقوق کے نام پر سیاسی، معاشی کاروباروں اور مادّی منافع کو فوقیت دی جاتی رہے۔ یاد رہے کہ انسانی معاشرے کی ضرورت مادی ضروریات کے ساتھ معنوی، نفسیاتی اور روحانی بھی ہیں۔ لہذا اس مورد میں صرف مذہب اور وہ بھی اسلام اور وہ بھی مذہب اہلبیتؑ اس ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنی تعلیمات میں انسانی سماج کی روحانی اور مادّی ضروریات کی تسکین کیلئے بھرپور نظام رکھتا ہے۔ ایسے منتظم کی بھی ضرورت ہے جو معارف مادّی و روحانی سے کماحقہ آگاہ ہو اور انتظامی امور کو ان اسلامی خطوط پر چلانے کیلئے مستقل ہمت و طاقت کا حامل ہو۔ افراط و تفریط سے دور رہتا ہے اور یہ عہدہ ایک جامع الشرائط کا حامل ہے لہذا کوئی عام آدمی اس عہدہ کا اہل نہیں ہو سکتا بلکہ جامع الشرائط علماء ودانشور اس کا انتخاب کریں اور اسی ولایت کے سایہ میں پھر سماج جانب کمال اپنا سفر جاری کرے۔ اس سفر کی منزل نہ مغربی ہے نہ مشرقی بلکہ وہ حوضِ سعادت ہے جس کی راہ معتدل اور صراط مستقیم ہے جو معاشرے کو دونوں جہانوں کی سعادتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

عالمی مسائل کی حقیقت

عالمی مسائل کی نشاندہی جب مغرب کے نظر سے کی جاتی ہے تو اس میں کرپٹ سرمایہ دار اشرافیہ کے اثرات نظر آتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ انہیں تیسری دنیا کے مسائل کا علم نہیں یا ادراک نہیں رکھتے بلکہ دیدہ ودانستہ حقیقی مسائل سے انحراف پیدا کیا جاتا ہے تاکہ دنیا کے انسان اس کرپٹ اشرافیہ کے انسان سوز جرائم سے آگاہ نہ ہو سکے۔

مندجہ ذیل میں حوالے کے ساتھ مغرب کی نظر سے دیکھے گئے مسائل کی فہرست ہے پھر اس پر تبصرہ ہے:

#1. Poverty. #2. Climate change, #3. Food insecurity, #4. Refugee rights, #5. COVID-19, #6. Future pandemic preparation and response, #7. Healthcare, #8. Mental health, #9. Disability rights, #10. LGBTQ+ rights, #11. Reproductive justice, #12. Children's rights, #13. Gender equality, #14. Cybersecurity, #15. Disinformation, #16. Freedom of the press, #17. Debt crises, #18. Corruption, #19. Authoritarianism, #20. Global cooperation

کیونکہ جب معاشی ناہمواری اور اقتصادی رکود کو مسئلہ گردانا جائے گا اور اس کے علل و اسباب کی طرف توجہ کی جائے گی تو لامحالہ مغربی طاقتوں کے جبر، دھونس ولی سیاست

سامنے آتی ہے۔ عالمی جہالت، انسانی اقدار اور اخلاق کو جب مسئلہ گردانا جائے گا تو اس سیاست کے مقاصد مزید واضح ہوں گے جس کے حصول کیلئے استکباری طاقتیں اپنے مفادات کیلئے تعلیم، میڈیا کو استعمال کرتی ہیں۔ جب عالمی اتحاد کے نہ ہونے کو مسئلہ سمجھا جائے گا تو اس کرپٹ سرمایہ دار کی سیاست یوں کھلتی ہے کہ انسانوں کو ہم فکر اور ہم آہنگ نہ ہونے دیا جائے کہ کہیں اس مجرم کی جڑیں کھوکھلی کرنے کیلئے عالمی سماج متحد نہ ہو جائے۔ تعلیم، سیاست اور میڈیا کے ذریعے جس diversity, pluralism وغیرہ کو فروغ دیا جارہا ہے اس کی وجہ اس کرپٹ اشرافیہ کا یہی خوف ہے۔ اسلام سے عالمی سماج کو بدظن کرنے کیلئے جس پروپیگنڈے کو شروع کیا گیا ہے وہ بھی اسی سبب سے ہے کہ اسلام ہی وہ واحد مکتب ہے جو اس اشرافیہ کی چوریوں، جھوٹ، دھوکہ وفریب، جبر، زبردستی اور دھونس کو اپنے فروعی اصول "جہاد" کے ذریعے روک سکتا ہے، اسی باعث جہاد اور مقاومت کی طرف سے انسانوں کے ذہنوں کو میلا کیا جارہا ہے اور پھر جب اسلام کو دہشت گردی سے جوڑا جارہا ہے تو اس کے مقابلے پر پلورازم اور ڈائیورسٹی کو فروغ دیا جارہا ہے تاکہ آئندہ نسلیں فکری اور عملی بانجھ ہو جائیں اور جہاد کے عنوان سے کوئی تحریک نہ چل سکے۔ عوام کے بیشتر مسائل جو سچے ہیں ان کی جب نشاندہی کی جاتی ہے تو ایک طرف اس طریقے سے خود کو عوامی درد کا چارہ گر کے عنوان سے پیش کرنا مقصود ہوتا ہے مگر جب حل کی بات کی جاتی ہے تو وہ اس قدر پیچیدہ اور خود اس کرپٹ اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے جس کو خفیہ رکھا جاتا ہے اور ظاہر بظاہر چمکتے دمکتے مسحور کن الفاظ اور جملوں کو سہارا لے کر مظلوموں کے جذبات کو

تختہ مشق بنایا جاتا ہے۔ عالمی بھوک اور غربت کا مسئلہ بتا کر بیماریوں اور موسمی آفات کے ذریعے depopulize کرنا اس مسئلہ کا ایک حل ہے جو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں پناہ گزینوں کا مسئلہ بہت سنگین ہے مگر پناہ گزین خود اس عالمی اشرافیہ کی کرپٹ حکومتوں کے پیدا کردہ مسائل سے نہیں پیدا ہو رہے؟ یہ طاقتیں کس بل اور بنیاد پر عالمی معاشروں پر جنگیں اور مسائل مسلط کرتی ہیں۔ اگر یہ اپنے کام سے کام رکھیں اور دوسرے معاشروں میں دخل اندازی بند کر دیں تو پناہ گزینوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ ہجرتوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اگر یہ عالمی معاشروں میں موجود طبیعی وسائل پر قبضہ کرنا یا انسان کو صارف سمجھنے جیسے تفکر سے باز آجائیں۔ دوسرے ممالک کی معیشتوں کو خود کنٹرول کرنے کیلئے جتنے بھی ہتھکنڈے یہ استعمال کرتے ہیں اگر اس سے باز آجائیں تو دنیا کے 70 فیصد مسائل خود بخود ختم ہو جائیں۔ صحت کے مسائل ذہنی امراض کے مسائل بھی اسی سامراجی فکر سے منسلک ہیں جس میں پروسیسڈ فوڈ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ غذائیں ان کی صنعت اور فیکٹری میں بنیں تو اس میں مضر صحت کیمیکلز کی آمیزش کرنا تاکہ ممکنہ ایسے معاشرے جہاں سے اس ظالمانہ نظام کے خلاف بغاوت کا خدشہ ہے ان کی نسلوں تک کو بانجھ کر دینا اور پروسیسڈ فود اور صحت کے نام پر ایسی ویکسینز یا ادویات بنا کر فراہم کرنا ہے جس سے ذہن اور صحت مفلوج ہو جائے اور بغاوت کا خطرہ ٹلا رہے، نیز بگ فارما جو ان کی ساجھے دار ہے اپنے منافع بناتی ہے۔ نام نہاد مسائل جو خود مسئلہ نہیں ہیں بلکہ دوسرے بنیادی مسائل پیدا ہونے کے سبب پیدا ہوئے ہیں جیسے کہ LGBT RIGHTS, REPRODUCTIVE

RIGHTS, CHILDREN'S RIGHTS, GENDER EQUALITY
ایسے مسائل ہیں جو مذہب سے دوری اور خود کو خدا سمجھنے سے پیدا ہوئے ہیں، اخلاقی اقدار کو کچرا سمجھنے کے باعث پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ کہتے ہیں کہ "غلط اطلاعات" مسئلہ ہے، میڈیا آزاد نہیں ہے یہ ایک مسئلہ ہے، مگر یہ تو خود یہ سب کر رہے ہیں۔ اس وقت پورے کرہ ارض پر 98 فیصد میڈیا (الیکٹرونک، پرنٹ، سوشل ایپس وغیرہ) سب انہی کرپٹ سرمایہ داروں کے قبضے میں ہیں تو یہ کس سے اس مسئلہ کو حل کرنے کا کہہ رہے ہیں؟ اصل بات یہی ہے کہ آہستہ آہستہ یہ فکر پیدا کی گئی کہ مذہب بے کار ہے پھر مقدسات کی توہین کا سلسلہ شروع کیا گیا، مقدس عقائد اور منطقی افکار کو سبوتاژ کیا گیا اور پھر نعرہ دیا گیا کہ میڈیا کی آزادی کے آڑ میں یہ سب کرنا ہے۔ مگر کیا میڈیا کی آزادی میں ظلم، دھوکہ، فریب، جبرو دھونس وغیرہ کے خلاف بولنے پر یہ ایسے اینکرز اور چینلز اور اخبارات کو بند نہیں کرا دیتے؟! چونکہ اس طرح کی آزاد بحث و تنقید جب ان پر کی جاتی ہے تو انہیں ہضم نہیں ہوتی اور فطری طور پر مدافعانہ جذبے کے تحت سخت ایکشن لیتے ہیں مگر مذہب، انسانی اقدار، مذہبی مقدسات کی توہین ہوتی رہے تو اس آزادی کو یہ بہت پسند کرتے ہیں۔ ایک مسئلہ ممالک کے مقروض ہونے کو گردانتے ہیں یہ بھی سچا مسئلہ ہے مگر اس کا حل اس طرح بتاتے ہیں کہ جب ان سرمایہ داروں، بینکاروں کے مفادات سے ہم آہنگی ہو جائے تو پھر قرضہ بھی معاف کر دیا جاتا ہے اور امداد کے نام پر اربوں ڈالر بھی دیئے جاتے ہیں۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اس کام کیلئے ان کے نمائندے کو طور پر کام کرتے ہیں۔ مگر یہ قرض ان

قوموں پر سے کبھی نہیں اترتا جو اپنا ایک ورلڈ ویو رکھتی ہے اور خود مختاری کے ساتھ اپنے وسائل کو استعمال کرنا چاہتی ہے اور اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہے۔ ایسی اقوام اگر اپنے نظریات اپنے فلسفے اپنی تہذیب وثقافت وغیرہ کے ابلاغ کیلئے کام کرتے ہیں تو انہیں باغی کہا جاتا ہے ان کو آرتھوڈوکس کہا جاتا ہے وغیرہ۔ اور اسی اقوام سے مقابلہ کیا جاتا ہے اور یہ پریس کی آزادی اور غلط اطلاعات کے پھیلنے کو مسئلہ بتانے والے خود ایسی خود مختار اقوام کے خلاف غلط و بے بنیاد خبریں پھیلاتے ہیں اور ناظرین اور سامعین کو مغالطہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ اپنے مفادات کے حصول کیلئے وطن فروش قسم کے لوگوں کو رشوتیں دیتے ہیں اور ملک کی اعلیٰ قیادتوں اور فوج وعدلیہ میڈیا سمیت سب کو اپنی ڈالرانہ رشوتوں سے کرپشن کو فروغ دیتے ہیں۔ اگر ان کا فلسفہ اور تفکر اور ہدف اتنا ہی خوبصورت اور ہمہ گیر اور فائدے مند ہے تو اس کیلئے تو ببانگ دہل عمل کرنا چاہیے، رشوتوں کے ذریعے کون سے ایسے اہداف حاصل کرنا مقصود ہے جس کو انسان کا ضمیر گوارا نہیں کرتا مگر اس کی وطن پرستی کو خریدنا درست سمجھا جاتا ہے۔ ایک طرف آمریت کو عالمی معاشروں کیلئے مسئلہ قرار دیتے ہیں اور اسے اس ملک کی فوج سے وابستہ قرار دیتے ہیں مگر کیا سرمائے سے بڑی آمریت بھی ہے کوئی؟ جس کو یہ ہر لمحہ ہر گھڑی تیار رکھتے ہیں اور جو کسی لالچ میں نہ آئے اسے اگلی دنیا بھیج دیا جاتا ہے۔ ان مغربی تسلط پسند طاقتوں سے زیادہ آمریت کس کے پاس ہے؟ پوری ایک تاریخ ہے جس میں ان کی آمریت رقم ہے۔ دوسری طرف عالمی روابط نہ ہونے کو یہ مسئلہ قرار دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عالمی معاشرے ان جابروں کی پالیسز سے اتفق

نہیں کرتے لہذا عالمی روابط بڑھانے کا مطلب یہ ہے کہ سب اقوام UN اور دیگر عالمی ادارے جو ان مستکبر طاقتوں کے فنڈز سے چلتے ہیں ان کی پالیسیز سے اتفاق کریں اور جو نہ کرے اسے راستے سے ہٹادیا جائے۔ کبھی اس ملک پر جنگ مسلط کر کے، کبھی بیماریاں پھیلا کر، کبھی موسمی آفات پھیلا کر اور اگر اعلیٰ قیادت مان جائے مگر اس معاشرے کی پر اثر شخصیات نہ مانیں تو ان کی مرغوب رشوت پیش کی جائے تب بھی نہ مانیں تو اقرباء کے اغواء یا موت سے خوفزدہ کیا جائے وغیرہ کسی نہ کسی طرح اپنے مفادات پر جبرا یا کراہ لایا جائے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو مغرب کی نظر سے نہیں دیکھے گئے مگر مظلوم اقوام کی آنکھ سے نظر آتے ہیں۔ مغرب کے پیش کردہ عالمی مسائل اور ان کے پوشیدہ اوصاف اس سے کہیں زیادہ گہرے اور وقیع ہیں۔

خدا ہم سب کو اپنے دین پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ دینداروں کو پیشواء رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہلبیت علیہم السلام کی سیرتوں پر عمل کرنے کے ذریعے ہم کو ہمارے مولا حضرت بقیۃ اللہ عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف کی خدمت کیلئے تیار فرمائے۔ دنیا کو عدل و عدالت سے بھر دے، ظالموں کو اگر ہدایت کے قابل نہیں تو نیست و نابود فرمادے اور تمام حق پرستوں کو منزل مقصود پر پہنچادے۔ آمین یارب العالمین

دینی حکومت کی ضرورت کیوں ہے؟

مذکورہ بالا عالمی سماجی مسائل (دیکھئے پچھلا مضمون "عالمی مسائل کی حقیقت) جب مغرب کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں تو صرف یہی مسائل نہیں ہیں بلکہ مسائل اس سے زیادہ ہیں اور سنگین نوعیت کے ہیں نیز مغربی نظر سے مسئلہ کو درک کرنے والے بہت سے مسئلے مسئلے ہیں ہی نہیں۔ اس وجہ سے نہیں کہ عوام ان سے دوچار نہیں بلکہ ان مسائل کی جڑ دوسرے مسائل ہیں یا دوسرے مسئلہ اس مسئلہ کا پیش خیمہ ہیں۔ تیسری دنیا جو کہ دنیا کے 80 فیصد انسانوں پر مشتمل ہے ان کے مسائل دنیا کی 20 فیصد اشرافیہ کے مقابلے پر بہت زیادہ ہیں۔عالمی سماج پر مقتدر طاقتیں جس ڈھٹائی کے ساتھ اپنے پست مادّی مقاصد کیلئے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر رہی ہیں اور ظاہری چمک دمک سے بھرپور علم و دانش اور سرمایہ پرستی کے فروغ میں کوشاں ہیں۔ اس کے مقابلے پر واحد اسلام کا مکتب اھلبیت علیہم السلام ہے جو انسان کے مسائل کے حل پیش کرتا ہے۔ اس کا بنیادی شعبہ حکومت و ریاستی انتظامیہ ہے جس کو مکتب اھلبیت "امامت" کے ذیل میں سماجی مسائل کے حل کے طور پر تجویز کرتا ہے۔ حکومت اور ریاستی انتظامیہ میں اہل افراد کے آنے سے ہی سماجی مسائل خواہ کسی نوعیت کے ہوں حل ہو جاتے ہیں۔ ایسے مقتدر کیلئے مومن ہونا شرط ہے اگر ایک سیکیولر اور عام مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ دین کی حکمتیں لیکر وہ معاشرے کے مسائل حل

کرلے گا اور خود چاہے دیندار ہو یا نہ ہو سماجی مسائل حل ہوجائیں گے تو وہ سخت غلطی پر ہے، لہذا اسلام سماجی مسائل کیلئے جہاں ہر شعبے میں ہدایت دیتا ہے تو سب سے زیادہ اہمیت قائد اور قیادت کے اسلامی کردار کو بھی دیتا ہے اگر قائد مومن نہیں ہے تو وہ خود مسائل بڑھانے کا سبب بنتا ہے۔

مذہبی حکومت اس مذہب کو بنانا چاہیے جو دوسرے تمام مذاہب کے ساتھ رواداری اور آزادی کو برقرار رکھے اور اس حکومتی مذہب کو دوسروں پر نافذ نہ کرے، ایسی تعلیمات جس مذہب میں ہوں وہی اس عمل کا پابند ہے کہ حکومت بنائے اور باقی دوسرے ادیان و مذاہب عقل و دانش و تجربہ کی بنیاد پر اس مذہب کو بنا کسی تعصب کے حکومت بنانے کیلئے پشت پناہی کریں۔ مذاہب کی تاریخ اور جدید حوالوں کے ساتھ اس امر کو سمجھنا آسان ہے کہ کون سا مذہب یا مکتب عادلانہ حکومت بنا سکتا ہے اور کس میں یہ سکت نہیں ہے۔ آج تک کی تاریخ کے مطالعے سے یہ واضح ہے کہ کس مذہب کا کیسا مزاج ہے، سیاسی، سماجی، علمی، سائنسی، معاشی نظاموں کو باہمی رضامندی سے کون سا مذہب یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ سب کو ساتھ لیکر چل سکے۔ انسان ساختہ مکاتب بھی بہت تجربات کر چکے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسان، کائنات، خدا، سماج، سب کو عملی اور تجرباتی انداز میں برت کا جان چکے ہیں کہ خصوصا انسان کیلئے کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری۔ اس تناظر میں مذاہب کو پرکھا جاسکتا ہے اور تجزیہ کیا جاسکتا ہے کہ نظریات کے ساتھ عملی اقدامات کرنے کی صلاحیت کس

مذہب میں ہے۔ نظری طور پر تو سب بہت اچھے کے دعوے دار ہیں مگر دیکھنا یہ ہو گا کہ عملی تجربہ کس کا کامیاب رہا ہے۔

اسلام چونکہ نظریاتی طور پر مسلمہ ضابطہ حیات ہے یعنی زندگی کے ہر شعبے میں راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ عملی طور پر طریقہ کاروں میں فرق ہے۔ اسلام کی نظر میں سماج کے انتظام انصرام کیلئے بنیادی شعبہ حکومت اور ریاستی انتظامیہ ہے۔ لہذا اس شعبہ میں صرف وہ افراد آنے چاہییں جو قوموں کی ذمہ داری اٹھانے اور ان کے مسائل کے تدارک یا حل کیلئے پر خلوص ہوں اور ریاستی مشنری کو دیانت داری، صداقت اور امانت داری جیسی صفات کے ساتھ چلانے کی بھرپور کوشش کرنے کا عہد کریں۔ جب اس شعبہ میں معتبر افراد آتے ہیں تو چونکہ وہ خداوند قدوس کو مالک و قادر اور روز حساب کتاب کا مالک سمجھتے ہیں اور ہر عمل کی مکافات پر یقین رکھتے ہیں تو پھر یا تو جنت کی خواہش میں یا مکافات کے خوف کے زیر اثر اپنی ذمہ داریاں احسن طریقہ سے ادا کرتے ہیں۔ لہذا ایسے معاشرے جہاں ایسے حاکم ہوں تو وہاں غربت، جہالت، بیماری، معذوری، حق تلفیاں، چوریاں، زبردستی اور جبر و تسلط، کرپشن، انتشار، استکبار وغیرہ دوسرے معاشروں کی نسبت کمتر سطح پر ہوتے ہیں۔ اسلام جس سماجی نظام کے نفاذ کیلئے جدوجہد کا حکم دیتا ہے اس کا مرکزی کردار وہ ریاستی یا قومی قیادت ہوتی ہے جو معاشرے کو مادّی اور معنوی تکامل کی طرف لے کر چلتی ہے لہذا اگر قیادت فاسد ہو تو معاشرے کا فاسد ہونا لازمی ہے۔ تمام قسم کے سماجی اور انسانی حقوق کی ادائیگی کا جامع منصوبہ صرف اسی وقت پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جب سماجی قیادت خدا کا

خوف، علم و شعور، شجاعت و رواداری، انصاف و غیرہ جیسی صفات کی حامل ہو گی۔ سماجی قیادت کی مثال گھر میں سرپرست و باپ کی سی ہوتی ہے اور قوم اسی کردار کی مالک ہوتی ہے جس کردار کا مالک حاکم ہوتا ہے۔ اگر عالمی سماج میں یا کسی قوم میں انتشار ہے کسی قسم کا بھی فساد ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکم نے قوم کی تربیت درست انداز میں نہیں کی ہے۔

کوئی بھی عقل مند سماجی نظم و ضبط کو برقرار رکھنے اور سماجی مسائل اور حقوق کی ادائیگی کیلئے حکومت کی ضرورت سے انکار نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اسلام جو ضابطہ حیات ہے بدرجہ اتم حکومت اور قیادت کیلئے راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ سیاست اسی باعث دین کا بنیادی شعبہ ہے۔ انسانی سماج کے مسائل کو سمجھنے کیلئے ہم کسی بھی ایک گھر کی مثال لے سکتے ہیں، کیونکہ ایک گھر یا فیملی جس طرح چلائی جاتی ہے اسی طرح پورے انسانی سماج کو اس مثال پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی گھر یا سماج میں ابتدائی طور پر خصوصا اور بعد میں عموماً تین بنیادی شعبے ہوتے ہیں جس سے گھر کی مادّی فلاح کا حساب لگایا جاسکتا ہے۔ ایک اس گھر کے سرپرست کا کردار دوسرا گھر والوں کی تعلیم اور ان کا فکری شعور و فکری بلوغت اور گھر کی معیشت و اقتصاد۔ ان تینوں میں بھی سب اہم تعلیم اور فکری و شعوری بلوغت ہے۔ اگر علم و دانش موجود ہے تو معاشی و سیاسی مسائل اتنا گھمبیر مسئلہ پیدا نہیں کرتے لیکن اگر تعلیم و شعور نہیں ہے تو ذرا ذرا سی معاشی مشکلات و سیاسی پریشانیاں گھر کے افراد کیلئے وبال جان اور مصیبت عظیم لگنے لگتی ہیں۔ لہٰذا تمام فساد کی جڑ تعلیم، علم و دانش کے حصول میں کوتاہی اور کاہلی اور فکری اور شعوری نابالغیت ہے۔

مذہبی علم و دانش اسکول کالج و یونیورسٹی کی رسمی تعلیم سے زیادہ اہم ہے یا یوں کہیں کہ اسکول یونیورسٹی کی کالج سے کم اہم نہیں ہے۔ مذہبی اعمال انسان کو خالق ارض و سماء سے جوڑے رکھتے ہیں اور سماجی رویوں میں اعتدال پیدا کرتے ہیں اور یہی اعتدال بے شمار فسادات کی روک تھام کرتا ہے۔ انسان اگر اپنے آپ سے اور اپنے خالق سے سچا ہے اور خالق کے بنائے ہوئے ارضی سماوی اور انفسی قوانین سے آگاہ ہے تو یہ دانش نہ صرف مسائل کی روک تھام کرتی ہے بلکہ اکثر موارد میں اصلاح اور فلاح کی ضامن بھی بنتی ہے۔ یعنی ایسا دینی باشعور فرد اپنے مسائل پر منفی ردعمل دکھانا تو دور کی بات، دوسروں کے مسائل کی روک تھام کرتا ہے نیز مستقبل بین نظر سے دیکھتے ہوئے آئندہ آنے والے معاشرتی مسائل کے حل کیلئے بھی جت جاتا ہے۔ لہذا جب ہم سماجی اقتدار و قیادت کی بات کرتے ہیں تو وہ ایسے ہی دینی قائد کی بات ہوتی ہے جس میں ایسا جذبہ اور خلوص ہوتا ہے جو دنیا اور دنیا کی زرق برق کی طرف رغبت نہ رکھتا ہو، مخلوق خدا سے مخلص ہو، باہمت اور باحوصلہ ہو، سازشوں کے مقابلے پر شجاعت کا حامل ہو، تدبر و تفکر و مشاورت کے ذریعے مسائل کے مثبت حل کیلئے کوشاں ہو۔ معاشرے میں علم و دانش کے فروغ کیلئے ہمہ وقت حاضر ہو۔ خود بھی آفاقی، ارضی اور انفسی قوانین قدرت سے آگاہ ہو اور دوسروں کو بھی ان قوانین کی تعلیم دیتا ہو۔ معاشرے کی بنیادی ضروریات کے ساتھ موجودہ زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں سے باخبر ہو اور ان کو پورا کرنے کیلئے انتھک جدوجہد کرنے والا ہو۔ ایسے قائد اس بہار کے زمانے کی طرح ہوتے ہیں جو کم وسائل میں دشمن کی عظیم سازشوں

اور مکر و فریب کے مقابلے پر بھی قوم کو حوصلہ، ہمت، دانش، توکل، زہد، تقوا و پرہیز گاری کے ساتھ لیکر چلتے رہتے ہیں۔ ایسے قائد اس موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہوتے ہیں جو فرعون کے مقابلے پر اپنے محدود وسائل (لاٹھی، عصاء) کے باوجود خداوند متعال کی نصرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسا معاشرے جہاں ایسے عاشقان خدا قائدین موجود ہوں وہاں سماج میں بھی ایک دوسرے سے مہربانی، عشق، رواداری، ہمدردی وغیرہ رچی بسی ہوتی ہے اور یہ عشق و مہربانی اس معرفت و دانش کی مرہون منت ہوتی ہے جس کیلئے محنت کی گئی ہوتی ہے۔ ایسے معاشرے میں مادیات کو بطور وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے، معنویات کے حصول کی خاطر ترجیحات رکھی جاتی ہیں۔ ایسے خدائی عشق زدہ معاشرے میں قانون اور سزا سے بچنے کیلئے نیک نہیں بنا جاتا بلکہ ہر فرد اپنی خدائی ذمہ داری کا تعین کرتا ہے اور اس کو اپنے شوق اور خلوص سے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی قیادت کی حکومتی مشنری بھی صداقت، دیانت اور امانت کی عکاس ہوتی ہے اور یوں سماجی مسائل کم سے کم سطح پر آجاتے ہیں۔ لہذا ایسی قیادت کو بنانے کیلئے جس تعلیم اور ماحول اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں آج درکار ہے اور اس تربیت کیلئے ہماری ماؤں کے ساتھ دیگر سرپرستوں کی بھی ذمہ داری ہے کہ ایسے افراد تیار کریں جو آئندہ معاشرے کی باگ ڈور ان خطوط پر چلائیں۔ یہ پورا ایک پروسس ہے جس میں جلدی نتیجہ نہیں آتا ہے اور خداوند متعال کی نصرت کے ساتھ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔

ظالموں اور ستمگروں کے خلاف قیام کرنا اور مظلوموں اور کمزوروں کے حصولِ حقوق کیلئے حکومت سب سے مؤثر وسیلہ ہے

مظلوموں اور مستضعفوں کی مدد کرنے کیلئے ہر حلال وسیلہ استعمال کرنے کا حکم

آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ تم جنگ نہیں کرتے راہ خدا میں اور ان کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو فریاد کر رہے ہیں۔ پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال دے۔ جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارے لئے کوئی سرپرست اور حامی و مددگار بنا۔

(سورہ نساء /75)

مظلوموں، کمزوروں کی مدد کرنا الٰہی خدائی حکم ہے

بے شک فرعون زمین (مصر) میں سرکش ہو گیا تھا اور اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اس نے ان میں سے ایک گروہ کو کمزور بنا رکھا تھا(چنانچہ) ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتا تھا اور ان کی عورتوں (لڑکیوں) کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ بے شک وہ (زمین میں) فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنہیں زمین میں کمزور کر دیا گیا تھا اور انہیں پیشوا بنائیں اور انہیں (زمین کا) وارث قرار دیں۔ اور انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں اور فرعون، ہامان اور ان کی فوجوں کو ان (کمزوروں) کی جانب سے وہ کچھ دکھلائیں جس سے وہ ڈرتے تھے۔ (سورہ قصص /5،6)

مستضعفوں کی قیادت کرنے پر منکرین کا اعتراض

اس پر ان کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ (اے نوح) ہم تو تمہیں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتے کہ تم ہم جیسے ایک انسان ہو۔ اور ہم تو یہی دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ہے وہ ہم میں سے بالکل رذیل لوگ ہیں اور انہوں نے بھی بے سوچے سمجھے سرسری رائے سے کی ہے اور ہم تم میں اپنے اوپر کوئی برتری نہیں دیکھتے بلکہ تم لوگوں کو جھوٹا خیال کرتے ہیں۔(سورہ ھود /27)

مظلوموں اور بے کسوں کی مدد کرنے کا پہلا فریضہ خداوند تعالیٰ کا ہے کیوں وہی تمام جہانوں کا پالنہار ہے، سختیاں اور رکاوٹیں اُسی کے دم سے دور ہوتی ہیں اور خداوند تعالیٰ ہی کی مدد اور استعانت کسی مظلوم فرد یا قوم کیلئے کسی مددگار یا رہبر و قائد کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ جدید دور کی ظلمتیں اور تاریکیاں بظاہر بہت دلفریب اور پرلطف نظر آتی ہیں مگر اِن امور میں آخرت کی تلخی اور عذاب چھپا ہوتا ہے، سیاست، ثقافت و میڈیا، معاشی معاملات، تعلیمی معاملات وغیرہ

حکومت حقوق کی ادائیگی کا غصب کرنے میں بنیادی وسیلہ ہے لہذا حقوق کے حصول یا ادائیگی کیلئے سب سے موثر ذریعہ حکومت ہے۔ ہر طبعی معاملہ میں جہاں انسانی عقل وضمیر فیصلہ کرسکے اُس میں قرآن و حدیث کو اسے فطرت کے قانون کے تحت حل کرنا ہے، حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: عقل نبی باطن ہے، نیز خود انسانی تجربات بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ ظاہر میں نبی کی پہچان یہی نبی باطن کرتی ہے۔ اسلام طبعی و فطری ضروریات کو پورا کرنے کے سلیقے، تہذیب و اخلاقی قاعدوں سے آگاہ کرتے ہیں جو عقل

فطری کے بعد عقل کسبی میں اضافہ کے ساتھ بھی درک کیے جاسکتے ہیں۔ دشمن حملہ آور ہو، مال و اسباب لوٹا جارہا ہو، خاندان اسیر کیا جارہا ہو، انسانوں کے موت گھاٹ اتار اجارہا ہو اور وہ بھی صرف ہوس نفسانی اور پست مقاصد کی تکمیل کی خاطر، اس موقع پر اپنایا مظلوموں و بیکسوں کا دفاع عقلی و فطری اور ضمیر کی آواز ہے، اسلامی منابع بھی اسی کی تائید کرتے ہیں، جیسے کہ اوپر کی چند آیات میں واضح کیا گیا۔ البتہ آج کے جدید استعماری ہتھکنڈوں جن کی ابتدا قرون وسطیٰ میں یورپی انسانوں کے بحری سفروں سے شروع ہوتی ہے اور مابعد جدید دور میں سرمایہ داری، اشتراکیت، اشتمالیت کی صورت میں انسانی حقوق کو غصب کیا جارہا ہے جس کو کوئی بھی پڑھا لکھا شخص دقیق طور پر درک کر سکتا ہے مگر کمزور عوام اس کو زمانے کی ستم ظریفی قرار دے کر سہہ جاتے ہیں اور حقیقی انسان دشمنوں کی معرفت سے دور رہتے ہیں۔ انہی سیاسی، معاشی، ثقافتی و تہذیبی، تعلیمی دہشت گردی کے آگے بند باندھنا ایسی صورت میں کہ جب حجت خدا، حضرت ولی العصر (عج) غیبت میں ہیں ہر ذمہ دار قرآنی نشانیوں کو اپنا راہنما ماننے والے پر لازم ہے کہ مظلوموں کی مدد اور استعانت کیلئے کوشش کرے، یقیناً یہ کام حضرت حجت (عج) کا ہے لیکن وہ صرف تنہا اس کام کیلئے مقرر نہیں کیے گئے بلکہ مومنین اور مستضعفین پر بھی لازم ہے کہ اُن کی نصرت کیلئے اپنی اور اپنی آئندہ نسلوں کے بہتر مستقبل کیلئے اور دیگر انسانوں کی ظلم و ستم کے شکنجوں سے نجات کیلئے کوشش کریں۔ اس زمانہ غیبت میں سب سے زیادہ ذمہ داری اُس فقیہ کی ہے جو اس بات کی اہلیت بھی اپنے اندر پائے نیز اسقدر حواری دستیاب ہوں جو اس ظلم و ستم کشی میں اُس کی معاونت کر سکیں تو اُس پر واجب ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ البتہ جس فرد یا قوم و گروہ کے پاس ایسا فقیہ یا مومن دستیاب نہ ہو تو اُن کیلئے ہجرت

کرنا زیادہ بہتر ہے تاکہ اپنے دین، اپنے دست نگروں، اپنی آئندہ نسلوں کیلئے عقیدہ کو قائم رکھ سکیں اور اس ظلم و ستم کے شکنجوں سے نبرد آئندہ یا کسی ایسے فرد یا قوم کیلئے رکھ چھوڑیں جو قیام کی عقلی و شرعی شرائط پر پورا اتریں گے۔ ظلم و ستم کی بیخ کنی کیلئے طاقت کے مرکز کے عنوان کے تحت اگر حکومت میں شرکت حاصل کرنا، حکومت کا تختہ الٹنا ضروری ہو تو واجب ہے کہ فقیہ یا مومن فرد / افراد گروہ اس امر کیلئے کوشش کرے اور مرحلہ وار کام کرے نیز مخلوقات کی فلاح و بہبود جس میں اولیت انسان کو حاصل ہے کی خاطر ہر نیک نیت کے ساتھ روبہ عمل ہونا واجب ہے۔ خواہ اس عمل کا دائرہ کار حکومت میں شرکت یا حصول، تعلیمی جدتوں کا لانا، معاشی علوم کے ذریعے جدید پالیسیوں کی تیاری، ثقافتی و تہذیبی ارتقاء کیلئے ذرائع ابلاغ میں جدتیں لانا ہو۔ وغیرہ

دنیا کے مسائل اور ہمارا کردار

کہا جاتا ہے کہ مذہب اور علم بشریات کے ادغام سے اور اس کے دیگر شعبوں کی مدد سے گزشتہ چند عشروں سے جو روشنی سارے عالم میں پھیلی ہے اس سے کئی ہوش مندوں نے بہت گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ جس کی بنا پر کئی نئے فکری مباحث سامنے آئے ہیں کہ ہم آج کیسی دنیا چاہتے ہیں۔ ایک ایسی خوبصورت پُرامن اور رواداردنیا جس کا وجود ممکنات میں سے ہے۔

جدید دور کی پریشانیاں، مصائب، بلائیں، آفات جو معیشت میں آفت آجانے کے بعد سے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کررہی ہیں۔ ان کی ابتداء اٹھارویں صدی عیسوی میں الیومیناٹی تنظیم کی بنیاد رکھنے کے بعد سے وقوع پذیر ہونا شروع ہوئیں اور رفتہ رفتہ قدم بقدم انسانوں کی کم ہمتی، جہالت، درست رہبروں کو عدم اطاعت وغیرہ کے باعث ہر سو عالم میں اپنے پنجے گاڑتی چلی گئیں۔

آج کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے ممالک خوراک جیسی بنیادی ضرورت سے بھی زیادہ رقم اسلحہ کی خریداری یا اشرافیہ کی ضرورت کیلئے ٹیکنالوجی کی تحقیقات اور صنعتوں پر خرچ کررہے ہیں۔ موجودہ دنیا ایک محتاط اندازے کے مطابق سالانہ 15 سے 20 ٹریلین

امریکن ڈالر ہتھیاروں پر ضائع کرتی ہے۔ یا70 بلین ڈالر سے زیادہ مریخ پر تحقیقات یا ٹیکنالوجی کی صنعت سے وابستہ علوم پر ضائع کرتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یوں گنوائی جانے والی رقم دنیا بھر میں پھیلی 80٪ آبادی سے بھوک و ننگ، جہالت اور بیماریوں سے چھٹکارے پر خرچ کی جاتی۔

کسی کو خبر بھی ہے؟ کہ دنیا میں ہر 39 سال بعد آبادی کا بوجھ بڑھ کر دوگنا ہوجاتا ہے۔ ہم جیسے ترقی پذیر تیسری دنیا کے ممالک میں تو یہ اضافہ 25 سال سے بھی کم عرصے میں مکمل ہوجاتا ہے۔ بڑھتے ہوئے اسلحہ کے ڈھیر کا عالم یہ ہوگیا ہے کہ دنیا کے ہر ایک آدمی کو درجنوں مرتبہ مارا جاسکتا ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والی سائنسی تحقیقات پر خرچ ہونے والے رقم دنیا کی غربت، جہالت اور ننگ و بھوک کو100 دفعہ ختم کیا جاسکتا ہے۔ دنیا بھر میں40 فیصد خفیہ فنڈز اسلحہ بنانے کے منصوبوں کیلئے مخصوص ہیں کیا ہی بھلا ہوتا کہ یہ فنڈز زراعت ، میڈیکل انجینئرنگ اور دیگر فنون سکھانے اور ان کی تعلیم پر لگائے جاتے تاکہ دنیا سے بے روزگاری دور ہوتی۔ اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور یونیسکو فوجوں اور ناٹو جیسے سیکیورٹی کے اداروں کے بجائے تعلیم، ادب، فنون، صحت، غذا، صفائی ستھرائی اور صحت مند تفریح کے بلند و بانگ دعووں کے بجائے حقیقت میں ان شعبوں کی سرپرستی کررہے ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

پوری دنیا میں انسانی حقوق کے دعوے دار خود ان کے مضحکہ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ نسل کشی، مذہبی و نسلی منافرت، سیاسی و لسانی مناقشات ایسے قبیح افعال یوں رائج ہیں جیسے کوئی

دستور، کوئی بھی سوال اٹھانے کو تیار نہیں۔ سالانہ 6 سے 10 ملین بچے دنیا بھر میں پینے کے صاف پانی کی عدم دستیابی کے سبب سے مر جاتے ہیں۔ قریب قریب 5 سو ملین لوگ ٹراکوما جیسے موذی مرض کا شکار ہیں جو عموماً اندھے پن میں بدل جاتی ہے۔ صرف افریقہ میں سالانہ ملیریا سے مرنے والے بچوں کی تعداد قریب ایک ملین ہے۔ تیسری دنیا جو قدرتی وسائل اور صنعتوں کے خام مال سے بھرپور ہے کے 25 ممالک میں شرح خوانگی 20 فیصد یا اس سے بھی کم ہے اور اس وقت دنیا میں ناخواندہ لوگوں کی تعداد ایک ہزار ملین ہے۔ دوسری طرف عالمی اشرافیہ کی آنے والی 8 نسلیں تک انشورڈ ہیں، دولت کا ایسا انبار ہے کہ 300 فٹ زیر زمین بلڈنگز سونے کی اینٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ 2 فیصد اشرافیہ دنیا کے ہر ملک کی معیشت، حکومت کو کنٹرول کر رہی ہے اور ان کے ایجنٹ جو حکومتوں کے سربراہوں، مرکزی بینکوں کے صدور، فوج کے سالاروں، میڈیا ناخداؤں کی صورت میں ایسے ایسے دکھاوے کے فلسفے اور نعرے تخلیق کرتے ہیں کہ جس پر ہر شخص مر مٹتا ہے مگر جس سے مسائل آج تک کم نہیں ہوئے۔ مہنگائی کا تباہ کن دیو پوری دنیا میں خصوصاً تیسری دنیا کو ہڑپ کر رہا ہے۔ آج بھی کہیں پر بین الاقوامی انصاف کے قانون کے نفاذ کا کوئی آسرا دکھائی نہیں دیتا۔ کریمنل کورٹ کے معیارات بھی وہ ہیں جس سے خاص طبقے کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ان کے تمام منصوبے اور ذیلی ادارے سب کے سب دنیا کی ایک فیصد اشرافیہ کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ مگر دنیا کے مظلوموں و کمزروں، ضعیفوں کو بچانے اور ان کی زندگی کیلئے کوئی منصوبہ نہیں ہے۔ بین

الاقوامی سطح پر طوائف الملوکی پوری شد و مد سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ کیا عجیب ہے کہ حفاظت و تحفظ کے نام پر فوجیں بنائی جاتی ہیں مگر یہی افواج دنیا بھر میں دہشت و بربریت پھیلاتی ہیں، دنیا کی معاشی فلاح کے منصوبے بنتے ہیں اور بظاہر بہت جذاب ہوتے ہیں مگر عملا صرف غربت، مہنگائی، افراط زر، بے روزگاری، صنعتوں کی بندشوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ انٹرٹینمنٹ کے ذریعے صحت مند تفریح فراہم کرنے کے بجائے کارپوریشنوں کی مضر صحت، مضر معیشت مصنوعات کی فروخت نیز دیگر پروگرامز کے ذریعے ابتذال اور فحاشی کو فروغ دے کر فحش مصنوعات اور کاروباروں کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اخبار اور خبروں کے ذریعے خاص عالمی سرمایہ دار فسادی ٹولے کے مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے۔

تعلیم کے نام پر جھوٹ اور دنیا کے اصل مسائل سے روگردان کرکے پیسہ کمانے والے روبوٹ تیار کیے جاتے ہیں۔ خواتین کے حقوق کے نام پر خواتین کو فطری شعبے سے بیدخل کرکے میڈیا کی طوائف یا صنعتی دفتروں کی رکھیل بنا دیا ہے۔ پروفیشنل ازم کے نام پر خواتین کا استحصال، جنسی درندگی، خاندانی تباہی، غربت، کاہلی، جہالت جو اسی عالمی سرمایہ دار فسادی اسٹیبلشمنٹ نے پیدا کی ہے خواتین کو گھروں سے باہر نکال کر کرہ زمین کو چکلے میں تبدیل کر دیا ہے۔ ماں، بہن، بیٹی، بہو اور دیگر خاندانی رشتوں کی تباہی کے بعد عورت صرف ایک کموڈیٹی بن گئی ہے۔

عالم طبیعت کو صنعتوں کے فضلے نے تباہ کر دیا ہے۔ جنگلات تہس نہس کر دیئے گئے، کارخانوں سے خارج ہونے والی تابکار اور زہریلی گیسوں نے آسمان سے لیکر زمین کی گہرائی، سمندروں، دریاؤں سب کو مسموم کر دیا ہے مگر سرمایہ دار کی صنعت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر کے کاغذی نوٹ بنانے میں مصروف ہے۔

صحت کے شعبے میں جعلی امراض پیدا کر کے ان کی ادویات کی تیاری اور بیچنے تک یہ پوری انڈسٹری ٹریلین ڈالر کی ہے۔

پروسسڈ اور انڈسٹریل فوڈ میں مضر صحت کیمکلز شامل کر کے خاص اقوام کو مریض بنانا اور ناکارہ انسانوں میں تبدیل کرنے کے پروگرام چل رہے ہیں۔ مذہب کے پیروکاروں کو پیروں فقیروں تعویذ گنڈوں میں پھنسا دیا ہے اور مذہب جو خلقت ارض و سماء کے وقت سے مظلوم کی حمایت اور ظالم کی سرکوبی کا کام انجام دیتا تھا اس یہ عمل چھین کر دعاؤں، ماتموں اور عبادت گاہوں میں محصور کر دیا تاکہ عالمی ابلیسیت کے ننگے ناچ پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔ دہشت گردی کو بھی مذہب سے جوڑ کر مذاہب کو بدنام کرنا اسی سرمایہ داری کا کرتب ہے۔

ہم سب اپنے مستقبل کے بارے میں پریشان تو ہیں مگر اس ابلیسی نظام کے خلاف انسان دوستی، روحانیت، محبت، الفت، رواداری، الہیات، تقوا، جہاد، تعلیم و تہذیب کو فروغ دے کر اثر انداز نہیں۔۔۔ ہم سازشوں کی جڑوں سے واقف نہیں اور اگر واقف ہیں تو اس

سازش میں شریک ہیں، بظاہر ہم بہت بہادر اور باہمت بنتے ہوں مگر خود غرضی، راحت طلبی، آرام طلبی، آسانیوں میں رہنے کی فکر میں رہتے ہیں اور جو اس حوالے سے فکر مند ہیں اور دنیا کو عدل و انصاف کا گہوارہ بنتے دیکھنا چاہتے ہیں ان کے رابطے کمزور ہیں وسائل کمیاب ہیں یا شاید اس لئے کہ ہم سب نے یہ فرض کر لیا ہے کہ بطور ایک فرد کے ہم وسیع پیمانے پر کسی بھی طرح کے معاملات و واقعات کو متاثر نہیں کر سکتے۔ اور یہ ہماری غلطی ہے!

اجتماعی جدوجہد: کامیابی کا مؤثر وسیلہ

جدید دور میں، انفرادیت کو اکثر اجتماعی مقاصد کے مقابلے پر ذاتی آزادی اور فردی اظہار رائے کی برتر یکے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ تاہم، اس امر کے درمیان، ایک زہر آلود عنصر چھپا ہے جو سماجی تحریکوں اور سیاسی ترقی کو خطرات سے دوچار کرتا ہے: الگ تھلگ زندگی یعنی جیسے جیسے افراد سماجی جدوجہد سے لاتعلق اپنے ذاتی حلقوں میں پناہ لیتے ہیں حجلہ نشینی میں چلے جاتے ہیں، سیاسی تحریکوں کی طاقت کم ہو جاتی ہے، جبکہ اجتماعی عمل کی طاقت اور ٹیم ورک کی اہمیت ہی حقیقی سماجی تبدیلی کا بنیادی رکن ہے۔

معتدل رویوں کا دعوا کرنے والے انفرادیت کو فروغ دیتے ہیں، البتہ انفرادیت جہاں تخلیقی صلاحیت، جدت اور ذاتی نشو و نما کو فروغ دے سکتی ہے وہیں جب حد سے گذر جائے، تو یہ ایک زہریلی اور نقصان دہ تنہائی کی طرف لے جاتی ہے جو افراد کو معاشرے میں پیش آنے والے وسیع تر چیلنجوں میں اندھا کر دیتی ہے۔ ذاتی کامیابی اور خودی کی تکمیل کے حصول میں، بہت سے خود ساختہ افراد تنہائی کے حلقوں میں پناہ لے لیتے ہیں، دنیا کی تلخ حقیقتوں سے محفوظ۔ یہ تنہائی بے حسی پیدا کرتی ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ افراد اپنے ساتھی انسانوں کی جدوجہد سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے۔ انفرادیت کی یہ حرکت خود پسندی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انفرادیت کا فروغ اکثر مقابلے کی فضا پیدا کرتی ہے اور خود غرضی کے احساس کو فروغ دیتی ہے، جہاں کامیابی کو صرف ذاتی کامیابی سے ناپا جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں یکجہتی

اور اجتماعیت ایک اجنبی تصور بن جاتا ہے، اور اجتماعی جدوجہد کے خیال کو فرسودہ خیال جان کر ترک کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوچ نہ صرف کمیونٹی کے بندھنوں کو کمزور کرتی ہے، سماجی تحریکوں کی بنیاد کو بھی نقصان پہنچاتی ہے اور مستقل تنہائی نفسیاتی امراض اور اخلاقی رذالتوں کا بھی سبب بن جاتی ہے۔، جبکہ سماجی حقوق کے حصول میں کامیابی، فردی نفسیاتی و جسمانی فلاح، اتحاد اور مشترکہ مقاصد کی طاقت اجتماعیت سے ہی ممکن ہے۔

اجتماعی جدوجہد اور ٹیم ورک کسی بھی کامیاب سماجی و سیاسی تحریک کے دل ہوتے ہیں۔ تاریخ عام لوگوں کی مثالوں سے بھری پڑی ہے جو ظالمانہ نظاموں کو چیلنج کرنے اور معنی خیز تبدیلی لانے کے لیے اکٹھے ہوئے۔ شہری حقوق کی تحریک سے لے کر مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق کی لڑائی تک، ترقی ہمیشہ ایک مشترکہ مقصد میں متحد باعزم افراد کے اجتماعی عمل سے چلتی رہی ہے۔

اجتماعی جدوجہد کی طاقت کی ایک سب سے اچھی تاریخی مثال انبیاء علیہم السلام کی تحاریک ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحریک ہے، کربلا کی تحریک ہے اور جدید دور میں جیسے امام خمینیؒ کی عالمی استعمار ستیز اسلامی تحریک ہے، مغرب میں مزدور تحریک ہے۔ ہڑتالوں، مظاہروں اور مشترکہ مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کے ذریعے، انھوں نے اقتدار کی مضبوط طاقتوں کا مقابلہ کیا اور وہ فتوحات حاصل کی ہیں جنھوں نے کروڑوں لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنایا۔ دنیا بھر کی سیاسی تحریکوں نے اجتماعی عمل کی طاقت کو استعمال کیا ہے تاکہ آمرانہ حکومتوں کو چیلنج کیا جائے، جمہوری نظریات کو آگے بڑھایا جائے اور سماجی انصاف کو فروغ دیا جائے۔ چاہے وہ ایران میں اسلامی انقلاب ہو، عرب بہار کی بغاوتیں

ہوں یا Black Lives Matter تحریک یا غزہ کے مسلمانوں کی جدوجہد ہو یا یمنی حوثیوں کی اجتماعی مقاومت، ان تحریکوں نے مشترکہ تعاون کی طاقت کو تبدیلی لاکر ثابت کیا ہے کہ اجتماعیت اور مشترکہ جدوجہد کے بغیر حقوق حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

نظام امامت کے نفاذ میں بھی اجتماعی قبولیت کی شرط مشترکہ تعاون کی اہمیت کو واضح کرتی ہے، نیز چند افراد یا گروہوں کی تسلط طلبی کے مقابلے پر یہی سماجی مشترکہ مسائل اور ان کے حل پر ہم فکری ہی ہوتی ہے جو آپسی تعاون و ہم راہی کے ساتھ طاغوت و باطل کی طاقت کو ناکام بناتی ہے۔ ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اگر معاشرہ اجتماعی جدوجہد پر تیار نہ ہورہا ہو تب پھر انفرادی ادائیگیٔ ذمہ داری کے تحت انسان کو اکیلئے ہی کھڑا ہو جانا چاہیے تاکہ انسان کم از کم اپنی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جائے، اس عمل کی مثالیں بھی تاریخ میں موجود ہیں جب معاشرے نے مصلح قوت کا ساتھ نہ دیا اور قعر مذلت میں جا گریں اور صدیوں ان پر ذلت چھائی رہی۔ اصل مقاصد کی کامیابی کیلئے سماجی جدوجہد ہی لازم ہے مگر سماج کی ہمفکری اور ہمراہی کے بغیر خدا کے حضور جوابدہی کیلئے ایسے انسان کو اکیلئے ہی شہادت دینی پڑتی ہے جو فکری قوت کے ساتھ مصلح کا کردار رکھتا ہے۔

آج جدید دور میں بھی ماضی کی اجتماعی جدوجہد کے اثرات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم تنہا رہنے سے زیادہ سماجی طور پر طاقتور ہیں۔ یہ عمل ان لوگوں کے ساتھ جو پسماندہ، مظلوم، مستضعف، کمزور اور مساکین ہیں، کی آوازوں کو بلند کرنا ہے اور ظلم کے نظاموں کو ختم کرنے کے لیے مل کر کام کرنا ہے۔ اس کے لیے ہمدردی، رحم، اور ذاتی مفادات، ذاتی سکون وراحت کو عمومی فلاح کے لیے پس پشت ڈالنے کی ضرورت ہے۔

خلاصتاً، جبکہ انفرادیت کا معاشرے میں اپنا ایک مقام ہے، اسے ہماری باہمی وابستگی اور مشترکہ انسانیت اور مشترکہ مسائل سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ الگ تھلگ زندگی ایک زہر ہے جو سیاسی تحریکوں کی تازگی اور معنی خیز سماجی تبدیلی کے امکانات کو کم کرتا ہے۔ مشترکہ مقاصد کے تحت اجتماعی جدوجہد اور ٹیم ورک کو اپناتے ہوئے، ہم ان تفرقہ بازیوں پر قابو پاسکتے ہیں جو ہمیں تقسیم کرتی ہیں اور اجتماعی تحریکوں کے ذریعے ہم منصفانہ اور مساوی دنیا تخلیق کرسکتے ہیں۔

دین! ذریعہ نجات و آزادی

دین کو بطور نظام لینے کے بجائے جب تک ہم اس کے ثقافتی شعائروں سے تسکین لیتے رہیں گے نہ تو ہماری دنیا بہتر ہو گی نہ ہی یہ دین آخرت میں کام آئے گا۔ نظام سے مراد گھریلو، سماجی، معاشی، علمی، سیاسی، بین الاقوامی وغیرہ کے شعبوں میں امامت کی مرکزیت کے جھنڈے تلے منظم طور طریقے ہیں، کامیابی کے اسباب میں امامِ عادل کی اطاعت مرکزی حیثیت رکھتی ہے، جو کہ انسانوں کی بصیرت و دانش پر منحصر ہے یعنی ان کا اپنا انتخاب بھی ہو، جو خود انسانی سماج کے عادل ہونے پر دلالت رکھتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور تک انسانی شعور کی تاریخ منظم سماج کو درک کر لینے کے بعد اس امر کی متقاضی ہو گئی کہ سماج کا حاکم دیانت دار، شجاع، صادق، امانت دار اور دیگر بیش قیمت اخلاقی کرداروں کا حامل ہونا چاہیے۔ اسی حکومت و حاکمیت کے تناظر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت کے ساتھ امامت کا منصب بھی دیا گیا اور اسی امامت کو اگلے زمانے میں معصوم قائدین کے سپرد کر کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے من کنت مولا فھذا علی مولا کہہ کر یہ بتا دیا کہ قرآن کلیات سمجھا دیتا ہے مگر ان کلیات و تعلیمات سے نظم و ضبط قائم کرنا معاشرے کو فطری تقاضوں یعنی دینی اصولوں پر

منظم کرنا اور نظام تشکیل دینا امامت کے شعبے سے وابستہ ہے، تاکہ آئندہ معاشرہ تمام اخلاقی صفات کے حامل شخص کی سربراہی میں اپنا تکامل حاصل کرے اور دنیاو آخرت کی سعادتوں سے ہمکنار ہو۔ قرآن کی حکمتیں، استعارے، کنائے اور تشبیہات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فرامین مقدس سے روشن کیا اور معاشرے کی مرکزی اکائی "امامت" سے متمسک رہنے کیلئے بھرپور راہنمائی فرمادی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکومتِ اسلامی قائم ہونے کے ساتھ انسانی معاشرے میں اس انقلابی فکر نے شعور انسانی میں جگہ بنائی کہ خدا اپنے نمائندوں کے ذریعے معاشرے کو منظم کرتا ہے جبکہ قدیم مذاہب اور غیر مذہبی افکار کے تناظر میں مذہب صرف چند سکون آور رسوم کی عبادات کا مرقع تھا جبکہ انبیاء علیہم السلام دین کے ذریعے معاشرے کے انتظام و انصرام چاہتے تھے۔

جس دور میں ہندوستانی مذاہب، رومی اور فارسی مذاہب جو حکومت و انتظام کی مذہبی تعلیمات سے بے بہرہ تھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن و اہلبیت علیہم السلام کی زندگی کو بطور نمونہ پیش کرکے اس مغالطہ کو دور کیا کہ دین صرف خانقاہوں، مزاروں یا معبدوں میں تسکین آور مقدس عبادتوں کے علاوہ انسانی سماج کے نظم کی برقراری اور معاشرتی و اجتماعی امور کو منظم کرنے کو بھی عبادت گردانتا ہے۔مکہ میں حکومت قائم ہونے کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت تبلیغ، تربیت، فکر سازی، اصلاح نفس کی اسٹریٹیجی سے مملو رہی اور آپ نے کبھی بھی فکری جمود اور شعوری

انجماد کو تلوار کے زور سے توڑنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ ابتدائی طور پر تبلیغ، تربیت اور فکری مہمیز سے کام لیا، ابتدائی جنگیں دفاعی تھیں اور فتح مکہ کے بعد عالمی فتح اور غلبہ دین کیلئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اسٹریٹیجی اپنائی جو منہج اختیار کیا وہ یہی تھا کہ فکروں کو جھنجوڑا جائے۔۔۔ دوران غیبتِ امام عصرعج، ولایت فقیہ جو منہج نبوی ص اور اھلبیت ع کو فالو کرتے ہیں ان میں کثیر تعداد وہ شیعہ حضرات ہیں جو تربیتی منہج کے پیروکار ہیں اور اسی الٰہی منہج کو جو عقل و شریعت سے بھی ہم آہنگ ہے اس امر میں کامیاب ہوئے کہ ایران میں اسلامی حکومت بنائیں۔۔۔ منہج نبوی ص و اھلبیت ع دو مراحل پر مشتمل ہے پہلا مکی مرحلہ یعنی ذہن سازی، ذہنی قبولیت کا دور دوسرا مرحلہ مدنی مرحلہ ہے۔۔۔ جس میں نظام کے نفاذ و قیام اور انتظام کے امور ہیں۔۔۔۔ قرآن کریم کی منہج نزول یعنی ترتیب نزولی جو ایک طرح رسول اکرم ص کی وحیانی سیرت بھی ہے منہج رسول ص اور ہدایات الٰہی برائے غلبہ دین ہمارے پاس نمونے اور ہدایت کے کافی شافی دستور کے ساتھ موجود ہیں۔۔۔

منہج نبوی و اھلبیت کے مطابق اسلام کی تبلیغ تربیتی نظام سے منسلک ہے جس میں اصلاح کی کوشش آخری وقت تک کی جاتی تا آنکہ انسان اتنا بدقماش ہو جائے جو سزا کے علاوہ سدھرنے کے لائق ہی نہ رہے۔۔۔۔ منہج نبوی و اھلبیت زبردستی اور تشدد اور قتل و قتال کا قائل نہیں عسکری جہاد قلمی فکری تعلیمی جہاد اور شعوری تربیت کے بعد کا مرحلہ ہوتا ہے جیسے بالائی سطور میں بتایا گیا۔

سطور بالا کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سے یا کچھ پہلے سے انسانی سماج کا مطالبہ انسانی شعور کی بالیدگی کے ساتھ منظم حکومت اور منظم سماج کیلئے پیدا ہو چکا تھا اور دین کو خانقاہوں، معبدوں سے نکال کر عائلی اور اجتماعی نظام کی تنظیم کیلئے آمادہ کر چکا تھا۔ لہذا آج بطور خصوص بھلا کیسے دین صرف مسجدوں کے سجدوں، خانقاہوں کی منقبتوں اور نعتوں، مزاروں پر حاضریوں، محرم میں نیاز و سبیلوں سے مربوط رہ سکتا ہے۔ کیا آج خدا کے دشمن موجود نہیں؟ کیا آج انسان کی سعادتوں کے دشمن ناپید ہو چکے ہیں؟ کیا آج انسانی سماج کو تنظیم اور صراط مستقیم (stream line) ہونے کی ضرورت نہیں؟ یہی دنیا کا سماج ہے جو آخرت کی کھیتی ہے، جس کی دنیا خراب ہو گی وہ کیسے اس دنیا سے آخرت کا زادِ راہ حاصل کر سکتا ہے؟

تسکین قلب بغیر معرفت کے کیسے ہو سکتی ہے؟ علم و دانش کے بغیر کوئی فرد یا معاشرہ بھلا کس طرح دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل کر سکتا ہے؟

اصل دشمن اور ان کے نوکر دوست نما دشمن (منافق) کی شناخت اور اس کارکود کیے بغیر کب بھلا کوئی قوم و معاشرہ آگے بڑھ سکتا ہے؟

دشمنان اسلام ہی دراصل دشمنان انسانیت ہیں۔۔۔ اسلام و انسانیت، دین و ترقی الگ الگ راستے نہیں ہیں، آخرت اسی دنیا سے مربوط ہے۔۔۔ اسی دنیا میں نیک اعمال آخرت کی کامیابی ہیں۔ نیک اعمال صرف مسجد، خانقاہ، مزار، لنگر، نعت و منقبت و نوحے سے مربوط

نہیں بلکہ انسانی سماج کی فلاح و بہبود سے بھی وابستہ ہیں، انفرادی نہیں۔۔۔ بلکہ اجتماعی طور پر مستحکم حکومت ہی ایسی پوزیشن میں ہوتی ہے کہ سماج کی فلاح و بہبود کیلئے انتظام و انصرام کرسکے۔ لہذا دینی حکومت کیلئے جدوجہد غیر دینی حکومت کیلئے محنت سے زیادہ افضل ہوتی ہے، دین دار کی غلطیاں بے دین کے مقابلے میں خدا پھر جلد سنبھال لیتا ہے، مگر خودسر، مغرور، لالچی دنیاپرست کی حکومت معاشرے کیلئے عظیم ظلم اور معاشرے کی تباہی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایسا معاشرہ طولانی مدت میں نہ تو دنیاوی فوائد حاصل کرپاتا ہے اور آخرت کیلئے تو ویسے بھی صرف افسوس ہی رہ جاتا ہے۔

اسلامی حکومت دنیاوی اور اُخروی دونوں کامیابیوں کیلئے وسیلہ ہے۔ مگر آج پہلی دنیا اور دوسری دنیا اور تیسری دنیا کی تقسیم کرنے والے مفکرین تو اپنی جگہ مجرم ہیں ہی تیسری دنیا کے وہ باسی بھی مجرم ہیں جو علم و دانش کو صرف دنیاوی فوائد کے حصول کیلئے وقف سمجھتے ہیں اور اخلاق و کردار اور اُخروی سعادتوں کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اخلاق کو بھی صرف اس لئے اہمیت دیتے ہیں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف جذب کرسکیں اور معاشرے میں ساکھ بنا سکیں، کاروبار کو ترقی دے سکیں۔۔۔ اس نیت کے بجائے اگر دوسروں سے ہمدردی اور انسانیت کے احترام اور مخلوق خدا کی خدمت کی خاطر مثبتات کا فروغ اور منفیات کی بیخ کنی کی نیت کی جائے تو یہی بہتر ہوتا ہے۔

دین کو افیون بنانے والے لوگ جو دین کو الٰہی اہداف کے حصول کی جدوجہد سے عاری سمجھتے ہیں اور زندگی کو آرام و سکون، عیش و راحت کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں ان کی علامات یہی

ہیں کہ یہ صرف دعاؤں اور زیارتوں، سجدوں اور بے بصیر تلاوتوں سے جنت کے حصول کے طلبگار ہوتے ہیں یا پھر دعا درود میں کثرت صرف دنیا کی آسائشوں کے حصول کیلئے ہوتی ہے، انہیں دین کے ہدف اللہ کے معین کردہ منزلوں سے نہ آشنائی ہوتی ہے نہ ہی اس کیلئے کوشش ہوتی ہے، یہ بلاد کفر میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور قرآن کریم کے مطابق انہی ظاہر پرستیوں کی طرف رغبت کے باعث ایمان لانے والوں کے بارے میں ایک آیت ہے۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں (آسمانی) کتاب کا حصہ دیا گیا ہے (پھر بھی) وہ بتوں اور شیطان پر اور کافروں (کی دنیاوی ترقی دیکھ کر ان) کے بارے میں کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی نسبت یہ (کافر) زیادہ سیدھی اور حق کی راہ پر ہیں"۔ (سورہ نساء 51)۔

یہ لوگ جدید تقسیم عالم کے مطابق تیسری دنیا کا ہل سست اور ناکارہ گردانتے ہیں اسی وجہ سے جدید تعریف کے مطابق مادیات میں ترقی یافتہ بلاد کفر میں اکثر تیسری دنیا کے لوگ آدھے تیتر آدھے بٹیر ہوتے ہیں۔ تیسری دنیا کے وہ مجاہدین جو مشکلات سے نبرد کے ساتھ ساتھیوں کی کمی کے باوجود اپنے حصے کی شمع جلائے جیسے تیسے اخلاقیات، تقویٰ، پرہیز گاری قائم کرنے کی جدوجہد میں لگے ہیں تو دوسری طرف یہ دیسی ماڈرن کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا کے مصداق طویل مدتی اہداف اور آئندہ کی نسلوں کی دنیاوی ترقی عزت و وقار اور قومی غیرت میں اپنا حصہ ڈالے بغیر اور اصلاح احوال کیے بنا مغرب کی تعریف میں شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بنے اپنی نام نہاد ہجرت کا بھرم قائم رکھنے کیلئے مغرب کی

تعریفیں کرتے نہیں تھکتے, اپنے فرار کی تاویلات دیتے رہتے ہیں۔۔۔۔ قرآن مجید ان کے مسـ تقبل اور فرار کے نتائج کے بارے میں فرماتا ہے: "اگر تم قتل یا موت کے خوف سے بھاگنا بھی چاہو تو فرار کام آنے والا نہیں ہے اور دنیا میں تھوڑا ہی آرام کر سکو گے "۔(سورہ احزاب-16)

خود مغربی سمجھ دار دانش مند اپنے معاشرے کی اخلاقیات پر رونا رو رہے ہوتے ہیں مگر دیسی مغربیے اپنی ہجرت کو جسـ ٹیفائی کرنے کے لئے نت نئی تھیوریز لاتے رہتے ہیں, مغرب کو فرشتہ اور خدا کی منتخب قوم فرض کرکے ان سامراجی اعمال کو چھپا کر تیسری دنیا کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے اپنی کاہلی سستی اور عیش طلب مزاج کی تسکین کر رہے ہوتے ہیں۔ نتیجتاً کافر دشمن بھی حوصلہ پاتا ہے اور مومنین کو مخاطب کرتا ہے۔بقول قرآن کریم: "ان کافر لوگوں کو جب ہماری کھلی کھلی آیات سنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ " بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر (اقتصادی) حالت میں ہے اور کس کی (سماجی) مجلس / محفلیں زیادہ شاندار ہیں؟" (سورہ مریم – 73) تیسری دنیاکے بیشتر حکمران بنی اسرائیل خصوصاصہیونیت کی مادیت اور دنیا پرستی سے متاثر ان کے غلام بنے ہوئے ہیں اور اسی طرح حکومتوں کی غلامی کے ساتھ بیشتر عوام بھی صہیونیوں اور ان غلاموں کی نقل کو اپنی کامیابی اور عزت تصور کرتے ہیں۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے صہیونی یہ کافر گروہ اپنی حماقت اور بے وقوفی کے باعث خود تو ناکامیاں اٹھا رہے ہیں جس سے صرف بابصیرت مومنین دیکھ رہے ہیں ورنہ باقی غلامان کفر

ترقی اور کامیابی کے مغالطے میں اپنے اور اپنی اولادوں کے دنیاوی اور اُخروی مستقبل سے ناآگاہ جھوٹی ترقی کے جھانسے میں گہری کھائی میں گرتے جارہے ہیں۔

ہمیں طویل المدتی اسٹریٹیجی پر عمل کرتے ہوئے اپنے معاشروں کو کامیاب کرنے کیلئے بلاد کفر کے رعب میں آنے کے بجائے مرحلہ بہ مرحلہ اپنے سماج میں رہتے ہوئے جدوجہد کی ضرورت ہے۔ اور اولادوں کو مستبقل کے کفر سے بچاتے ہوئے اور صرف اپنی کامیابی اور سکون کی خاطر کفار کی ترقی سے مرعوب ہوکر بلاد کفر فرار کر جانے کے بجائے نام نہاد اسلامی معاشروں کو حقیقی اسلامی معاشروں میں ڈھالنے کے عمل میں مصروف ہوجانا چاہیے۔ تیسری دنیامیں رچائی گئی ان باغیان خدا کی سازشوں سے ہشیار رہتے ہوئے ان سے دامن بچاتے ہوئے اپنے شعور و توجہ کو خدا اور خدائی رہبر ان کی طرف موڑ رکھنا ضروری ہے۔

معاشرے کو عزت و وقار کے ساتھ، خود اعتمادی اور خود کفائی اور حوصلے کیلئے صرف قرآن حکیم اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و اہلبیت علیہم السلام سے وابستہ ہونا ضروری ہے، خصوصا ایسا معاشرہ جو توحید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر یقین رکھتا ہے۔ اس وابستگی کا لازمی نتیجہ تزکیہ نفس، دنیا اور دنیا پرستی سے دوری، اسلامی معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے نہ تھکنے والی اجتماعی جدوجہد ہے۔ اس جدوجہد کا لازمی وسیلہ علم ودانش کا حصول اور خضوع و خشوع ہے۔ دشمن توحید اور مسلمین سے ہوشیاری اور دفاع کے بغیر اجتماعی جدوجہد ایسے ہی ہے جیسے گندے گلاس کو صاف کیے بنا اس میں پاک وصاف پانی ڈالا

جائے تو وہ بھی نجس و ناپاک ہو جائے۔۔۔ اور اس جدوجہد کیلئے علم و دانش بنیادی وسیلہ ہے اس کے بعد انتھک محنت و جدوجہد ہی کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

لہذا تیسری دنیا کے عوام خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، اسلام یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن و اہلبیت علیہم السلام سے بھرپور طور پر ہدایت لینے کیلئے دن رات ایک کریں، تعلیمات اسلام کو عقل و دانش کے وسیلے کامیابی کو ہدف قرار دیتے ہوئے جدوجہد کو لازمی قرار دیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی اصلاح اور بیداری کیلئے، فکری مہمیز کیلئے، شعوری ارتقاء کیلئے، علمی بصیرت کیلئے، حکمت کو منتشر کرنے کیلے اپنے اخلاق و کردار کو رحمت للعالمین سے مربوط کرنا ہو گا، کیونکہ حکومت اسلامی بغیر شعوری ارتقاء اور علمی بصیرت کے ممکن نہیں اور شعوری ارتقاء رحمت وعفو و کرم کے بغیر ممکن نہیں۔

دین کا نظام اگر دنیا کی بہتری کی نوید دیتا ہے تو وہ شارٹ کٹس نہیں دیتا خود کو دھوکے میں رکھ کر فوری ترقی کا کوئی فارمولا فطرت میں ہی موجود نہیں۔۔۔ ایک رات میں دولتمند بننا قانون الٰہی میں موجود نہیں ہے۔ اس کیلئے جو روشیں ہیں وہ وہی ہیں جس کی دین اسلام تعلیم دیتا ہے۔۔۔ اگر انسان اس پوری کیفیت کے ساتھ دین کو اپنائے تو آخرت کے ساتھ دنیا کی ترقی اٹل ہے۔

تاریخ جسے کہ قرآن کریم ہمارے لئے درس عبرت کا بڑا وسیلہ قرار دیتا ہے اور تاریخی قصے بیان کرتا ہے تو اس کا مقصد ان فطری اصولوں کی دریافت اور ان کی تناظر میں "حال" میں

عمل کرنا مقصود ہے جو اصول خداوند کریم نے عروج و زوال کے معین فرمائے ہیں۔ اسی زاویہ سے تاریخ کے رسول اور انبیاء آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، آج بھی بدر و احد و خیبر کی شرائط موجود ہیں آج بھی کفار و مشرکین اپنی انہی چالوں اور رویوں سے مومنین کے سامنے آرہے ہیں۔۔۔ آج بھی علی و حسین کسی شکل میں دشمن خدا سے پیکار میں مصروف ہیں۔ آج بھی سلمان و ابوذر، مالک و زہیر، قنبر و مقداد کہیں موجود ہیں، اس شکل کو ہمیں پہنچاننا ہے، اسی تاریخ کو بطور نشان راہ جان کر۔۔۔۔ ماضی کے کرداروں کو آج تلاش کرنا ہے، ماضی کے واقعات کو آج کے حالات پر منطبق کرنا ہے۔۔۔۔ آج عالم بشریت اس پوری کرہ زمین پر مشرکین اور مومنین کے نبرد کا گواہ ہے۔۔۔ ہمیں آج اپنے لئے کسی محاذ کو منتخب کرنا ہے۔۔۔۔

اپنی عائلی گھریلو زندگی سے لیکر قومی و عالمی معاملات کو دین کے سائے میں لانے کیلئے خلوص اور جذبہ بیدار کرکے اس کو عملی بنانے کے طریقوں کو دریافت کرنا ہے اور اس پر پوری تندہی سے عمل کرنا ہے۔

خداوند بزرگ و برتر سے التماس ہے کہ محمد و آل محمد پر رحمت نازل فرمائے، ہمارے امور کو منظم فرمادے، ہمیں بہشت کیلئے تیار فرمادے، جہنم کو ہم سے دور فرمادے، محمد و آل محمد پر بے شمار رحمتیں اور برکتیں نازل فرما۔ اور ہم تمام انسانوں کو خود ساختہ اور مشرکین کی دی گئیں محرمیوں اور ذلتوں سے نکال کر ہمارے مولا و قائد حضرت بقیۃ اللہ الاعظم (ارواح لنا فدا) کے پرچم تلے متحد فرمادے اور دین کو غالب فرما کر اپنے منتخب پسندیدہ بندوں کو تسکین

قلب عطا فرما اس دنیا کو ہمارے لئے آخرت کا بہترین وسیلہ قرار دے۔ آمین یارب العالمین

اسلام و حق پرستی کو کسی سے خطرہ نہیں

اسلامی علم و دانش کو عقلی تناظر میں جہاں بیرونی خطرات جیسے کیپٹل ازم، سوشلزم، سیکولرزم اور لبرلزم جیسے ملحدانہ نظریات سے لاحق ہے تو دوسری طرف اندرونی خطرات جیسے غالیت، صوفیت، نصیریت، ناصبیت سے بھی ہے۔ بیرونی خطرات میں ایک خطرہ وہ مذاہب بھی ہیں جو روحانی اور نفسانی ریاضتوں کے تناظر میں صوفیت سے مشابہ ہیں جیسے ہندوازم، بدھ ازم، شنٹو ازم، زرتشت ازم وغیرہ

البتہ وسیع معنوں میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کیوں کہ عقل و منطق نیز فطری احساسات پر مبنی رسوم اور ثقافتی و روحانی اعمال انسان کو خود اس کے باطن (عقل و قلب) کو اپیل کرتے ہیں۔ لہذا انسانی ضمیر وہ سب سے بڑی کسوٹی ہے جس کو دنیا اور تاریخ کا ہر انسان قبول کرتا ہے۔ لہذا وہ فطری عقائد اور اعمال ریاضتیں جو فطرت سے اپیل ہوں۔ کبھی کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوسکتے ہاں کچھ عرصے کیلئے ذاتی کوتاہیوں، بداعمالیوں اور بے وقوفیوں نیز دشمنان حق و حقیقت کی سازشوں کے سبب پردے میں جاسکتی ہیں، معدوم نہیں ہوسکتیں۔ ہر دور میں کچھ حق شناس افراد ہوتے ہیں جو حق و حقیقت پر پڑا پردہ ہٹادیتے ہیں اور کرہ زمین اس سے ضوفشاں ہوجاتا ہے۔ البتہ نہ تو بالکل ہی بے اعتنائی برتی جانی چاہیے اور نہ ہی حد سے زیادہ

جذباتیت ہونی چاہیے کیونکہ یہ دونوں افراط و تفریط کے زمرے میں آتی ہیں جو کامیابی اور کمال کے حصول میں رکاوٹ ہوتی ہیں۔ یہ سسٹم کا حصہ ہے اور سسٹم کی رفتار سے نہ تو پیچھے رہنا چاہیے اور نہ ہی آگے بڑھنا چاہیے۔ اس لئے کہ حق و حقیقت کسی کے نہ تو آگے نکلنے سے اور نہ کسی کے پیچھے رہ جانے سے اپنی رفتار تبدیل کرے گی اور نہ فنا کرے گی۔ حق کے ساتھ باطل کی موجودگی ایک فطری امر ہے البتہ حق کے غلبہ کیلئے مناسب رفتار جس کے ساتھ صبر و انتظار ہو نہایت ضروری ہے۔ نہ جبر و اکراہ ہو نہ ہی آرام طلبی و عیش کوشی و لاپرواہی۔۔۔ قرآن کریم کے مطابق اس کی آیتوں کی حفاظت کی ذمہ داری خداوند کریم نے خود لی ہوئی ہے۔۔۔ اور کائنات بھی قران کریم کی مماثلت قوانین کے تحت خدا کی حفاظت میں ہے، خواہ سماجی قوانین ہوں، خواہ سیاسی و معاشی یا الٰہی تہذیب و تمدن وغیرہ۔۔۔ ان سب کی ذمہ داری خداوند قدوس نے ہر دور میں الٰہی نمائندے کے وسیلے لی ہوئی ہے۔۔۔ الٰہی جتھے الٰہی رہبران ہر دور میں دین وشریعت، قانون اور تہذیب کو ترو تازہ رکھتے ہیں۔۔۔ بس اپنی استطاعت کے مطابق ذمہ داری ادا کرتے رہیں۔

انسانی نفسیات خود سب سے بڑی عالم و دانش مند ہے اگر انسان اپنے اندر کے سسٹم کو سمجھ جائے تو پھر اسے ظاہر میں قرآن بھی سمجھ آجاتا ہے اور الٰہی نشانیاں بھی مل جاتی ہیں۔

عبادات اور بصیرتِ زمان و مکان

ہر شخص الگ الگ خصوصیات و ماضی رکھنے کی بنا پر جداگانہ سوچ اور جداگانہ احکام دینی کا متقاضی ہے، کلی طور پر ایک حکم بہت سی جزئیات رکھتا ہے، لہذا ہر شخص کو چاہیے کہ انفرادی دینداری کو بھی سمجھے اور دین کے اجتماعی پہلو کو بھی اہمیت دے۔ استخراج حکم خواہ اجتماعی حوالے سے ہو یا انفرادی، زمان و مکان اور شخصی کیفیات و صفات کو مدنظر رکھنا اور ان پہلوؤں کے تقاضے ملحوظ خاطر رکھنا اساس حکمت و دانشمندی ہے اور اسی کا نام بصیرت ہے۔

نماز عبادت ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر فروعات دین بھی عبادت ہیں،

قرآن کی تلاوت، زیارات مقامات مقدسہ، صفائی طہارت، کمزوروں کی مدد، انسانوں سے ہمدردی وغیرہ بھی عبادت ہیں،

اچھی گفتگو، مہربانی، رواداری، صلح و آشتی بھی عبادت ہیں،

جہاد و درشت لہجہ، سختی، قتل بھی عبادت ہے، مگر کب؟!!

عبادت کی بھرپور شکل و صورت تو وہی ہے جو سیرت رسول صل اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آئمہ معصومین علیہم السلام نے پیش کی، اور انہی کی سیرت میں ہر زمانے اور جگہ کی مناسبت سے الگ الگ احکام و اعمال صادر ہوئے۔۔۔

بظاہر ٹکراتی ہوئی حدیثوں، آیتوں اور سیرت میں بھی وحدانیت، یگانگت اور اتحاد ہے۔۔۔ جب ہدف، مقصد واضح ہو تو راستہ بدل بھی جائیں تو فرق نہیں پڑتا۔۔۔ درست ہدف کے ساتھ راستہ معتدل ہونا مگر جدا ہونا مانع نہیں ہوتا۔۔۔ ہر انسان کا اختیار و ارادہ اُس کے علم و دانش اور مسائل و راحت کے ساتھ ہوتا ہے۔۔۔ مگر معصومین علیہم السلام اس معاملے میں بھی مشیت اور شریعت پروردگار کے تابع رہتے ہیں، مگر عام انسانوں کا معاملہ الگ ہے۔ کسی کو مشکلات و چیلنج بھاتے ہیں کسی کو تن آسانی اور سہولیات۔۔۔ مگر مقصد پر اتحاد ہونے کے باوجود کوئی دیر سے منزل پاتا ہے کوئی جلدی، کوئی آسانی سے پہنچ جاتا ہے کسی کو رنج و صعوبتوں سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے،

وقت نماز آجائے تو تلاوت قرآن منسوخ قرار پاتی ہے، زیارت و عزاداری، صدقہ خیرات اور دیگر اہم عبادات جب ایک وقت میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہوں تو ابتدائی اور ثانوی کی تمیز انبیاء و رسل و ائمہ طاہرین سمجھا گئے ہیں،

اسی طرح مسجد میں رفع حاجت کرنا حرام ہے، کھانے کے کمرے میں سونا معیوب ہے، چونکہ مومن کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت ہوتا ہے لہذا رفع حاجت بھی عبادت ہے، کھانا پینا،

سوناجاگنا، چلنا پھرنا سب عبادت ہے، مگر اپنے خاص وقت اور جگہ پر مناسب ہوتا ہے۔۔۔ جگہ اور وقت کا خیال نہیں رکھیں گے تو بڑی سے بڑی عبادت بھی ترک اولیٰ پر گناہ بن جاتی ہے۔

تلاوت قرآن عبادت ہے، مہمان کی پذیرائی عبادت ہے، والدین سے نیکی عبادت ہے، مگر نماز کے وقت تلاوت گناہ ہے، والدین کی اطاعت اگر اطاعت خداوندی میں رکاوٹ بنے تو حرام ہے، زیارت و نماز و دیگر عبادات اگر اولیت شماری یا ترجیحات تعین کیے بغیر ہیں اور زمانے و جگہ کے تقاضے نہیں پورے کئے گئے ہیں تو زیادہ ممکن ہے کہ گناہ ہو۔

انفرادیت اور اجتماعیت directly propotional ہیں، انفرادی ایمان و تقوے کے ساتھ معاشرے کے ایمان و تقوے کی نگہداشت یکساں ہونی چاہیے۔ ہر انسان ایک جیسی نفسیات، ایک جیسے حالات، ایک جیسا ماضی اور ایک جیسی زندگی کیفیت کا حامل نہیں ہوتا، لہذا ممکن ہے جو ایک کیلئے واجب ہو دوسرے کیلئے حرام ہو، ایک بالغ شخص کیلئے کچھ عبادت ہو مگر کمسن کیلئے مضرِ ایمان ہو۔ ایک جوان کیلئے کچھ حرام ہو مگر سن رسیدہ کیلئے مایۂ حیات ہو۔ ایک پاکستانی کیلئے کچھ عبادت ہو مگر یورپی امریکی کیلئے مضر ایمان ہو۔

جس وقت و حالات میں میدان جہاد میں نماز پڑھنی چاہیے اس وقت مسجد میں نماز پڑھنا حرام ہے، جس وقت میدانِ عمل میں اترنے کی ضرورت ہے اس وقت مدرسہ و یونیورسٹی کی کلاس لینا حرام ہے۔ مومن کی زندگی کا ہر لمحہ عبادت ہے مگر اس وقت تک جب تک زمان و مکان یا شخصی استطاعت کے تناظر میں دیانت داری برتی جارہی ہو۔

ہر آیتِ قرآن، حدیثِ معصوم علیہ السلام نہ تو ہر وقت اور ہر جگہ پر اطلاق ہوتی ہے نہ ہر شخص پر منطبق ہوتی ہے۔ جہاں مہربانی اور رحمت ولطف وکرم مضر ہو وہاں سختی ودرشتگی ہی مہربانی اور عاطفت بن جاتی ہے۔

گناہوں پر گریہ وفغاں تذکیہ نفس کا بہترین وسیلہ ہے مگر کیا ہم جانتے ہیں کہ میدان جہاد میں حاضر ہونا تمام گناہانِ صغیرہ وکبیرہ کا کفارہ ہے؟!

میدان جہاد سے فرار تمام عبادات ونیکیوں کو محو کر دیتا ہے۔۔۔!!

جب مقصد خدا سمجھ میں آجائے تو اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود بخود پتا چل جاتے ہیں اور ابلیسی راستے بھی خود بخود جدا ہو جاتے ہیں۔ حق و سچائی، عدل و فضیلت کے معارف سے آشنائی کے ساتھ ظلمت ونجاست کی تاریکیاں بھی نظر آجاتی ہیں۔

الٰہی راستوں کی شناخت کے ساتھ خدائی نمائندے بھی خود بخود شناخت میں آجاتے ہیں اور ساتھ ہی ابلیسی نمائندے بھی شناخت پا جاتے ہیں۔

روشنی خود بخود تاریکی کی وحشت کو دور کر دیتی ہے، روشنی سے محبت و عشق کا نتیجہ ظلمت و تاریکی سے نفرت ہے، روشنی دیکھنے کیلئے ہماری بصارت اور آنکھوں میں بینائی ہونا ضروری ہے۔ بینائی کمزور ہو تو عینک کو وسیلہ بنانا پڑتا ہے۔

اگر درست و صحیح وقت اور درست جگہ پر ہم نے روشنی و تاریکی میں فرق کر لیا تب تو بیڑہ پار ہے ورنہ اس اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خسارہ و افسوس رہ جائے گا۔

عارف زمان و مکان علامہ اقبال کی نظم کا ایک مصرعہ ہے:

یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

اپنی استطاعتوں اور قابلیتوں میں اضافہ کیلئے کثرت سے دعائیں اور دوا دارو ہر وقت کرتے رہنا چاہیے اور دوسروں کیلئے بھی اُن کے ظرف، استطاعت اور قابلیتوں اور ہمتوں کو بڑھاتے رہنا چاہیے۔

وقت و زمان اور مکان و جگہ اور شخصی استطاعت کی شناخت ایک بنیادی ترین اصول ہے۔ اس اصول کو ہر لمحہ ذہن میں رکھنا حکمت و دانش، بصیرت و دانائی کا دامن پکڑ لینا ہے۔ ایک شخص یا قوم اپنی استطاعت کے مطابق ممکن ہے بدر و اُحد و کربلا کے شہداء کے مماثل ثواب و اجر کی حقدار ہو۔۔۔ خواہ وہ گھر میں بیمار پڑا صرف اوراد و وظائف میں ہی مشغول ہو یا کوئی قوم سماجی مسائل کے باوجود اپنی ہمت سے زیادہ جدوجہد کر رہی ہو۔ بظاہر غیر اہم کام ممکن ہے بہت بڑے اجر رکھتے ہوں۔۔۔ ضروری نہیں کہ صرف وہ شخص جو قوم کا دینی لیڈر ہو وہی سب سے زیادہ اجر رکھتا ہو۔۔۔ ہمت و استطاعت سے بڑھ کر محنت و جانفشانی کرنا اخلاص کی دلیل اور دیانت کی نشانی ہے۔ ممکن ہے کوئی عمامہ پہن کر فساد فی الارض کا مرتکب ہو اور ممکن ہے کبھی ایک گمنام مومن فقیہ سے زیادہ مرتبہ رکھتا ہو۔

معیار زمان و مکان کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ہمت و استطاعت سے بڑھ کر عمل کرنا ہے، خواہ کتنا قلیل کیوں نہ ہو۔

خدا ہمیں حکمت و بصیرت کے ساتھ زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے، ہمیں الٰہی مقاصد تخلیق کی تکمیل میں حصہ دار بننے کی استطاعت، توفیق اور ہمت عطا فرمائے، ہماری طاقتوں اور صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے اور ہم سب کو روز حشر حوضِ کوثر پر رسول اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم اور معصومین علیہم السلام کی شفاعت سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

نیک اعمال اور مومنین کے درجات

ویسے تو قرآن مجید میں بہت سی آیات ہیں جن میں جنت کی ٹھیکیداری صرف مسلمانوں سے منسوب نہیں بتائی گئی ہے یعنی ایسا نہیں کہ صرف بائیولوجیکل مسلمان ہی جنت میں جائیں گے بلکہ تقویٰ پرہیز گاری نیک امور کی انجام دہی وغیرہ کے ساتھ زندگی گذارنے والے افراد بھی بہشت کی ذمہ داریوں سے عہدہ براہوں گے۔ انشاء اللہ۔

بہشت کے بھی درجات ہیں، اعمال کے بھی درجات ہیں، فضائل و مناقب کے بھی درجات ہیں غرض ہر شہ خداوند تعالیٰ نے درجات اور مراحل میں تخلیق کی ہے۔ لہذا بہشت میں جانے کا زعم اس احساس کے ساتھ بھی ہونا چاہیے کہ کون سا درجہ پانے کی آرزو ہے۔ اب ذرا زیر نظر آیت کو پڑھیے اور سر دُھنیے:

لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّـهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ۔ يُؤْمِنُونَ بِاللَّـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَـٰئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ ۔ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَن يُكْفَرُوهُ ۗ وَاللَّـهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۔ یہ (یہودی اور نصرانی) لوگ بھی سب ایک جیسے نہیں ہیں. اہلِ کتاب ہی میں وہ جماعت بھی ہے جو دین پر قائم ہے راتوں کو آیات الٰہی کی تلاوت کرتی ہے اور سجدہ کرتی

ہے۔ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں. نیکیوں کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں اور نیکیوں کی طرف سبقت کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین اور نیک کرداروں میں ہیں۔ یہ جو بھی خیر کریں گے اس کا انکار نہ کیا جائے گا اور اللہ متّقین کے اعمال سے خوب باخبر ہے۔

سورہ آل عمران 113 سے لیکر115 آیات تک میں یہودیوں کے ان افراد کی بہشت میں رسائی کی نوید سنائی جارہی ہے جو ان الٰہی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہیں جس کو اُس زمانے کے پیغمبران گرامی لے کر آئے تھے۔ یہ راتوں کو سجدہ کرتے ہیں یعنی یہ غرور و تکبر والے نہیں ہوتے اور خاکساری ان کا شعار ہوتی ہے اور یہ خالق کائنات کے ساتھ کائنات کے اختتام اور اپنی آخرت کی بھی فکر کرتے ہیں انکے ذہنوں میں عمل اور رد عمل کا قانون بھی موجود ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ تخلیقی، تعمیری اور مثبتات کی نصیحت کرتے ہیں خود اپنے آپ کو بھی اور اپنے سے مانوس افراد کو بھی۔ غیر تخلیقی، فساد آور امور اور دوسری منفیات کی رد کرتے ہیں اور اس سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں نیز ہر طرح کی خیر انجام دیتے ہیں اور ہر طرح کی نیکی انجام دیتے ہیں۔

آج کے جدید تحقیقی دور میں یہ اصول بہت واضح اور روشن ہے کہ کائنات کی کوئی بھی کلی یا جزئی تخلیق بنا مرکزی کردار، مرکزی نقطہ کے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی۔ ہماری اس کہکشاں میں سورج اور چاند کا کردار، جسم میں قلب و دماغ کا کردار، گاڑی کا ڈرائیور، کمپیوٹر کی آئی سی یا مدر بورڈ، چکی کی کیل جس پر پوری چکی کا دار مدار ہوتا ہے، اشیاء میں موجود ایٹم اور پھر ایٹم میں نیوکلیئس کا کردار۔ وغیرہ وغیرہ

کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی بھی معاشرہ یا گروہ ایک ایسے اجتماعی نظام کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا ہے جس کی سرپرستی ایک توانا رہبر و امام کرتا ہو۔ اسی لئے زمانہ قدیم سے آج تک تمام اقوام و ملل نے اپنے لئے ایک رہبر و امام کو منتخب کیا ہے۔ کبھی یہ رہبر صالح ہوتا تھا لیکن بہت سے مواقع پر ناصالح ہوتا تھا۔ اکثر مواقع پر امتوں کی ایک رہبر کی ضرورت اور احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ظالم بادشاہ اور سلاطین زور وزبردستی سے لوگوں پر مسلط ہو کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔۔ یہ ایک طرف۔

دوسری طرف انسان کو اپنے معنوی کمال کے مقصد تک پہنچنے کے لئے اس راستہ کو اکیلے ہی نہیں بلکہ جماعت اور معاشرہ کے ہمراہ طے کرناچاہئے۔ کیونکہ فکری ،جسمانی، مادی اور معنوی لحاظ سے انفرادی طاقت کمزور ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں اجتماعی طاقت بہت قوی ہوتی ہے۔

لیکن ایک معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ایک ایسا صحیح نظام حکم فرما ہو،جو انسانی صلاحیتوں میں نکھار لائے، انحرافات اور گمراہیوں سے مقابلہ کرے، معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کا تحفظ کرے،بلند مقاصد تک پہنچنے کے لئے پروگراموں کو منصوبہ بند طریقے پر منظم کرے اور ایک آزاد ماحول میں پورے معاشرے کو حرکت میں لانے کے عوامل یکجا کرے۔

چونکہ ایک خطا کار انسان میں ایسی عظیم ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں ہوتی، جیسا کہ ہم بہت دفعہ صحیح راستہ سے سیاسی حکمرانوں کے انحراف اور گمراہی کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ خداوند متعال کی طرف سے ایک معصوم رہبر ان امور کی نگرانی و نظارت کرے اور لوگوں کی توانائیوں اور دانشوروں کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے انحرافات کی بھی روک تھام کرے۔ یہ امام کے وجود کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ اور "قاعدہ لطف" کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ ہم عرض کر رہے ہیں کہ استثنائی زمانہ میں بھی، جب امام معصوم کچھ وجوہات کی وجہ سے غائب ہوں تو لوگوں کی ذمہ داریاں واضح ہیں۔ امام کے کاموں میں معاشرتی نظام کی حفاظت اور عدل و انصاف کا قیام. اس بنیاد پر مسلمانوں کے اجتماعی نظام کی حفاظت، معاشرے میں عدل و انصاف بر قرار کرنا، احکام اسلامی کو تحفظ بخشنا خاص طور پر جن احکام میں معاشرتی پہلو موجود ہوتا ہے، حدود الہی کو نافذ کرنا امامت کے اہداف میں سے ہیں۔ امام کے بغیر دین کے قیام، آیات الٰہی کی تفسیر، سجدے، رکوع، توحید و معاد کا ایمان، نیکیوں میں سبقت وغیرہ ہو کیسے سکتی ہے جو ہم یہ کہیں کہ الٰہی رہبر کو ماننے بغیر اور اسلامی نظام کی اطاعت کیے بغیر صرف نیکیاں انجام دے کر کوئی بہشت کے اعلیٰ درجوں پر فائز ہو جائے گا۔

لہذا اس شعور کے ساتھ کے امامت کائنات کی مخلوقات اور اشیاء کا ایک بنیادی قانون ہے یہ وہ مرکزی نقطہ ہوتا ہے جہاں سے کسی بھی شہ اپنا جنم شروع کرتی ہے اور آئندہ کی زندگی کا دارومدار اسی مرکزی نقطہ سے جڑے رہنے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر کہ اس نقطہ سے جڑے

رہے تو تمام سسٹم اور نظام درست چلتا رہے گا اور نہیں جڑے رہے تو یہ سب سسٹم و نظم ناکارہ ہو جاتا ہے۔

اس نکتہ آفرینی کے ساتھ ہم اب گفتہ بالا آیات کو اس تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں چند اعمال کا خداوند تعالیٰ نے ذکر کیا ہے کہ جو یہ انجام دیتا ہے وہ بہشت میں پہنچ جائے گا۔ جیسے کہ دین پر قائم رہنا، راتوں کو آیات الٰہی کی تلاوت کرنا، سجدے کرنا، اللہ و آخرت پر ایمان لانا، نیکیوں کا حکم دینا، برائی سے روکنا، خیر انجام دینا اور نیک کردار ہونا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان آیات میں دین سے مراد کیا صرف نماز، روزہ، حج وزکواۃ وغیرہ ہے یا راتوں کو قرآنی آیات کو پڑھ کر خداوند کو سجدے کرنا ہے، اللہ اور آخرت پر ایمان سے کیا مطلب ہے؟، نیکیوں سے کیا مراد ہے؟ برائی سے کیا مراد ہے، خیر سے کیا مطلب اخذ کیا گیا ہے؟ نیک کردار کون ہوتا ہے؟

اگر انسان یہ سب اعمال اپنی فکرِ خالص و نیتِ خالص کے ساتھ سمجھ کر انجام دے اور جس کام کو بھی نیک سمجھتا ہے انجام دیتا ہے وہ سب اسی زمرے میں آئیں گے۔ لیکن یہ سب اعمال حاشیہ پر رہیں گے اگر ان کے مرکزی امر و عمل کو انجام نہ دیا گیا یعنی امام پر ایمان اور امام کی اطاعت۔ امامت کے وجود اہمیت، اس پر ایمان کی اہمیت اور اس کی اطاعت اور امام کی حفاظت اور اس کی پشت پناہی کی اہمیت عقلی تناظر میں ہم نے واضح کیں۔ نیز نیکیوں کا نظام بغیر امامت کے چل ہی نہیں سکتا لہذا امام اور ادارۂ امامت کے قیام کے بغیر کوئی بہت ہی

توانا انسان نیکیاں انجام دے سکتا ہو گا مگر مجموعی طور پر انسان اپنی کم مائیگی کے باعث نیکیوں سے آشنا ہی نہ ہو سکتا بہشت تک رسائی تو دور کی بات۔

اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

" اللّٰھم بلی، لا تخلوا الارض من قائم للہ بحجة، اما ظاھراً مشھورا، او خائفاً مغمورا لئلا تبطل حجج اللہ و بینا تہ۔"

"جی ہاں، زمین ہر گز قیام کرنے والے حجت خدا سے خالی نہیں ہو سکتی ہے، خواہ (وہ حجت خدا) ظاہر و آشکار ہو یا مخفی و پوشیدہ، تاکہ خدا کی واضح دلیلیں اور نشانیاں باطل نہ ہونے پائیں۔"

حقیقت میں قلب امام اس محفوظ صندوق کے مانند ہے جس میں ہمیشہ گراں قیمت اسناد رکھے جاتے ہیں تاکہ چوروں کی لوٹ مار اور دوسرے حوادث سے محفوظ رہیں یہ بھی وجود امام کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔ (نہج البلاغہ، کلمات قصار نمبر ۱۴۷)

ایک چھوٹی سی گلی کے کچے مکان میں پڑھی جانے والی فرادیٰ نماز اور اس سے بھی زیادہ بوسیدہ گلی اور گلے سڑے محلے کی مسجد میں امام کے پیچھے پڑھی جانے ولی باجماعت نماز تک میں فرق ہے۔

بہت سی مشہور نقلی دلیلیں بھی ہیں جیسے آیہ بلغ، آیہ اولوالامر، آیہ ولایة، حدیث غدیر، حدیث منزلت، حدیث یوم الدار، حدیث ثقلین، حدیثِ سفینہ، حدیث ائمہ اثنا عشر وغیرہ

لہذا اس تناظر میں دیکھا جائے تو دین پر قائم ہونا امامت کے عقیدہ اور اطاعت پر قائم ہونا ہے، آیات الٰہی کی تلاوت سے مراد امامت کے امور پر گفت و شنید ہے، سجدہ سے مراد امام کی اطاعت اور سر خمیدہ کرنا ہے، اللہ اور آخرت پر ایمان امام کے بغیر نامکمل ہے، نیکیوں کا حکم امامت اور امام کی معرفت کو عام کرنا ہے، برائی سے روکنا امام کی مخالفت میں چلنے والے قدموں کو روکنا ہے، خیر سے مراد امام کا مکمل مطیع ہونا ہے، نیک کردار بھی وہی لوگ ہیں جو تمام نیکیاں امامت کے عقیدے کے ساتھ اور امام کی اطاعت کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ورنہ نیکیاں کرنے والے تو فرعون، شداد، نمرود، یزید بھی تھے مگر ایک عمل جس نے ابلیس کو بھی مطیع الٰہی کی حیثیت سے نکال کر راندہ درگاہ کر دیا وہ ایک سجدہ ہی تھا جو خدا نے اپنے ولی کیلئے اس سے تقاضہ کیا تھا۔ ٹھیک ہے کہ اگر یہ سب بھی خدا کے حکم سے جنت میں جائیں گے لیکن بہشت کے کس درجے میں ہوں گے اس سے خداوند عالم ہی بہتر آشنا ہے۔ البتہ ہمیں کسی کو جنت یا دوزخ کے سرٹیفیکیٹ تقسیم نہیں کرنے چاہییں یہ کام خداوند قدوس سے ہی وابستہ ہے اور ہماری ذمہ داری نیک اعمال خلوص نیت سے انجام دینا ہے۔ نیز ہمیں اپنے اعمال کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور صرف اس پر قانع اور مطمئن نہ ہو جائیں کہ بس اتنا بہت ہے اور کافی۔ ہم روزمرہ دعاؤں میں یہ تلقین خود کو اور دوسروں کیلئے کرتے رہتے ہیں کہ جوار ائمہ علیہم السلام میں جگہ عطا ہو، تو اس کیلئے ایسے ہی کٹھن مگر لذت آفرین اعمال انجام دینے ہیں جس سے اعلیٰ علیین میں جگہ مل سکے۔

عرفانِ امامت وولایت

(محترم قاضی انعام صاحب کی تحریر میں اضافہ کے بعد)

حقائق تک رسائی کے تین راستے ہیں، ایک جدلیاتی سماجی سائنس کا جس کی ترقی یافتہ شکل آلات کی سائنس کے ذریعے حقائق تک رسائی ہے جیسے آئین سٹائن نے آلات کی مدد سے ایٹم کو تقسیم کر کے بتایا آگر اسی ایٹم کو مزید تقسیم کرنے کی کوشش کی جائے تو کائنات کے مادی حقائق کی حساس حقیقت تک پہنچا جاسکتا ہے دوسرا راستہ تاریخی سماجی جدلیاتی سائنس کا ہے جس میں معاشی ارتقاء ذہنی ارتقاء اور سماج کی تشکیل کا علم حاصل ہو جاتا ہے صوفیاء جو خدا کو ساتھ لے کر چلتے ہیں یا خدا شناشی کی گہرائی تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ بھی غیر ارادی طور پر جدلیاتی سائنس کے اصولوں پر ہی کاربند ہوتے ہیں مگر ان کی منزل مشکل ہوتی ہیں وہ مادے کی تقسیم در تقسیم کی آخری کڑی اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس معیار کو سمجھنے کے لیے انسان کے روزمرہ کے معاملات کا درست ہونا بڑا ضروری ہے پھر مادے کی تقسیموں کی گہرائی جو انرجی کی انتہائی لطیف اور اعلیٰ حقیقت ہے دماغ کا کینوس وسیع ہو کر جب اس لطیف اور حساس حقیقت سے جڑتا ہے تو اس وقت سورج کی شعاؤں سے لاکھوں گنا تیز لطیف مادی انرجی کا اخراج کائنات کے حقائق سے آشناء کرتا ہے وہ ادنیٰ حقائق آگے جس حقیقت سے انسان کے دماغ کے اعلیٰ اور براڈ کینوس کو جوڑتے ہیں وہ مادے کی

تقسیموں کی انتہائی اعلیٰ اور سوپر فارم ہے خدا جو مادے کی حقیقت سے الگ اعلیٰ حقیقت ہے اس کے ادنیٰ حقائق سے انسان چند لمحے جڑ کر تشنگی اور علم حاصل کرلیتا ہے وہ حقیقت ماسوائے استغفار کے کچھ بھی نہیں، اللہُ اکبر کے معانی جہاں پہنچ کر انسان استغفار کی حقیقت جان کر وجود کے اندر لوٹ آتا ہے پھر اللہُ اکبر کہنے کی جسارت اس لیے کرتا ہے اس معیار پر انسان پورا اتر نہیں سکتا پھر آخری سانس تک کائنات کے مادی حقائق کی جانکاری کو ذکر و تحلیل و استغفار سے جوڑ کر حاصل کرتا رہتا ہے جو اس کا مقصد حیات ہے، یعنی کے تحقیق تعمیر اور تسخیر کا علم جس کو آلات کی مدد سے ہی جانا جاسکتا، جدید سائنسی ایجادات انسان کو خدا کے حقائق کی طرف راغب کرنے کا ذریعہ بن رہی ہے۔ خدا کو نامانئے والا انسان بھی سائنسی حقائق کے ذریعے خود بخود خداشناسی کی طرف پلٹ رہا ہے۔ وجود کی تشنگی اور ملامت جس کو سماجی رویے پیدا کرتے ہیں پھر بھی انسان یکسوئی کے ساتھ حقائق کی دنیا کا ادراک لگانے میں لگا رہتا ہے۔ جب وجود پر دباؤ شدت اختیار کرتا ہے تو وجود کے سیل حساس انرجی کا اخراج کر کے وجود کے سگنل سسٹم کے ذریعے اس لطیف انرجی سے دماغ کے حساس میکانزم کے سیلز سے جڑ کر دماغ کے کینوس کو سورج کی شعاؤں سے لاکھوں گنا تیز رفتار لطیف حساس کائنات کے کمانڈ اینڈ کنٹرول کے نظام سے جوڑ دیتے ہیں، جہاں پہنچ کر انسان کو جنوں فرشتوں کے حساس لطیف مادی میکانزم کی بھی سمجھ آجاتی ہے اور ابلیس جس کے وجود کی حساس لطیف کیمسٹری کے ایٹم ناقابل تقسیم ہیں، لیکن انسان کے وجود کے اندر

وہ صلاحیت موجود ہے جس کو اعلیٰ معاملات اور علم والا انسان خون کی شریانوں کے اندر سلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔(یہاں تک قاضی انعام کی تحریر ہے)

امامت کا نظریہ بھی جدلیاتی سائنس میں موجود مرکزی نقطہ سے، تاریخی جدلیات میں معاشرے میں حاکم کی اہمیت سے اور انفس میں قلب کی کیفیت سے آشکار ہوتا ہے۔ خدا تک تو لوگ پہنچ جاتے ہیں مگر امامت سے انکاری کی وجہ خدا کی مادّی زرق برق نعمتوں پر فریفتہ ہونے کے باعث ہوتی ہے یا علم کی کمی کی وجہ سے۔

یہ وہ کمانڈ اور اینڈ کنٹرول کا ادارہ ہے جس سے نہ ہی کائنات کے آفاق، نہ ہی انسانی انفس اور نہ ہی انسانی معاشرے لاپرواہ رہ سکتے ہیں، مگر یہ کہ غیر فطری ارادوں کے نتیجے میں آفاق، انفس اور معاشرے میں ہرج و مرج اور انتشار کا سبب بنیں۔

امام کی اطاعت علم پر عمل کرنے والے کی طرح ہوتی ہے جس کو علم ہو کہ سہارے کا محتاج ہے وہ امامت کے ادارے کو معطل کرنے کے بجائے امام کی اطاعت کرتا ہے اور اپنے ہر عمل کو امام کی طرف پلٹاتا ہے یہی امام اس کو صغیرہ کوتاہیوں کے اثرات سے پاک کرتا ہے اور معاشرے کو ایک دھارے میں رکھتا ہے، کنٹرول رکھتا ہے۔ یہی مرکزی کردار ہر عقلی و فلسفی و نفسانی دلیل بن کر انسان کو دنیاوی اور اخروی سعادتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ جو ذرہ بھی اپنے مدار سے ہٹتا ہے تباہ ہو جاتا ہے۔

جدید ٹیکنالوجی جدید سامری کا بچھڑا

قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلَـٰكِنَّا حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِّن زِينَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنَاهَا فَكَذَٰلِكَ أَلْقَى السَّامِرِيُّ۔ فَأَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ فَقَالُوا هَـٰذَا إِلَـٰهُكُمْ وَإِلَـٰهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ

قوم نے کہا کہ ہم نے اپنے اختیار سے آپ کے وعدہ کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ ہم پر قوم کے زیورات کا بوجھ لاد دیا گیا تھا تو ہم نے اسے آگ میں ڈال دیا اور اس طرح سامری نے بھی اپے زیورات کو ڈال دیا۔ پھر سامری نے ان کے لئے ایک مجسمہ گائے کے بچے کا نکالا جس میں آواز بھی تھی اور کہا کہ یہی تمہارا اور موسٰی کا خدا ہے جس سے موسٰی غافل ہو کر اسے طور پر ڈھونڈنے چلے گئے ہیں۔ (سورہ طٰہٰ -88,87)

سامری نے بنی اسرائیل کے زیورات کو پگھلا کر موسیٰ ع کے قدموں کی خاک ان پر ڈال کر گائے کا روبوٹ تیار کر لیا۔

☆ قرون وسطٰی کے مسلمانوں کے زر و جواہر جو مغربیوں نے کالونیل دور میں لوٹ مار کر کے حاصل کیے اور اسلامی علم و دانش کے انضمام سے ہی آج مغربی سامریوں نے خدا، دین خدا، اور حجت خدا کے مقابل نت نئی ٹیکنالوجیز خلق کر کے انسان کی اکثریت کو گمراہ کیا ہوا ہے۔

☆عصر دوراں کی ٹیکنالوجی کی مثال اسی سامری کے گوسالہ کی طرح ہے جس کے پیچھے بڑے سے بڑے دانشور اندھے بن چکے ہیں۔ اور اس ٹیکنالوجی کو خدا کا درجہ دے دیا ہے اور بزعم خود کہتے ہیں کہ حجت خدا حضرت بقیۃ اللہ الاعظم ارواح لنا فدا کا خدا بھی یہی ہے اور جدید دور کے تقاضے کے تحت امام ع بھی اس ٹیکنالوجی کے محتاج ہیں۔

☆ دنیا میں عدم عدالت اور عالمی وسائل پر غیر منصفانہ حاکمیت کے باعث صرف چند کروڑ کی آبادی ہے جو نت نئے جدید وسائل سے بہرہ مند ہورہی ہے، جبکہ دوسری طرف اربوں انسانی کثرت اس ترقی اور ٹیکنالوجی سے دور ہے۔ ان کے پاس صاف پینے کا پانی تک میسر نہیں اور دوسری طرف سامریوں کے پاس دولت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اس میں نہ تو سامریوں کی ذہانت کا دخل ہے نہ ہی تیسری دنیا کے مظلوم کاہل اور سست ہیں۔ بلکہ اس کی وجہ خدا کے سسٹم کی معرفت سے غفلت اور جہالت ہے۔ نادرست شعبے میں کام کو ترجیح دینا ایسا ہی ہے جیسے درست شعبے میں کام نہ کرنا۔

☆ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی بحکم خدا غیبت کے دوران نفس پرست انسانوں نے الٰہی علوم اور دانشِ معصومین علیہم السلام کی خاک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علم و دانش کے ذریعے انسانی عقیدے کا استحصال کیا اور نہ صرف مادّی وسائل کو اپنے زیر نگیں کیا ہوا ہے بلکہ علم دانش و ٹیکنالوجی کے ذریعے انسانی روح اور نفسیات کو بھی ہائی جیک کیا ہوا ہے۔
☆ البتہ مسلمانوں اور دیگر مظلوموں اور کمزروں کو اپنی عوام کی فلاح اور مغربی سامریوں کے مقابلے کیلئے دفاعی میدان میں جدید ٹیکنالوجی کا حصول کرنا ہے جس سے اپنے قدرتی

اور مالی وسائل کی حفاظت کی جا سکے اور اپنے زیر نگین اقوام کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا بندوبست بھی رکھنا ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّـهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّـهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّـهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ۔ (اے مسلمانو!) تم جس قدر استطاعت رکھتے ہو ان (کفار) کے لئے قوت و طاقت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو۔ تاکہ تم اس (جنگی تیاری) سے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن کو اور ان کھلے دشمنوں کے علاوہ دوسرے لوگوں (منافقوں) کو خوفزدہ کر سکو۔ جن کو تم نہیں جانتے البتہ اللہ ان کو جانتا ہے اور تم جو کچھ اللہ کی راہ (جہاد) میں خرچ کروگے تمہیں اس کا پورا پورا اجر و ثواب عطا کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کسی طرح ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (سورہ انفال-60)

بِأَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ خدا کسی قوم کو دی ہوئی نعمت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے تئیں تغیر نہ پیدا کر دیں کہ خدا سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے۔ (سورہ انفال-53)

سائنسی ایجادوں سے دنیا کے کتنے افراد فائدہ اٹھا رہے ہیں؟!

خود ایجاد کے فائدے مند ہونے پر اشکال نہیں ہے۔۔۔ بلکہ اس کے غلط استعمال اور سب سے زیادہ اس کو عالمی مسائل میں ترجیح دینے پر ہے۔

مگر دنیا کی 80 فیصد آبادی جہاں پینے کا صاف پانی انسان کو میسر نہیں۔۔۔۔ وہاں تعلیم، تفریح، ہسپتال، وغیرہ کو کون پوچھے گا۔۔۔۔۔

سائنسی ایجاد تو فائدہ مند ہیں ہی مگر اس سے منافع صرف سرمایہ دار اٹھا رہا ہے یا ان کے دفتری ملازمین۔۔۔۔ مزدور کے مسائل تو خیر ابھی بھی حل نہیں ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ انسانی حقوق کے نعرے لگانے والے یہ حقوق کے چیمپیئین ہی ہیں جو سرمایہ داری کی بھینٹ چڑھے سادہ عوام کو دھوکہ دے رہے ہیں۔۔۔۔ دوسری طرف اسی سرمایہ دار کے ایجنٹ سائنسدان بھاری معاوضوں کے بدلے سائنس و ٹیکنالوجی کی جادوگریاں دکھا رہا ہے۔ مگر دنیا کی 80 فیصد عوام کو نہ خلائی مشن سے کچھ لینا دینا ہے نہ اونچی عمارتوں، نئے ماڈل کی گاڑیوں، موبائل کے نئے نئے ماڈلز، نہ نئی نئی ایجادات سے۔۔۔۔۔ انسانیت کے نعرے لگانے والے جھوٹے دعوے واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ ان 80 فیصد دنیا کی آبادی کو روٹی کپڑا مکان تفریح صحت اور سب سے زیادہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی ضرورت ہے۔۔۔ مگر عالمی معاشی ادارے کبھی نہیں چاہتے کہ کوئی فرد یا قبیلہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو۔۔۔۔ سیاسی مداخلتیں، معاشی بد معاشیاں، قرض کی غلامی، معاشرے میں ناامنی پھیلانا، معاشرے کے احساس کمتری میں مبتلا لوگوں کو خریدنا یا فری کا خدمت گار بنانا وغیرہ کے ذریعے اپنی اجارہ داری قائم رکھنا۔۔۔۔

اجارہ داری کا وجود جائز مقابلہ کے نتیجے میں حاصول ہوا ہو تو عقل میں آتا ہے مگر جبر دھونس اور زبردستی دھوکہ فریب سے اجارہ داری بنانا صرف ابلیس کا کام ہے، یہ قبضہ گروپ کی دہشت گری ہے۔

خیر ہے! بہت جلد ماضی کے فرعونوں امویوں عباسیوں کی طرح تاریخ سے سبق نہ لینے پر آج بھی فرعون وقت اور تاریخ و فطرت کے قوانین سے جیت نہیں سکتے۔۔۔۔ تاریخ نے جس طرح امویوں عباسیوں مغلوں عثمانیوں کو نابود کر دیا آج وہی حرکتیں مغرب کر رہا ہے۔ جس نے تاریخ نہیں پڑھی اور اگر پڑھی اور یاد نہیں، سبق نہیں لیا تو اسے پھر اس سائنس و ٹیکنالوجی کی بربریت کے زوال کے ساتھ تاریخ اپنا سبق خود یاد کروائے گی۔

سعادت حسن منٹو اور روح اللہ خمینی

منٹو کو معاشرے کا درد مند شخص کہنے والوں کے سامنے معاشرے میں صرف بازاری خواتین کے مسائل ہیں؟ کیا باقی تمام معاشی، سیاسی، تعلیمی، طبّی، مسائل حل ہو گئے ہیں؟ یہ سب مسائل جس کا 3 سو سال سے مرکز صہیونیت ہے اور ان حساس مگر غافل افراد جو منٹو کو درد مند سمجھتے ہیں، پر جب صہیونیوں کی عالمی بد معاشیاں آشکار کی جاتی ہیں تو کیوں مضحکہ اڑاتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ سازشی افکار و اسٹریٹیجیز کو آشکار کرنے والا ایک وقت پر خود اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ منفیات کو آشکار کرنے کیلئے اس کی حقیقت کیلئے تحقیق کرنے والے کیلئے خود منفیات سے بچے رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اینٹی نارکوٹکس پولیس کے لوگ اکثر خود نارکوٹکس کے کاروبار میں شامل ہوتے ہیں۔ اکثر فلاحی ادارے کھول کر مستحقین کی امداد کے بہانے خود اپنی امداد اور جیب پری کر رہے ہوتے ہیں۔ مثبت دیکھنے کی نصیحت ماہرین نفسیات اور مذہبی افراد اسی وجہ سے کرتے ہیں۔۔۔ تا کہ خود کو منفی اثرات سے بچائے رکھیں۔

اکثر انسان کے حساس مزاج صفات کا فایدہ اٹھا کر کرپٹ افراد اپنی نفسانی یا مادی تسکین کر رہے ہوتے ہیں۔۔۔

منٹو اور عصمت چغتائی یا اس قبیل کے دیگر آدمی معاشرے کے صرف ایک فساد یا دو فساد کے خلاف کیوں ہوتے ہیں مثلاً یا تو عورت کے استحصال یا پھر غریب, مستحصل اور مادی لوازمات سے محروم ناداروں مزدوروں وغیرہ کے مقابلے پر تمام مردوں, امیروں دولت مندوں وغیرہ کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔۔۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آٹھارویں صدی کے اواخر سے عالمی سطح پر تمام شعبہ ہائے حیات میں منظم طور کرپشن دھوکہ فریب ذلالت قتل بے غیرتی وغیرہ کو فروغ دینے کی ابتدا ہوئی۔۔۔

ایک تاریخی کرپٹ اور بدیانت ٹولے نے منظم عالمی فساد کی بنیاد رکھی۔۔۔

کہنے کی بات یہ ہے کہ ایکسپوز کرنا ہے اور سچائی اور حقیقت کے نام پر چونا لگانا مقصود نہیں تو اس اٹھارویں صدی سے شروع کی گئی اس منظم فسادی گروہ کی سیاسی علمی، معاشی، جنسی سائنسی، تہذیبی، ابلاغی، بینکی وغیرہ ہر فساد اور کرپشن کو ایکسپوز کیا جائے صرف عورت کے جنسی استحصال اور غریب کی روٹی چھن جانے کے خلاف ہی کیوں۔۔۔؟؟

باقی شعبہ ہائے حیات پر کیوں نہیں۔۔۔ کرہ ارض کی 90 فیصد آبادی جس کا شکار ہے۔۔۔۔

بچوں کا جنسی علمی طفلانہ استحصال, بزرگوں سے بے اعتنائی برت کر استحصال, علم کے نام پر جھوٹ پھیلا کر علم و دانش کا استحصال, سائنسی اور فکری ترقی کے بہانے خاص کاروباروں کا

فروغ اور نوے فیصد عالمی سماج کا استحصال, ابلاغیات میں خاص ٹولے کے مفادات کا تحفظ کر کے صحافت کا استحصال, صحت کے نام پر بیماریاں پھیلا کر شعبہ طب کا استحصال, انٹرٹیمنٹ کے نام پر مبتذلات اور شہوانی محرکات پیدا کر کے تفریح کا استحصال, بزنس اور کاروبار کے نام پر اشتہارات اور ایڈورٹائزمنٹ سے بے سروپا ضروریات پیدا کر کے غریبوں کی جیبوں کا ایک استحصال, دولت کو چوری اور ڈاکے سے تحفظ کے بہانے بینک قائم کر کے دولت کا استحصال, خرید و فروخت کو منظم کرنے کیلئے کاغذی کرنسی کے بہانے خفیہ سرقہ (ربا) کرنا اور غریبوں کی جیبوں کا ایک اور استحصال وغیرہ وغیرہ

کیا آج انفارمیشن کے دور میں کوئی ہے جو منٹو کی کہانیوں سے نفسانی اور مادی تسکین کے بجائے ظالم اور فسادی گمراہ کن فسادی صہیونی ٹولے کو ایکسپوز کرے، چنگیزیوں، جہانگیریوں، صدامیوں، ضیاء کی ضیاع کاریوں، روتھ شیلڈوں، روک فیلروں کی بدمعاشیوں کو آشکار کرے اور عالمی معاشرے کا درد اور اذیت سے دنیا کی اس اشرافیہ کی طرف توجہ مبذول کرائے جن کے دردمند دلوں میں کوئی بدھا کی طرح کا نوجوان ہو یا جو 79 کے خمینی کی طرح عالمی استکبار کو تہس نہس کر دے اور مظلوموں ناداروں بے سکوں محروموں کو ان کے حقوق واپس دلا سکے۔۔۔؟؟؟!!!!

سازشیں ! اندرونی یا بیرونی

اسلام کو سب سے زیادہ خطرہ خود مسلمانوں سے ہے، جب تک ہم اپنے علم و دانش میں اضافہ کے ساتھ تقوا اور پرہیز گاری کو اختیار نہیں کریں گے، روتے رہیں گے، پستے رہیں گے۔ جب ہم اپنی کردار سازی پر توجہ کریں گے تو معاشرہ سازی خود بخود تکمیل پا جائے گی۔خود کی کردار سازی کیے بنا مسائل کے حل کیلئے نہ تو مصلح کچھ کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ولی اللہ اور امام مہدی۔۔۔۔

معصومین علیہم السلام کی مصیبتوں، پریشانیوں اور شہادتوں پر نوحہ وماتم کرنے والے تو بہت ہیں مگر اُن کی اِن مصیبتوں کا تجزیہ و تحلیل کرنے والے کوئی نہیں ہیں۔ بظاہر لوگ بیرونی عناصر کی نشاندہی کر دیتے ہیں جیسے کہ یزید قاتل، فلاں لعین اور ظالم وغیرہ مگر یہ رویہ اور طریقہ کار درست نہیں ہے۔ Inhouse کیا مسائل اور اذیتیں تھیں جو ائمہ معصومین علیہم السلام کو اندرون مکتب سے پہنچائی گئیں، شیعہ ہونے کے دعوے داروں کی طرف سے تھیں اُن پر کوئی تجزیہ کرنے والا نہیں، شاید اس لیے کہ اُس وقت کی مجموعی صفات خود آج ہمارے اندر بھی پائی جاتی ہیں اور ہم عوام الناس کو دھوکہ دینے کیلئے ظاہر بظاہر شیعہ کی شبیہ اور ظاہر داری پر انحصار کر لیتے ہیں اور غیر افراد بھی اسی کو تشیع سمجھ بیٹھتے ہیں۔

جب کسی سماج میں یا امت میں سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پیدا ہوئے ہیں تو ان پر غور و فکر کرنے والے مفکر، فلسفی اور سماجی مسائل کے ماہرین ہوتے ہیں مگر ہمارے ہاں ان پر غور کرنے والے شاعر ہوتے ہیں اور رُلانے والے ذاکرین و خطیب۔ اسی وجہ سے اٹھارویں صدی میں جو کچھ شمالی ہندوستان میں ہو رہا تھا ان حالات میں شہر آشوب لکھے جا رہے تھے۔ شاعروں اور خطیبوں دونوں کے ہاں جس بات زور دیا جا رہا تھا وہ دنیا کی بے ثباتی پر تھا۔ لوگوں کو اس بات کی تنبیہ کی جا رہی تھی کہ اس دنیا سے دل نہ لگائیں اور اگلی دنیا کی فکر کریں۔ یہ وارننگ امیر و غریب دونوں کیلئے تھی اور یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اس ڈر و خوف سے شاید معاشرہ سدھر جائے گا۔ اگلی دنیا کا خوف انہیں ایماندار، پاک اور صالح بنا دے گا۔ آج اور اٹھارویں صدی کی اس سوچ میں کوئی فرق نہیں رہا ہے، ہم آج بھی شعراء اور خطیبوں کے سحر میں مبتلا ہیں۔ سماجی علوم کے ماہرین اور مفکروں، فلسفیوں کی غیر موجودگی میں ہمارے مسائل کا تجزیہ کرنے والے ہم نہیں بلکہ دوسری قوموں کے اسکالرز اور محققین ہیں اور ہم ان کے تجزیوں میں اپنی تصویر دیکھتے ہیں۔ ایسا دین اور عقیدہ جو ہمارے معاشرے کو سماجی اور اخلاقی اور خاص طور پر سیاسی شعور ایسا سیاسی شعور جس سے ماضی، حال اور مستقبل کے حق پرستوں اور باطل و طاغوت کا شعور دے کر ان کی مثبت اور تعمیری خطوط پر تربیت نہیں کر سکتا وہ بے کار اور عبث ہے، جہالت کا پلندہ ہے، دین کے نام پر وقتی طور پر صرف قلبی ٹھنڈک ہے جو جلد یا بدیر اپنی کم مائیگی کے باعث انسانوں کے ذہنوں سے بھی اور دلوں سے بھی اُتر جاتا ہے۔ نیز اس کے ساتھ جو علم و تحقیق، فکر و تدبر، تخلیق اور تعمیری جذبے سے مفقود ہے اور صرف سلبی انداز لئے ہوئے ہے وہ سوائے دہشت گردی کے کچھ نہیں دے سکتا۔

اپنی کوتاہیوں، کاہلی، نکمے پن، جہالت، دنیا پرستی، آرام طلبی، عافیت طلبی، راحت طلبی، غیر سنجیدگی کے بجائے ماضی میں بیرونی سازشیں (out of the house) تلاش کرنے والے آج بھی صرف بیرونی دشمنوں کو مردہ باد مردہ باد، فلاں لعین اور فلاں جہنمی، فلاں دشمن کے نعرے لگا رہے ہیں اور سارا ملبہ بیرونی عناصر پر ڈال کر ایسے ہو جاتے ہیں جیسے اندرون مکتب سب پرفیکٹ ہے، سب کھرے مومن ہیں، ابھی امام ظہور کرلیں تو کربلا میں جمع ہونے والے کروڑوں زائرین امام زمانہ (عج) کے فداکار سپاہی قرار پائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم خود اپنے آپ کو پرہیز گاری اور تقوے کا عادی بنائیں یعنی اپنے بچوں کا تعمیری، تخلیقی ذہن پرورش کریں، سازشیں تلاش کرنے والے ذہن سے زیادہ اُن کو خود اعتمادی، خود انحصاری کی ترغیب دیں یعنی اپنے دینی مسائل کے ساتھ دنیاوی مسائل بھی خود سے حل کریں اور اس کیلئے تعلیم اور تحقیق و مطالعے کی اہمیت اور عادت اُن میں پروان چڑھائیں۔ زاہد و پرہیز گار کا مطلب ہر وقت مفاتح الجنان ہاتھ میں پکڑے مصلّے پر بیٹھے رہنا مقصود دین نہیں بلکہ مومن معاشرے اور مومنین کی ضروریات کو فراہم کرنا بھی بہت عظیم جہاد ہے اور مومنین کے دینی اور دنیاوی مسائل کا حل علم، مطالعہ، تحقیق، قلم و کاغذ سے وابستہ ہے خصوصاً سماجی مسائل کے حل پر ہمارا input تقریباً زیرو ہے اسی سبب اپنے آپ اور اپنے بچوں کو وسیع بنیادوں پر معاشرتی و سماجی، انسانی علوم کی بڑی درسگاہوں سے تعلیم دلوائیں اور اپنے جغرافیے، ثقافت، اور سماج کے تناظر میں ایسی تحقیقات انجام دیں اور ایسے قوانین دریافت کریں جو ہمارے ماحول کی مناسبت سے تعلیمی،

سیاسی، معاشی، ثقافتی رویوں کو درست سمت دے سکیں۔ قوم کو عقیدتی حوالے سے دنیاوی مکاتب سے منسلک کرنا مقصود ہو یا پھر آسمانی مکاتیب سے منسلک کرنا۔ ہر دو کیلئے تحقیقات از حد ضروری ہیں، صرف خیالی اور افسانوی فلسفوں پر اعتماد کر کے یا غیروں کے تجزیوں پر بھروسہ کر کے ہم کچھ نہیں حاصل کر سکتے ہیں جیسے کہ اب تک نہیں کر سکے ہیں۔

عوام کو چٹخارے دار دین چاہیے، آرام طلب زندگی بھی چاہیے اور دشمن سے امام اور امام کی فوج لڑے۔

امام بھی اُس وقت تک کچھ نہیں کر سکتا جب تک امت امام کے ساتھ نہ ہو۔

امت جب تک آرام طلبی، عیش کوشی، غیر سنجیدگی، عافیت طلبی کاہلی اور نکمّے پن میں پڑی رہے گی۔ امام کسی امت کے دشمن کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ امام اور اللہ کے دست وبازو بننے کیلئے قرآن مجید میں ارشاد ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا (اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا) (سورہ محمد 47- آیت 7)

پاکستان میں عوام کو پوری دنیا میں اسلام کا نفاذ چاہیے مگر خود وہ اپنے اے سی کمرے سے نکلنا نہیں چاہتے، تینوں وقت کا کھانا بھی ملتا رہے۔ حکومت سڑکیں بھی اچھی رکھے، اشیائے صرف کی قیمتیں بھی صحیح رہیں، کوئی مخالفت نہ کرے اور کرے تو عوام صرف مردہ باد مردہ باد کے نعرے لگائے۔ ٹی وی پر بیٹھے بیٹھے دنیا میں ہر طرف امن وعدالت نفوذ کر جائے۔

سہولیات نہ ملیں تو حکومت کو گالیاں دینے لگیں اس بات کو جانے بغیر کے بیرونی ہاتھ ملوث ہیں اور اس لئے بھی کہ پاکستانی عوام خود کچھ پیدا نہیں کرتی سوائے بچے پیدا کرنے کے۔ باہر ہاتھ پھیلانے کی وجہ ہی یہی ہے کہ پاکستان کی قومی آمدنی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مگر کھانے کیلیئے ہر دن سینکڑوں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ صرف پانچ یا چھ بڑے شہر ہیں جن میں پر تعیش زندگی کی توقع رہتی ہے، 70٪ پاکستانی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے مگر مجال ہے جو کبھی کسی نے اس آبادی کے علمی شعور، بصیرت اور معرفت پر کام کیا ہو۔ اس آبادی کو معاشی اور فکری مسائل کے حل کیلیئے کوئی صلاح دی ہو۔ عقیدتی نعرے بازیاں اور زندہ باد، مردہ باد کے نعروں سے ہٹ کر انہیں تعمیری و تخلیقی زندگی گذارنے کا درس دیا ہو، جبکہ قرآن اور اہلبیت علیہم السلام کی سیرت میں عملی زندگی گذارنے کے نمونے موجود ہیں جس کو ہم نے نظر انداز کرکے لوگوں کو جنت کے شارٹ کٹ دینے کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔

ترقی کیلیئے، عزت بنانے کیلیئے کڑی محنت، جانفشانی، قربانی کرنی پڑتی ہے۔ گداز بستر، نازک برتنوں، آرام دہ لباس و مسکن کو ناز و نخروں کے ساتھ اختیار نہ کرنے والے باعزت زندگیوں کے حقدار بنتے ہیں۔ ایسی جنت کیلیئے خدا قرآن مجید میں فرماتا ہے: "پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ اُن پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔" [سورہ بقرہ-214]

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ باہمت لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور (نتیجے کیلئے) اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔" [سورہ آل عمران - 142]

نہ پڑھ لکھ کر پاکستان کی معاشی ترقی میں ہاتھ بٹاتے ہیں نہ ہی پڑھ لکھ کر سیاسی و سماجی اور اخلاقی شعور بڑھاتے ہیں۔ تعلیم و تحقیق، تدبر و تفکر کے بغیر نہ تو دنیاوی ترقی ملتی ہے اور نہ ہی اُخروی ترقی۔ یہاں علماء کو پیسے چاہیں اور عوام کو بھی۔ مگر پیسے مضبوط سماجی، سیاسی، اخلاقی شعور اور کڑی محنت و استقامت کے ساتھ روبہ عمل ہونے پر ملتے ہیں۔ اس کے بغیر پیسے صرف چوری، ڈکیتی، کرپشن یا بھیک کے طور پر ملتے ہیں۔ عوام اور حکومت دونوں کو مل کر ترقی دینی ہوتی ہے نہ صرف حکومت اکیلی کچھ کر سکتی ہے اور نہ ہی صرف عوام اکیلی مسائل حل کر سکتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:" دنیا میں ایسے رہو جیسے ہمیشہ یہیں رہنا ہے اور آخرت کی فکر بھی ایسے ہی کرو جیسے کہ اگلے لمحے موت کی آغوش میں چلے جانا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جگہ اور فرماتے ہیں: " یہ دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے۔" یعنی جو کرنا ہے وہ یہیں کرنا ہے چاہے اچھا یا برا، مرنے کے بعد نہ قرآن، نماز کا کوئی فائدہ ہے نہ صدقہ خیرات کا۔ جو اپنی دنیا کو صالح وسعادت مند نہیں بنا سکا وہ مرنے کے بعد کہاں سے سعید بنے گا؟؟!!

سائنسیت اور وھابیت میں مماثلت

وہابی مکتبہ فکر کا طرز فکر حقیقتاً ایک قسم کی مادی اور ظاہری دنیا پر مرکوز ہے، جو مابعد الطبیعاتی مسائل یا غیر محسوس امور کو تسلیم کرنے میں تذبذب کا شکار ہے۔ اس طرز فکر کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ یہ عقیدہ صرف ان چیزوں کو مانتا ہے جو محسوس کی جا سکتی ہیں یا جو ظاہر طور پر سائنسی طور پر ثابت ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح، وہابی عقیدہ میں اہل بیت (علیہم السلام) یا مرحومین سے توسل، ان سے مدد طلب کرنے یا ان کی عبادات سے متعلق کسی قسم کی توہین کا تصور کیا جاتا ہے۔ وہ انہیں صرف انسان سمجھتے ہیں، اور ان کے ساتھ کسی بھی نوع کی غیر ظاہری تعلق کی تجویز کو ایک بدعت یا شرک قرار دیتے ہیں۔

یہی موازنہ سائنسی لوگوں سے بھی کیا جا سکتا ہے جو مابعد الطبیعات، جیسے روحانیت یا غیب کے امور، کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ وہ ان چیزوں کو سائنسی بنیادوں پر ثابت نہیں کر پاتے۔ سائنسی نقطۂ نظر میں جو کچھ بھی حقیقت سمجھا جاتا ہے، وہ صرف وہی ہے جو تجرباتی یا مادی طور پر قابلِ مشاہدہ ہو، اور اس کے علاوہ کوئی بھی چیز فرضی یا غیر ثابت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح، وہابی فکر بھی کسی ایسی بات کو ماننے سے انکار کرتی ہے جو براہ راست قرآن یا متفقہ حدیث میں نہ آئی ہو یا جس کا مادی طور پر کوئی مظاہرہ نہ ہو۔

اس تناظر میں، دونوں مکتبوں کے طرزِ فکر میں ایک قسم کی حد بندی اور تنگ نظری پائی جاتی ہے۔ جہاں سائنسی لوگ مابعد الطبیعات کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، وہیں وہابی مکتبہ فکر بھی روحانی یا غیبی تعلقات کو ایک 'لازمی بدعت' سمجھتا ہے اور ان پر شدید اعتراض کرتا ہے۔ اس رویے کی بنیاد ایک ظاہری اور مادی دنیا پر گہری توجہ ہے، جس میں کوئی ایسی چیز، جو نظر نہ آئے یا محسوس نہ کی جا سکے، اسے قبول کرنا مشکل ہوتا ہے۔

یہ طرزِ فکر انسان کے روحانی یا غیبی پہلو کو نظر انداز کرتا ہے اور صرف وہ چیزیں اہمیت رکھتی ہیں جو دکھائی دے سکیں یا تجرباتی طور پر ثابت کی جا سکیں، جیسے سائنسی نظریات میں کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہابی مکتبہ فکر روحانیت، توسل یا مردوں سے رابطے کو محض عقلی سطح پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، جو کہ اسلامی روحانیت اور عقیدے کے دائرے سے ایک بڑی انحرافیت ہو سکتی ہے۔

وہابیت اور سائنس یت دونوں ایک خاص نوعیت کی مادی اور ظاہری دنیا پر مرکوز فکر کی نمائندگی کرتے ہیں، اور دونوں میں روحانیت یا غیر محسوس، غیبی امور سے متعلق ایک خاص شک اور انکار پایا جاتا ہے۔ جہاں سائنسی دنیا ہر اُس چیز کو مسترد کرتی ہے جس کا تجربہ یا مشاہدہ ممکن نہ ہو، وہیں وہابیت بھی کسی ایسی عبادت یا عقیدے کو رد کرتی ہے جس میں غیر مادی، غیبی یا روحانی پہلو شامل ہو۔ ان دونوں طرزِ فکر میں بنیادی مماثلت یہ ہے کہ دونوں اپنے اصولوں کو عقل، تجربے اور مادی شواہد کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مابعد الطبیعاتی، روحانی یا غیر مادی امور کو غیر ضروری اور غیر عقلی سمجھتے ہیں۔

سائنسی نقطۂ نظر میں، حقیقت صرف وہی ہے جو مشاہدہ، تجربہ، اور حقیقت پر مبنی شواہد سے ثابت ہو سکے۔ سائنس کسی ایسی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی جس کا تجربہ نہیں کیا جا سکتا یا جو مادی دنیا سے باہر ہو۔ اسی طرح، وہابیت بھی ہر اس عقیدے، رسم یا عمل کو مسترد کرتی ہے جس میں مابعد الطبیعاتی یا غیبی عناصر شامل ہوں۔ وہابی فکر کا عقیدہ یہ ہے کہ دین میں جو کچھ واضح طور پر قرآن اور صحیح حدیث میں موجود نہ ہو، اسے بدعت اور شرک کے طور پر سمجھا جائے گا۔ ان کے مطابق، اگر کوئی عمل ایسا ہو جس کا براہ راست قرآن یا صحیح سنت سے کوئی تعلق نہ ہو، جیسے کہ مردوں سے توسل یا ان سے مدد طلب کرنا، تو وہ اسے قابلِ قبول نہیں سمجھتے۔

اس طرح، دونوں میں ایک طرح کا معیار ہے جس کی بنیاد تجربے، مشاہدے اور مادی حقیقت پر ہے، اور دونوں ہی غیر مادی، روحانی یا غیبی دنیا کو مسترد کرتے ہیں۔ سائنسی سوچ میں اگر کوئی معاملہ، جیسے روح، غیب، یا آسمانی طاقتوں کا ذکر آتا ہے، تو اسے محض افسانہ یا غیر حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ وہابیت میں بھی کسی قسم کے غیر مادی تعلقات، جیسے کہ اہل بیت (علیہم السلام) یا دیگر بزرگان سے توسل، کو غیر اسلامی اور شرک سمجھا جاتا ہے۔

دوسری طرف، جہاں سائنس کی دنیا میں تحقیق، سوالات اور شکوک و شبہات کی گنجائش ہوتی ہے، وہابیت میں یہ سوچ زیادہ سخت اور روایتی ہوتی ہے۔ وہابیت میں کسی بھی اجتہاد یا نئے نظریہ کو مسترد کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے جب تک کہ وہ براہ راست قرآن یا صحیح

حدیث سے ثابت نہ ہو۔ یہ بھی سائنسی دنیا کے طرزِ فکر سے مماثلت رکھتا ہے جہاں کسی نئی تحقیق یا نظریہ کو تب تک تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک کہ اس پر تجرباتی شواہد موجود نہ ہوں۔

اس مماثلت کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ دونوں مکتبوں میں حقیقت کو انتہائی سخت اور محدود طریقے سے سمجھا جاتا ہے۔ سائنسی دنیا میں حقیقت کی تفصیل اور تفہیم ہمیشہ ایک متعین اور مادی نقطہ نظر سے کی جاتی ہے، اور وہابیت میں بھی حقیقت کو صرف قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے، جو ایک محدود دائرہ ہے۔ سائنسی لوگ مابعد الطبیعات کو تسلیم نہیں کرتے اور وہابیت میں بھی روحانیت یا غیبی تعلقات کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔

آخرکار، ان دونوں میں ایک مشترک پہلو یہ بھی ہے کہ دونوں مکاتب فکر اپنے اپنے اصولوں میں ایک قسم کی قطعیت رکھتے ہیں، یعنی وہ ان عقائد کو قابلِ قبول سمجھتے ہیں جو ان کے اپنے مخصوص دائرے میں آتے ہیں اور ان کے علاوہ کسی دوسری حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ سائنسی دنیا اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ جو کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا، وہ حقیقت نہیں ہو سکتا، اور وہابیت کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ قرآن یا سنت میں واضح نہ ہو، وہ دین کے دائرے سے خارج ہے۔

اس طرح، وہابیت اور سائنسیت میں ایک نہایت واضح مماثلت یہ ہے کہ دونوں ہی ایک محدود، مادی اور تجرباتی دائرے میں حقیقت کو دیکھتے ہیں اور ہر وہ چیز جو ان دائرہ ہائے عمل سے باہر ہو، اسے غیر معتبر یا غیر عقلی سمجھتے ہیں۔

استعماری طاقتیں اور تیسری دنیا کی ریاستی دھوکہ بازیاں

لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا بات ہے کہ استعماری طاقتیں جس نے اپنی ماضی کی کالونیل دور میں جن کو آج تیسری دنیا بھی کہا جاتا ہے جیسے پاکستان و ہندوستان اس میں بھی خصوصا پاکستان میں ریاست موجودہ دور میں ان نیو کالونیل طاقتوں کی ایجنٹ ہے مگر دوسری طرف ان کی مخالفت میں بھی رہتی لگتی ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک پیچیدہ صورتحال ہے جسے "نیو کالونیلزم" یعنی جدید نو آبادیاتی نظام کے تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ استعماری طاقتوں نے براہ راست تسلط کے بعد بالواسطہ حکمرانی کا طریقہ اپنایا، جس میں وہ آزاد نظر آنے والی ریاستوں کے اندرونی معاملات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ پاکستان جیسے ممالک میں یہ نظام یوں کام کرتا ہے کہ ریاست خود ہی ان طاقتوں کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہناتی ہے، چاہے وہ معاشی، دفاعی، یا سیاسی امور ہوں۔

اس کی ایک شکل یہ ہے کہ ریاست کے اندر ایسے عناصر موجود ہوتے ہیں جو عالمی طاقتوں کے مفادات کے مطابق کام کرتے ہیں، چاہے وہ عالمی مالیاتی اداروں کے قرضے ہوں، سکیورٹی معاہدے ہوں، یا سیاسی وابستگیاں۔ ان عالمی طاقتوں کی ایما پر ریاست بعض اوقات

اپنے ہی شہریوں کے خلاف ایسے اقدامات کرتی ہے جو قومی مفادات سے زیادہ ان طاقتوں کے مفادات کے حق میں ہوتے ہیں۔

دوسری طرف، عوامی جذبات اور قومی خودمختاری کا تاثر برقرار رکھنے کے لیے ریاست بظاہر ان طاقتوں کی مخالفت بھی کرتی نظر آتی ہے۔ مثلاً، سیاسی بیانات میں مغربی ممالک یا عالمی اداروں پر تنقید کی جاتی ہے، خودمختاری کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں، اور بعض اوقات ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں جو ان طاقتوں کی پالیسیوں سے تضاد رکھتے ہیں۔ تاہم، عملی طور پر یہ مخالفت اکثر علامتی ہوتی ہے، کیونکہ ریاستی پالیسیوں کا ڈھانچہ اب بھی اسی عالمی نظام کا حصہ رہتا ہے جو استعماری طاقتوں نے ترتیب دیا ہے۔

یہ صورت حال دراصل استعماری حکمت عملی کا ایک ارتقائی پہلو ہے، جہاں پرانا براہ راست کنٹرول اب سفارتی، معاشی اور نظریاتی دباؤ کے ذریعے تبدیل ہو چکا ہے۔ یوں ایک طرف ریاست ان عالمی طاقتوں کی ایجنٹ کے طور پر کام کرتی ہے، اور دوسری طرف داخلی سیاسی ضرورتوں کے تحت بظاہر ان کی مخالفت بھی کرتی نظر آتی ہے تاکہ عوام میں اپنی ساکھ برقرار رکھ سکے۔

تیسری دنیا کی وہ ریاستیں جو مغربی سامراج کے شکنجے میں نہیں پھنسی ہیں، انہیں مختلف قسم کی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان ریاستوں کے لیے سب سے بڑی آزمائش عالمی طاقتوں کی طرف سے غیر رسمی اور نرم طریقوں سے اثر و رسوخ بڑھانے کی ہے۔ یہ ریاستیں

اپنے داخلی مسائل، اقتصادی مشکلات، اور سیاسی چیلنجز کا سامنا کرتی ہیں اور انہیں عالمی سطح پر اپنے مفادات کا دفاع کرنے کے لیے غیر متوازن طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ سامراجی طاقتیں اس قدر مہارت سے عالمی نظام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال چکی ہیں کہ غیر مغربی ریاستوں کو اپنے داخلی امور میں خود مختاری کا مظاہرہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان ریاستوں پر معاشی دباؤ، قرضوں کی قسطوں کی ادائیگی، اور بین الاقوامی تعلقات میں مسلسل مداخلت جیسے مسائل عائد کیے جاتے ہیں۔

پاکستان کی مثال پر بات کی جائے تو اس ملک کی عوام سامراجی ایجنٹوں یعنی اسٹیبلشمنٹ کے ریاستی جبر کا شکار ہیں، جو عالمی طاقتوں کے مفادات کی تکمیل کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ جبر مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے، جیسے عوامی حقوق کی پامالی، معاشی عدم مساوات، اور سیاسی استحکام کی کمی۔ اس کے علاوہ، پاکستان میں خود مختاری کے دعوے اور عوامی سطح پر ان سامراجی طاقتوں کے خلاف بیانات دینے کے باوجود، ریاست کی پالیسیوں کا ڈھانچہ عالمی نظام کے مطابق ہوتا ہے جو مغربی طاقتوں کی ایما پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس صورتحال میں عوام کو اپنے حقوق اور آزادی کے لیے ایک جراتمندانہ تحریک کی ضرورت ہے، جس میں نظریاتی بیداری اور قومی اتحاد کو فروغ دینا ضروری ہے۔ عوامی شعور اور ایک جامع سیاسی تحریک کی صورت میں ہی سامراجی شکنجوں سے نکلنے کا راستہ ممکن ہو سکتا ہے۔ اس تحریک کا مقصد داخلی استحکام، خود مختاری، اور معاشی ترقی کے لیے عالمی اثرات سے آزاد

پالیسیوں کا قیام ہو گا، تا کہ ملک کی عوام اپنے قومی مفادات کے لیے کام کر سکیں اور عالمی طاقتوں کی چالوں سے بچ سکیں۔

پاکستانی عوام کو اس صورتحال سے نکلنے کے لیے سب سے پہلے اپنی شناخت، اپنے قومی مفادات اور اپنے وسائل کا تحفظ کرنا سیکھنا ہو گا۔ یہ صرف سیاسی بیانات اور علامتی مخالفت سے ممکن نہیں بلکہ ایک جامع حکمت عملی اور عوامی حمایت کی ضرورت ہے، جس کے ذریعے داخلی سطح پر بھی تبدیلی کی بنیاد رکھی جا سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ عوامی سطح پر شعور بیدار ہو، سیاسی جماعتیں قوم کی فلاح کے لیے کام کریں، اور ایک ایسی قیادت ابھرے جو سامراجی مفادات کے بجائے اپنے ملک کے مفادات کو ترجیح دے۔ اس طرح، عوامی طاقت اور درست قیادت کے ذریعے اس سامراجی شکنجے سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

About Author: S. Jahanzaib Abidi is a distinguished author known for his extensive collection of articles covering a wide range of subjects, including philosophy, religion, education, politics, economics, media, and society. His prolific writings showcase a deep understanding and insightful analysis across diverse topics, making him a notable figure in the realm of article series.

With a keen intellect and a penchant for thorough exploration, Abidi's contributions offer readers a nuanced perspective on various issues, establishing him as a respected writer whose work resonates across different spheres of thought and discourse. His thought-provoking articles contribute significantly to the intellectual landscape, fostering a deeper understanding of complex subjects.